ہر خاص و عام بالخصوص سکول و کالج،
دینی مدارس کے طلبہ و طالبات کو قرآن کریم کے
معانی و مطالب سے واقفیت حاصل کرانے اور سیکھنے کیلئے، لفظ بہ لفظ،
اردو ترجمہ، ہر سبق 15 تا 20 منٹ کے دورانیہ پر مشتمل، آسان عام فہم اور دلنشین تعلیمی تفسیر

ذخیرۃ البرہان
فی
فہم القرآن

جلد 4

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ ۴

سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! (رضی اللہ عنہ) اگر تو صبح کو ایک آیت
کلام پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے اور اگر علم کا ایک باب سیکھ لے
تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

مرتب و مؤلف: قاری محمد اکرام غفرلہ
مہتمم مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

ہر خاص وعام بالخصوص سکول وکالج،
دینی مدارس کے طلبہ وطالبات کو قرآن کریم کے
معانی ومطالب سے واقفیت حاصل کرانے اور سیکھنے کیلئے، لفظ بہ لفظ،
اُردو ترجمہ، ہر سبق 15 تا 20 منٹ کے دورانیہ پر مشتمل، آسان عام فہم اور دلنشین تعلیمی تفسیر

ذخیرۃ البرہان فی فہم القرآن

جلد 4

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ ④

سرکارِ دوعالم ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! (رضی اللہ عنہ) اگر تو صبح کو ایک آیت کلام پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے اور اگر عمل کا ایک باب سیکھ لے تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

مرتب ومؤلف: قاری محمد اکرام غفر لہٗ
مدرّس: مدرسہ فیض القرآن اودھروال (ضلع چکوال)

تمام حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: ذخِيرَةُ البُرْهَان فِي فَهمِ القُرْآن
لَنْ تَنَالُوا ۴ (جلد 04)

صفحات: 406

ترتیب وتالیف: قاری محمد اکرام غفرلہٗ
مدرس! مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)
0300-5902896

ٹائٹل وکمپوزنگ: ظفر محمود ملک
النور مینجمنٹ چکوال 0334-8706701

ناشر: مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

تاریخ اشاعت: 15 ربیع الاول بروز ہفتہ 1448 ھ بمطابق 29 اگست 2026

ویب سائیٹ: www.umarlibrary.org

فہرست مضامین

عرضِ مرتب 9
معیارِ نیکی/معیارِ گناہ/ضمیر کی آواز/حلال وحرام کا تعین
کس کی ذمہ داری ہے 11
بِر، بَر اور اِثم کا بنیادی مفہوم 11
شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ 13
معاشی نظام 14
حلال، حرام اور مباح کی شرعی تعریف 15
حلت وحرمت کا مطلب 17
اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا اور افترا پردازی بہت بڑا ظلم
ہے خانۂ کعبہ! امتیازات وخصوصیات 19
اللہ پر جھوٹ باندھنا کفر اور انتہائی سنگین گناہ 19
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی تقاضۂ ایمان ہے
.... 20
خانۂ کعبہ کی جگہ سے زمین کی ابتدا 21
حج بیت اللہ روحانی تربیت کا ایک بہترین ذریعہ. 26
حجِ بیت اللہ کی فضیلت واہمیت 26
امن کی جگہ 27
صاحب استطاعت پر حج فرض 27
استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے پر وعید 29
صراط المستقیم کیا ہے؟ اور اس پر چلنے کے لیے طریقے
مستشرقین کا معنی ومفہوم 33
قرآنِ مجید کی اصطلاح میں اہل کتاب سے مراد 33
یہود کی اسلام دشمنی کا ایک طریقہ 34
شُھَدَآءِ کا عام فہم معنی 37
ہر عمل کا مکمل علم 37
یہود ونصاریٰ میں سے بعض گروہوں کا بنیادی مقصد
.... 38
نعمتِ تلاوت/نعمتِ رسالت 39
آج کے دور میں ہمارے لیے پیغام 40
خوفِ خدا پیدا کرنے کے آٹھ (8) طریقے 41
اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے ڈرنے کا حکم 41
اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو 46
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امت مسلمہ کی اہم ذمہ داری
.... 50
دعوتِ دین کا مفہوم اور فضیلت واہمیت 50
اسلام کی روح اور طاقت 53
دعوت کی بنیادی ضرورت 54
دین پھیلانے کی محنت ہی امت مسلمہ کو متحد اور یکجا کر سکتی
ہے 55
اختلاف کے اصول وآداب قرآن وسنت کی روشنی میں
.... 57
اختلافِ رائے کے آداب 57
ائمہ مجتہدین کا باہمی طرزِ عمل 61
مسائل اور جذباتِ نفسانی 62
اختلافی مسائل میں راہِ صواب 62
مصائب ومشکلات میں توبہ اور رجوع الی اللہ کی ضرورت و
اہمیت 65
چہرے کے سفید یا سیاہ ہونے کا مطلب 65
دو چہروں والا انسان، سماج کے لئے خطرناک. 67
لفظ ظلم کا بڑا وسیع مفہوم 68
رجوع الی اللہ کا مطلب 69

عصر حاضر کا اہم ترین تقاضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر
.... 71
بنی اسرائیل اور امتِ محمدیہ کی افضلیت میں فرق . 71
حاصل کلام 75
اہل ایمان کو تسلی 76
بنی اسرائیل پر ذلت، مسکنت اور غضب اِلٰہی کا عذاب
.... 78
یہود پر ذلت مسلط ہونے کا مطلب 78
حبل اللہ اور حبل الناس سے کیا مراد ہے؟ 80
سعید روحیں 81
صالحین کے اوصاف 83
تین شخصوں کیلئے دوگنا ثواب 83
مال و دولت اُمت کیلئے فتنہ اور آزمائش ہے ... 85
فتنہ کی اقسام 85
’فتنہ‘ کی تعریف اور اس کی اقسام 87
کفار کا مہلک انفاق 89
کفار سے تعلقات کے بارے میں اسلام کی تعلیمات
.... 92
غیر مسلموں کے ساتھ ظاہری اور دلی تعلق کا حکم ... 92
یکطرفہ محبت 95
منافقین کی ناگواری 97
غزوہ احد، پس منظر، حقائق اور نتائج/ توکل علی اللہ کی
اہمیت وافادیت 100
صف بندی اور دوبدو لڑائی 100
جبلِ رماۃ پر مقرر دستہ 102
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اللہ کی بے پناہ محبت ... 103
احد کے میدان میں 70 اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی
شہادت 104
توکل علی اللہ کا مفہوم 105
ہر کام میں اللہ کی مدد حاصل کریں! مگر کیسے؟ ... 107
بدر کے واقعہ کی بھی یاد دہانی 107
اللہ کی مدد کیسے حاصل ہوگی؟ 109
فرشتوں کے ذریعے مدد 111
قرآن کی سچائی اور کفار کے منصوبوں کی ناکامی 114
زمین پر فرشتوں (ملائکہ) کے نزول کا بنیادی مقصد
.... 114
کفار کی ناکامی کا بنیادی سبب 117
غزوہ احد! مومنین کے لئے آزمائش 118
حاکمیت اور اختیارات 119
سود کی حرمت اور وبال/ نیکیوں میں سبقت کا قرآنی ونبوی
تصور 121
سود حرام اور جہنم میں لے جانے والا کام ہے 121
قرآن کی سب سے زیادہ ڈرانے والی آیت 123
کامیابی کا اصل راز 124
نیکیوں میں سبقت، ایمان کا تقاضہ 124
متقین کی خصوصیات اور اوصاف/ استغفار! گناہوں کا
تریاق 128
اخلاق کے اعتبار سے تین درجات کا تذکرہ 128
استغفار کی اہمیت وفضیلت 130
متقین کی اخروی جزا اور انعامات 132
فلاح انسانیت کا اسلامی تصور/ وھن کیا ہے؟ اور اس کا
علاج کیا ہے؟ 134
حوادثاتِ زمانہ سے عبرت حاصل کرنا مومن کی نشانی
.... 134
سیاحت کا تصور اور قرآن مجید میں 135
اسلام میں خدمت کا نہایت وسیع تصور 137
ناصحانہ تنبیہات 138
وہن کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم 139
غزوہ میں شکست کی بعض حکمتیں 140

مومنوں کا تزکیہ نفس/ صدق دل سے شہادت کی تمنا
کرنے والے 143
تزکیۂ نفس کا مفہوم 143
نسمہ، حظیرۃ القدس کا بنیادی معنی ومفہوم 144
جہاد اور صبر کا بہت گہرا تعلق 145
شہادت کی تمنا 147
ازلی اور ابدی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ
.... 149
استقامت! راہ دین پر ثابت قدمی 149
مقررہ وقت پر انسان کی موت 152
طلب دنیا یا طلب آخرت 154
جہاد کی ترغیب 155
جہاد کا تصور اسلام میں/ آزمائش کی گھڑی میں
مسلمان ثابت قدم رہیں 156
جہاد انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت 156
"وَهَنٌ، ضُعُفٌ اور اِسْتِكَانَةٌ" کا مفہوم 158
مجاہدین کی جامع ترین دعائیں 159
دنیا وآخرت میں اجر وثواب 162
منافقین اور کفار کے ہتھکنڈے/ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ
فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ وارد الفاظ کا تاریخی پس منظر 163
مسلمانوں کے تنزل کی وجہ 163
لفظ مولیٰ کا قرآن وحدیث میں استعمال 165
جب مسلمان، مسلمان رہے، ہمیشہ کفار ان سے خائف و
مرعوب رہے 167
صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی گستاخی سنگین گناہ اور عظیم جرم 170
حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عقیدت ومحبت . 170
تعظیم صحابہ علیہم الرضوان کے بارے میں امت کا اتفاق
.... 173
حضرات صحابۂ کرام رضی الل عنہم قرآن وسنت کی نظر میں
.... 177
دورانِ جنگ نیند کا طاری ہونا 177
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نکتہ چینی دینی اور دنیوی نقصانات کا
باعث 182
موت اور زندگی کا نظامِ قدرت 185
موت کی حقیقت 185
موت وحیات کا فلسفہ 189
موت نام ہے روح کا بدن سے تعلق ختم ہونے کا.. 190
مشورہ اسلامی شعار ہے/لفظی اور شرعی اصطلاح میں توکل کا
مطلب 192
بخشش، معافی اور مشورہ خوبصورت اور اہم اقدار.... 192
توکل انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا خصوصی شعار . 195
اسباب اختیار کرنے حکم، لیکن بھروسا اللہ کی ذات پر 197
مقصد حیات رضائے الٰہی کی تلاش 199
شانِ نبوت کے منافی 199
خیانت کا تدارک 202
رضائے الٰہی کا حصول کیوں ضروری ہے؟.......... 203
ایمان باللہ کی بنیاد 204
نیکی اور بدی کے درجات 205
رسولِ اکرم ﷺ کے مقاصدِ بعثت اور ہماری ذمہ داری
.... 207
قرآن میں مقاصد بعثت کا تذکرہ 207
پہلا مقصد تلاوت قرآن 210
دوسرا مقصد تزکیۂ نفس 211
تیسرا مقصد قرآنی تعلیمات 212
چوتھا مقصد تعلیم حکمت 213
جہاد میں فتح وشکست کی خدائی حکمتیں/مسلمانوں کے لیے
تسلی 214
غزوہ احد اور اطاعت امیر.......... 214
شکست کی حکمتیں.......... 216
جنگ کی بنیادی دو اقسام 217

منافقوں کی حیلہ سازی 219
موت سے فرار ممکن نہیں 220
شہداکی حیات قرآن واحادیث سے ثابت ہے ... 222
شہید کی زندگی دنیاوی زندگی نہیں ہوتی 222
شہداء کرام کے فضائل 223
منافقین کے قول کی تردید 224
شہداء کرام کامقام 225
پچھلوں کے متعلق بشارت 226
شہداء کاغسل اور جنازہ........................ 227
پروپیگنڈا، امن وجنگ دونوں صورتوں میں استعمال ہونے والا ہتھیار 229
زخمی حالت میں اطاعت رسول ﷺ 229
پراپیگنڈہ بطور موثر ہتھیار 231
جنگیں جیتنے کاسستا اور موثر ترین ہتھیار 233
عہد حاضر کے تقاضے 234
فضل الٰہی اورنعمتِ الٰہی سے مراد........................ 235
اہلِ باطل کاطریقہ/ اچھے اعمال کے ساتھ لمبی عمرپانا بھلائی کی علامت ہے 236
حقیقی خوف 236
حقیقی مسلمانوں پر کفار کے حربے کامیاب نہیں ہوں گے 238
ایمان اور کفر کا تقابل........................ 240
کفار کے لیے مہلت 241
کیاانبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے پاس علم غیب تھا؟ 243
"علمِ غیب" باری تعالیٰ کاخاصہ ہے 243
تمام کائنات مل کربھی رسول اللہ ﷺ کے علم کاتصور نہیں کرسکتی 246
علمِ غیب اور آخبارِ غیب 247
بخل کے بجائے سخاوت وفیاضی/ بخل کے اسباب اوران کاعلاج 251
بخل وکنجوسی کی ممانعت 251
بخل اوربخیل 252
احساسات کا بخل 255
بخل کے دینی ودنیاوی نقصانات........................ 255
یہودیوں کاگستاخانہ قول اوراس کاجواب/ قرض حسنہ کسے کہتے ہیں؟ 258
قرض حسنہ کے سلسلہ میں دس ہدایات 258
قرضہ حسنہ کے دوفائدے........................ 261
ظَلَّامٍ کامعنی ومفہوم 264
بائبل اورقرآن میں قربانی کاتصور 266
سوختنی قربانی کی فرمائش 266
الزُّبُرِ کامعنی مفہوم........................ 270
"اورہرجان کوموت کاذائقہ چکھنا ہے"........................ 273
موت کوکثرت سے یادکرو........................ 273
موت ایک مسلّمہ حقیقت 274
جزائے عمل ایک اٹل حقیقت 276
پوری زندگی کالائحہ عمل 278
یہودی علماکی ایک اورخرابی عوام سے علم چھپانا.... 280
جان اورمال کی آزمائش اللہ کاقانون 280
علم کوچھپانے والوں کاانجام 283
ریاکاری اورنام ونمود عبادات اورنیک اعمال کی بربادی کاسبب 287
خودپسندی اورحب جاہ کی مذمت........................ 287
اہل ایمان کی خداخوفی 289
لفظ رَجاءَ کامعنی اورمفہوم 289
ریاکاری ایک معاشرتی برائی........................ 290
حقیقی اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکت کوحاصل ہے 293

ذکر اللہ کی فضیلت، اقسام، آداب اور فوائد 294
اُولِی الْاَلْبَابِ کے لیے غور و فکر 294
اللہ تعالیٰ کا نام کائنات کی روح ہے 296
مصنوعات قدرت میں غور و فکر 300
ذلت و رسوائی کے مارے لوگ 301
بہتر انجام اور دنیا و آخرت کی رسوائی سے بچنے کی دعا 301
حَسَنَةً کا معنیٰ و مفہوم؟ 302
مُنَادِيًا يُّنَادِیْ کا مفہوم اور تشریح 303
عقلمند لوگوں کا منتہائے مقصود 306
مرد و زن کے قرآنی حدود اور اسلام کے نظامِ عفت کا اِجمالی خاکہ 308
مرد و زن کے اعمالِ صالحہ پر برابر کا اجر و ثواب ... 308
مرد اور عورت کے اپنے اپنے دائرۂ عمل 310
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ کا مطلب 311
حِضانت کا مفہوم 312
قرآن کریم میں اللہ کی راہ میں ہجرت کی فضیلت ... 313
قرآنی احکام اور حقیقتِ دنیا 316
دنیا کی زیب و زینت اور اس کی حقیقت 316
مَتَاعٌ قَلِيلٌ کا مفہوم اور تشریح 318
اَهْلِ تقویٰ کے لئے انعامات اور بشارتیں ... 320
اللہ کی طرف سے مہمانداری 321
نیکو کاروں کے لیے بہتر اجر 321
دین پر ثابت قدمی اور استقامت ضروری 323
تین قسم کے افراد کے لیے دوہرا اجر 323
قریبی دور کے نومسلم 324
خشیت الٰہی 327
حساب میں جلدی 328
دین اسلام پر ثابت قدمی 328
خلاصہ سورۂ آل عمران 329
خوفِ خدا/تخلیق انسانی/یتیم کی سرپرستی اور خیر خواہی 331
اجتماعی احکام میں اہم ترین حکم تقویٰ 333
یتیم کس بچے کو کہتے ہیں؟ اور اس کے احکام 336
یتیم لڑکیوں سے ناانصافی/چار عورتوں سے نکاح/اسلام کے خلاف پروپیگنڈا 339
مہر اور نفقات میں انصاف کا حکم 339
زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں انصاف کا اہتمام 341
"اَلَّا تَعُوْلُوْا" کا معنی 342
مہر کی اہمیت فضائل و مسائل/اِسلام میں یتیموں کے حقوق 348
عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دیا کرو 348
اسلام میں یتیم و نادار بچوں کی کفالت 350
اسلام میں یتیموں کی پرورش اور نگہداشت کا تصور . 352
عورتوں اور بچوں کا میراث میں حصہ/یتیم کا مال کھانا کبیرہ گناہ ہے 357
خواتین کے وراثتی حقوق؛ اسلام اور قانون کا تقاضا 357
شریعت اِسلامی کے تمام احکام کی بنیاد عدل پر .. 361
عورت کا حق میراث اور اسلام 362
سات ہلاک کرنے والے گناہ 363
وصیت اور وراثت کے احکام و مسائل/وراثت کے احکام قرآن مجید کی روشنی میں 365
میراث کی تقسیم کے ابتدائی مراحل 365
والدین، اولاد اور بیوہ میں وراثت کی تقسیم 366
قرض کی ادائیگی تقسیم وراثت پر مقدم ہے 368
کلالہ کی میراث/بہن بھائیوں کی تین قسمیں/احکام کے مطابق تقسیم نہ کرنے والے 374
کلالہ کا مفہوم اور تقسیم کا طریقہ 375
اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود 380

میراث کے معاملہ میں کوتاہیاں 381
سزائے رجم/توبہ کس کی قبول ہے اور کس کی نہیں؟ 383
زنا کی شرعی حد 383
ہم جنس پرستی کی سزا 385
خطا کاروں میں بہترین جلدی توبہ کرنے والے ہیں
.... 388
عالم نزع سے پہلے توبہ.............................. 389
جاہلیت میں عورت ترکہ کا مال تھا/ طلاق دیتے وقت
عورت سے مال ہتھیانے کی کوشش 392
فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ، کی دو تفسیریں............. 392
بیوی پر بہتان لگا کر اس کو طلاق دینا اور مہر کا واپس لینا قبیح
عمل 396
پختہ عہد سے مراد 397
حرمت مصاہرت 398
رضاعت کے رشتے اور رضاعت کے احکام و مسائل
.... 400
رضاعت کی وجہ سے حرام ہو جانے والے رشتوں کا بیان
.... 400
رضاعی رشتہ اور اس کی حرمت 402

☆☆☆☆

عرضِ مرتب

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ وَحۡدَهٗ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ لَّا نَبِیَّ بَعۡدَهٗ!

خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کی رہنمائی کے لیے دو چیزیں چھوڑی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید، اور دوسرا اپنا طریقہ زندگی، جس کو ہم سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے ہیں۔ یہ امت جب تک ان دونوں سے اپنے آپ کو وابستہ رکھے گی، ان شاء اللہ راہ راست پر رہے گی، اور گمراہی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے گی، اسی لیے علماء امت نے ہر دور میں اور ہر زبان میں قرآن مجید کے تراجم اور حدیث پاک کی شروحات کی طرف توجہ کی ہے، جس سے امت کے افراد رہنمائی حاصل کر کے پاکیزہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ بفضلہ تعالیٰ ذخیرۃ البرھان فی فہم القرآن پہلی جلد: الٓمّٓ دوسری جلد: سَيَقُوۡلُ تیسری جلد: تِلۡكَ الرُّسُلُ مقبول ہوئی، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الۡحَمۡدُ وَلَكَ الشُّكۡرُ اس کے بعد حوصلہ مزید بڑھا تو اب یہ اسی سلسلے کی چوتھی جلد: لَنۡ تَنَالُوا کا پارہ تیار ہو کر pdf کی صورت میں منظر عام پر ہے۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی اس عارضی حیات مستعار میں اس سلسلے کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیں، اور اس تفسیر کی طباعت کا انتظام و اسباب مہیا فرما دیں۔ اور طلبائے عظام، علمائے امت، خطبائے کرام، مدرسین کو اس کی قدردانی کی توفیق دے کر اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اسے دنیا کے گوشے گوشے میں عام کرنا چاہئے تا کہ قرآن کریم سے مسلمانوں کا رشتہ دوبارہ بحال ہو جائے۔

اہل علم سے مؤدبانہ التماس ہے کہ میری جنبش قلم میں لغزش کا امکان ہے لہٰذا کسی طرح کی بھی لغزش پر تنقید برائے تنقیص سے صرف نظر کرتے ہوئے بغرض تصحیح اس کی نشاندہی فرمائیں تا کہ اسے دور کیا جا سکے۔ لہٰذا قلم نے جو کچھ صحیح باتیں قرآن پاک کی تشریح کے ضمن میں لکھی ہوں وہ محض اللہ تعالی کی نوازش و توفیق اور والدین اساتذہ و اہل خانہ کی دعاؤں نیز بزرگوں کی کاوشوں اور ان کے علمی ذخیروں سے استفادہ کا ثمرہ ہے۔ لیکن خدانخواستہ اگر کچھ غلطی ہوئی ہو تو وہ خود راقم الحروف کی تقصیر اور کوتاہی ہے، جس کے لیے عند اللہ عفو و درگذر اور عند الناس تصحیح و مشورہ کا طالب ہے۔ یا اللہ ہمیں اپنے دین کے کاموں میں لگا لیجئے! نفس و شیطان اور ہر شر سے بچا کر تمام تالیفات و خدمات کو شرف قبولیت عطا فرما دیجئے اور انہیں ہمارے لئے ہمارے والدین کیلئے، اولاد ازواج کیلئے اساتذہ ومشائخ کیلئے محسنین و متعلقین اور مرحومین کیلئے دارین کی سرخ روئی کا ذریعہ بنا دیجئے، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ: ذَخِیرَۃُ البُرْھَانِ فِی فَھمِ القُرْآن کو تمام طلباء و مدرسین اور ہر خاص و عام کیلئے نفع بخش بنائے اللہ تعالیٰ میری اس خدمت کاوش کو شرف قبولیت عطا فرماویں اور امت کے لیے اس کو نافع بنائیں اور آئندہ بھی اس طرح کی مفید خدمات کی توفیق عطا فرماتے رہیں۔

قاری محمد اکرام غفرلہٗ

مدرس! مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

15 ربیع الاول بروز ہفتہ 1448ھ بمطابق 29 اگست 2026

معیارِ نیکی/معیارِ گناہ/ضمیر کی آواز/حلال وحرام کا تعین کس کی ذمہ داری ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ
عَلِيْمٌ ﴿٩٢﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى
نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿٩٣﴾

بِر، بَر اور اِثم کا بنیادی مفہوم

لَنْ	ہرگز نہیں	تَنَالُوا	تم حاصل کرسکو گے
الْبِرَّ	نیکی	حَتّٰى	یہاں تک کہ
تُنْفِقُوْا	تم خرچ کرو	مِمَّا	اُن (چیزوں) سے جن کو
تُحِبُّوْنَ	تم پسند کرتے ہو	وَمَا	اور جو
تُنْفِقُوْا	تم خرچ کرو گے	مِنْ شَيْءٍ	کوئی چیز
فَاِنَّ	تو بیشک	اللّٰهَ	اللہ

بِهٖ	اس کو	عَلِيْمٌ	خوب جاننے والا۔(92)

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ تم پوری نیکی ہر گز حاصل نہیں کرو گے، یہاں تک کہ اس میں سے کچھ خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو۔لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ "الۡبِرَّ" "کامل نیکی"، بر اور بَر کی اصطلاحیں قرآن وسنت میں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں کہ بر سے مراد جنت بھی ہوسکتی ہے۔ظاہر ہے کہ اعلی درجے کی نیکی ہی کے ذریعے کوئی شخص جنت میں داخل ہوسکتا ہے۔ یا مطلقاً بر سے مراد نیکی ہے، جس کی ادائیگی کے بعد انسان کو اچھا بدلہ مل سکتا ہے۔مگر جب تک وہ اپنی محبوب چیز کو خرچ نہیں کرے گا۔اعلی درجے کا معیار حاصل نہیں ہوسکتا۔ان معانی میں پہلی آیتوں کے ساتھ ربط بھی پیدا ہو جائے گا۔اہل کتاب اس لیے ایمان نہیں لاتے کہ انہیں اپنی محبوب چودھراہٹ کو قربان کرنا پڑتا ہے۔نجران کے نصاریٰ نے یہی تو کہا تھا کہ اگر ہم ایمان قبول کرلیں تو ان کی جاگیر اور راعزاز ختم ہو جائے گا۔مقصد یہ کہ اگر اعلی درجے کی نیکی چاہتے ہو، تو ان سب چیزوں کو قربان کرنا پڑے گا۔محبوب چیز خواہ مال و دولت ہو یا جاہ وحشمت ان کی قربانی دینا پڑے گی۔مگر اہل کتاب اس کے لیے تیار نہ تھے۔کسی نے حضور ﷺ سے دریافت کیا۔حضرت! برکس کو کہتے ہیں۔فرمایا الۡبِرُّ مَا اطۡمَأَنَّتۡ إِلَيۡهِ النَّفۡسُ، : ۔یعنی بر وہ ہے، جس سے نفس کو اطمینان حاصل ہو یعنی نیکی وہ ہوتی ہے،جس میں دل مطمئن ہوتا ہے اور نفس کو سکون ملتا ہے وَالۡإِثۡمُ مَا حَاكَ فِي النَّفۡسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدۡرِ، وَإِنۡ أَفۡتَاكَ النَّاسُ وَأَفۡتَوۡكَ ۔جس سے دل میں کھٹکا پیدا ہو۔اور تم یہ پسند نہ کرو۔کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔ایسی چیز کو ترک کرنا چاہئے۔اور گناہ وہ ہوتا ہے جو تمہارے دل میں کھٹکتا ہے اور دل میں تردد رہتا ہے، اگر چہ لوگ تمہیں فتوی دیتے رہیں۔(مسند احمد) جب بھی آپ کوئی کام کرنے لگیں اور آپ کا باضمیر، صاف دل اور نفس اس پر پوری طرح مطمئن ہو تو وہ کام نیکی (البر) ہے۔معیارِ گناہ: اگر کوئی کام دل میں شک پیدا کرے، آپ کو اندر سے کوفت یا خلش ہو، اور آپ اسے لوگوں کی نظروں سے چھپانا چاہیں تو وہ یقیناً گناہ (الاثم) ہے۔ضمیر کی آواز: یہ حدیث انسان کے اندر موجود اس فطری ضمیر (انر گائیڈ) کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے شریعت نے "دل کا اطمینان" قرار دیا ہے۔حضرت

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔کہ بر ہر ایسا کام ہے ۔جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری اور اس کی طرف سے الہام پا کر اس کی مراد میں فنا ہو کر کیا جائے ۔نیز ہر ایسا کام بر کی تعریف میں آتا ہے جس کی وجہ سے ارتفاقات میں اصلاح پیدا ہوتی ہے ۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ

ارتفاقات کا لفظ عربی زبان کے مادہ" رفق" سے نکلا ہے، جس کا بنیادی معنیٰ نرمی، باہمی موافقت، دوستی اور رفاقت کے ہیں، یہ اصطلاح خاص طور پر مشہور مفکر اور محقق حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب" حجۃ اللہ البالغہ" سے جڑی ہے ۔ان کے نزدیک معاشرے کے ارتقاء اور انسانی تہذیب کی ترقی کے مراحل" ارتفاقات" کہلاتے ہیں ۔چار درجے: ان کے مطابق انسان تہذیبی ارتقاء میں 4 درجوں سے گزرتا ہے: ارتفاقِ اول: بنیادی ضروریاتِ زندگی جیسے کھانا، پینا، لباس اور مکان کا حصول ۔ارتفاقِ دوم: خاندان کا نظام، معاشیات اور لین دین ۔ارتفاقِ سوم: ملکی نظام، سیاست اور شہر کی تعمیر و حفاظت ۔ارتفاقِ چہارم: بین الاقوامی سطح پر سلطنتوں کے درمیان تعلقات اور مذہبی و اخلاقی قیادت کا نظام، آسان الفاظ میں، ارتفاقات ان تمام بنیادی اور اجتماعی سہولیات، ضابطوں اور تمدنی اصولوں کو کہتے ہیں جو انسان کی بقا اور معاشرتی زندگی کی بہتری کے لیے ناگزیر ہیں ۔بہر حال روزمرہ زندگی میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، حجابات ہٹتے ہیں ۔اور ایسے اعمال کی بدولت دنیا اور آخرت میں اچھا نتیجہ ملتا ہے ۔برخلاف اس کے اثم ایسا فعل ہے، جو شیطان کی اطاعت کے جذبے سے انجام دیا جاتا ہے اس سے ارتفاقات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے ۔اور دنیا کے طور طریقوں میں فساد برپا ہوتا ہے، ایسا فعل انسان میں حجابات پیدا کرتا ہے ۔اور نافرمانی کے جذبے کو ابھارتا ہے ۔یہ اثم ہے ۔اور اس کا نتیجہ دنیا و آخرت ہر دو مقامات پر براہی مرتب ہوتا ہے ۔"مِمَّا تُحِبُّونَ" (اس میں سے کچھ خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو) عام ہے، یعنی جان و مال، اولاد و اقارب، جاہ و عزت، غرض ہر چیز کو شامل ہے ۔یہ خطاب مسلمانوں کو بھی ہے اور یہود کو بھی ۔مسلمانوں سے خطاب کی مناسبت یہ معلوم ہوتی ہے کہ پچھلی آیت میں بیان فرمایا ہے کہ کافر کو خرچ

کرنے سے کچھ بھی نفع نہیں ہوگا۔اب اس آیت میں مومنوں کوخرچ کرنے کی کیفیت بتلائی،جس سے آخرت میں انھیں نفع ہوگا۔وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ ﴿۹۲﴾اورتم جو چیز بھی خرچ کروگےتو بیشک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔مقصد یہ کہ انسان جو کچھ بھی فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے،تھوڑا ہو یا زیادہ،وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور انسان کو (بشرطیکہ مسلمان ہو اور اخلاص سے خرچ کرے)اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔اس لیے معمولی چیز خرچ کرنے کو بھی عار نہ سمجھے۔مگر نیکی میں کامل درجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عزیز ترین چیز صرف کی جائے۔اس آیت کا خطاب یہود،نصاریٰ،مسلمانوں اور سب بنی نوع انسان سے ہے اور مال سے محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس کے دل میں گھٹن سی پیدا ہونے لگتی ہے اور اگر کسی کے کہنے کہلانے پر مال خرچ کرنا ہی پڑے تو اس کا جی یہ چاہتا ہے کہ تھوڑا سا مال یا کوئی حقیر قسم کا مال دے کر چھوٹ جائے،جب کہ اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ جب تم اللہ کی راہ میں ایسا مال خرچ نہ کروگے جو تمہیں محبوب اور پسندیدہ ہے۔اس وقت تک تم نیکی کی وسعتوں کو پا نہیں سکتے۔

معاشی نظام

سرمایہ داری نظام میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ہر شخص اپنے بینک بیلنس کی فکر میں رہتا ہے جائز و ناجائز،حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں۔مال آنا چاہئے خواہ کسی راستے سے آئے مگر دوسرے کے ساتھ نیکی کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔جو شخص خود دوسروں کا خون چوستا ہے۔حرام کھاتا ہے،سود خور ہے،لوگوں کی حق تلفی کرتا ہے،اس سے نیکی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔اسی لیے قرآن نے سرمایہ دارانہ نظام کو لعنتی نظام قرار دیا ہے۔امریکہ برطانیہ،فرانس سب لعنتی نظام معیشت کو اپنائے ہوئے ہیں۔وسائل معیشت اکثر ناجائز ہیں۔مال اکٹھا کرنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے،دوسری طرف الحادی نظام ہے۔یہ سراسر خدا تعالیٰ اور شرائع الٰہیہ کا انکار ہے۔روس اور چین وغیرہ میں یہی نظام ہے مگر سرمایہ دارانہ نظام کی طرح یہ اشتراکی نظام بھی ملعون ہے۔ہاں جو نظام معیشت انبیاء (علیہم السلام) نے پیش کیا ہے۔یہی صحیح اسلامی نظام ہے۔اس کے ذرائع آمدن بھی جائز ہیں اور یہ حرام چیزوں پر خرچ بھی

نہیں ہوتا۔اس میں تعیش اور حرام خوری نہیں ہے۔ یہ نظام ناداروں اور غریبوں کی مدد کرتا ہے، مظلوم کو اس کا حق دلاتا ہے۔یتیموں کے سر پر دست شفقت رکھتا ہے۔اور بیواؤں کا سہارا بنتا ہے۔ اس نظام کے اپنانے والے مال اکٹھا نہیں کرتے،انہیں جاہ وحشمت کی کوئی خواہش نہیں ہوتی، بلکہ ان میں قربانی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔اس آیت میں بھلائی سے مراد تقویٰ اور فرمانبرداری ہے اور خرچ کرنے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا کہ ''یہاں خرچ کرنے میں واجب اور نفلی تمام صدقات داخل ہیں۔امام حسن بصری رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے فرمایا: جو مال مسلمانوں کو محبوب ہو اسے رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرنے والا اس آیت کی فضیلت میں داخل ہے خواہ وہ ایک کھجور ہی ہو۔.....(خازن اٰل عمران،تحت الآیۃ: ۹۲، ۱/ ۲۷۲) گویا ان کو اس پر متنبہ فرمایا گیا کہ تم نیکی کے کمال کو اس قربانی کے بغیر نہیں پاسکتے۔انسان کو چاہیے کہ اس میں سے بہترین اور محبوب ترین چیز اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قربان کردے۔اگر اس کی راہ میں مال خرچ کرنے کی ضرورت ہے تو مال خرچ کرو۔اگر جان کی ضرورت ہے تو وہ بھی پیش کردو اور اگر شہرت واقتدار اس کی رضا کے لیے قربان کرنا پڑے تو بے دریغ قربان کر جائے۔

حلال،حرام اور مباح کی شرعی تعریف

كُلُّ		تمام	الطَّعَامِ	کھانے	كَانَ حِلًّا	حلال تھے	
لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ		بنی اسرائیل کے لیے	اِلَّا	سوائے	مَا	اس کے جو	
حَرَّمَ		حرام کرلیا تھا	اِسْرَآءِيْلُ		اسرائیل (یعقوب نے)		
عَلٰى نَفْسِهٖ		اپنی جان پر	مِنْ قَبْلِ	اس سے پہلے	اَنْ	کہ	
تُنَزَّلَ		نازل کی جائے (اترے)	التَّوْرٰىةُ	توراۃ	قُلْ	آپ کہہ دیجئے	
فَاْتُوْا	تو تم لاؤ	بِالتَّوْرٰىةِ	توراۃ	فَاتْلُوْهَآ	پھر پڑھو اس کو		
اِنْ	اگر	كُنْتُمْ	ہوتم	صٰدِقِيْنَ	سچے۔(93)		

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ

کھانے کی ہر چیز بنی اسرائیل کے لیے حلال تھی مگر جو اسرائیل نے اپنے آپ پر حرام کر لی، اس سے پہلی آیات میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے اثبات میں دلائل پیش کیے اور اہل کتاب پر الزامات قائم کیے ہیں۔ اب یہاں سے ان کے شبہات کا جواب ہے، جو وہ آپ ﷺ کی نبوت پر پیش کرتے تھے۔ (رازی) جب قرآن نے بیان کیا کہ یہود کے ظلم اور سرکشی کی وجہ سے بہت سی چیزیں ان پر حرام کر دی گئیں۔ یہ دراصل یہود کے مسلمانوں پر ایک اعتراض کا جواب ہے۔ یہود نے مسلمانوں پر اعتراض کیا کہ تم اپنے آپ کو ''دین ابراہیمی'' پر کہتے ہو؛ حالاں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں اونٹ کا گوشت اور اس کا دودھ حرام تھا اور تم اسے جائز سمجھتے ہو اور کھاتے ہو قرآن نے اس کا جواب دیا کہ یہ سب چیزیں شریعت ابراہیمی میں جائز تھیں، البتہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو 'عِرْقُ النِسَاء' کی تکلیف تھی، (عِرْق: رگ یا پٹھے کو کہتے ہیں۔ نِسَاء: یہاں یہ لفظ عورتوں کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ عربی لغت کے لحاظ سے یہ "نَسو" یا "نَسا" سے ماخوذ ہے جس کا مطلب وہ خاص پٹھا یا رگ ہے جو کمر کے نچلے حصے سے شروع ہو کر ٹانگ تک جاتی ہے لنگڑی کا درد: اسے عام زبان میں ''لنگڑی کا درد'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں مریض ٹھیک سے چل نہیں پاتا۔ میڈیکل نام (Sciatica): جدید طب میں اس مرض کو شیاٹیکا (Sciatica) کہا جاتا ہے، جو جسم کے سب سے بڑے عصب یعنی شیاٹک نرو (Sciatic nerve) کی سوزش یا دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ درد کا راستہ: یہ درد کمر کے نچلے حصے یا کولہے سے شروع ہو کر ران کے پچھلے حصے سے نیچے پنڈلی اور بعض اوقات پاؤں تک تک پھیلتا ہے) انھوں نے نذر مانی تھی کہ اگر وہ صحت مند ہو جائیں تو اللہ کے لئے اسے چھوڑ دیں گے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی اور انھوں نے نذر کو پوری کیا، بنی اسرائیل نے اس کو اپنے اوپر بھی حرام کر لیا، (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۴ / ۱۳۴) پہلی اُمتوں میں اس طرح کی نذر جائز تھی، اس اُمت میں ایسی نذر جائز نہیں، جو کسی حلال کو حرام کرتی ہو، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے، (التحریم: ۱)

حلت وحرمت کا مطلب

ہماری شریعت میں کسی حلال چیز کو حرام قرار دینا درست نہیں ہے۔حلت کا مطلب کسی چیز کا جائز اور حلال ہونا ہے، جبکہ حرمت کا مطلب اس کا ممنوع اور حرام ہونا ہے۔اسلام میں کسی بھی شے کے حلال یا حرام ہونے کا تعین قطعی شرعی دلائل (قرآن وسنت) پر مبنی ہوتا ہے ہماری شریعت کا حکم یہ ہے۔کہ اگر کوئی شخص نذر کے طور پر بھی کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے تو ایسی نذر کو پورا کرنا ضروری نہیں، بلکہ ایسی نذر کا توڑنا ضروری ہے۔اور ایسی نذر کے کفارے کا ادا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

فرمایا: مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ اس سے پہلے کہ تورات اتاری جائے، یہ واقعہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اور تورات کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے، اس کے باوجود تورات میں اونٹ کے حرام ہونے کا ذکر نہیں، معلوم ہوا کہ یہود کا یہ دعویٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں اونٹ کا گوشت اور اس کا دودھ حرام تھا، صحیح نہیں ہے۔فرمایا جارہا ہے کہ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۹۳﴾ کہہ دے تو لاؤ تورات، پھر اسے پڑھو، اگر تم سچے ہو۔دور نبوی میں قرآن کریم نے بطور چیلنج یہ بات کہی تھی کہ اگر تورات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ چیزیں حرام کی گئی ہیں تو لا کر دکھاؤ اور یہود اس بات سے عاجز رہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے اضافے کئے گئے ہیں کیونکہ اگر تورات میں اس وقت ایسے احکام موجود ہوتے تو یہود فوراً لا کر پیش کر دیتے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اس اعتراض کو جھٹلایا اور واضح کیا کہ تورات کے نزول سے پہلے تمام پاکیزہ کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے۔کسی بھی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا حتمی اختیار صرف اور صرف اللہ رب العزت اور اس کے رسول علیہ السلام کو حاصل ہے۔ اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال یا حرام کہنا سخت گناہ اور تحریفِ دین میں شمار ہوتا ہے۔

الغرض! جس کام کا کرنا اور نہ کرنا دونوں حکم کے اعتبار سے برابر ہوں یعنی اس کے کرنے میں نہ ثواب ہے اور نہ ہی ترک میں کوئی گناہ۔اشیاء میں اصل حکم اباحت ہی کا ہے (رد المحتار، قواعد الفقہ)

حلال کتاب وسنت سے جس کی حلت ثابت ہو شرعاً وہ حلال کہلاتا ہے۔حرام: کتاب وسنت سے جس کی ممانعت ثابت ہو، اللہ تعالیٰ نے بواسطہ الفاظِ قرآن حرام فرمایا ہو یا بذریعہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پھر ان کی دلالت حکم پر ظاہر ہو یا مخفی ہو کر حضرات فقہائے کرام نے احکام کا استنباط کر کے قرآن وحدیث کے نصوص کی توضیح فرمائی ہو،کسی طریقہ پر بھی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے حلت وحرمت احکام کا ثبوت ہوگا، وہ واجب العمل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا اور افترا پردازی بہت بڑا ظلم ہے

خانۂ کعبہ! امتیازات وخصوصیات

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۹۴ قُلْ
صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۹۵ اِنَّ
اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۹۶

اللہ پر جھوٹ باندھنا کفر اور انتہائی سنگین گناہ

فَمَنِ	پھر جس نے	افْتَرٰى	باندھا	عَلَى اللّٰهِ	اللہ پر
الْكَذِبَ	جھوٹ	مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ	اس کے بعد		
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	تو یہی ہیں	الظّٰلِمُوْنَ	ظالم۔(94)		

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی جو کوئی حق واضح ہوجانے کے بعد اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے۔اس سے مراد اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا ہیں جو اس نے نازل نہ کی ہوں، جیسے حلال کو حرام یا حرام کو حلال ٹھہرانا، یا کسی ایسے شخص کو جھوٹا نبی کہنا جسے اللہ نے مبعوث کیا ہو، یا اللہ کے دین میں اپنی طرف سے من گھڑت عقائد شامل کرنا۔یہ آیت اس واقعے کے تناظر میں نازل ہوئی جب یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کا انکار کرتے ہوئے تورات کے بعض احکامات (جیسے رجم کی سزا) کا غلط حوالہ دیا تھا یا انہیں چھپایا تھا۔ مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ کی وضاحت: اس سے مراد حق واضح ہو جانے، دلائل قائم ہو جانے اور نبی کی سچائی ثابت ہو جانے کا وقت ہے۔ یعنی حقائق جان لینے کے بعد بھی ضد، ہٹ دھرمی یا ذاتی مفاد کی خاطر اللہ پر جھوٹ باندھنا کفر اور انتہائی سنگین گناہ ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴿۹۴﴾ تو جان لو کہ یہی لوگ ظالم ہیں۔ الظّٰلِمُوۡنَ ایسے لوگوں کو "ظالم" اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ وہ کفر اور جھوٹ کے ذریعے اللہ کی توحید اور اس کے احکامات پر ظلم کرتے ہیں، حق کا گلا گھونٹ کر لوگوں کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں جو انہیں جہنم کی طرف لے جائے گا۔ یہ آیت اس واقعے کے تناظر میں نازل ہوئی جب یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کا انکار کرتے ہوئے تورات کے بعض احکامات (جیسے رجم کی سزا) کا غلط حوالہ دیا تھا یا انہیں چھپایا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ واضح دلائل اور حق کے آشکار ہو جانے کے بعد بھی جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ حد درجہ ظالم ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم کے باوجود گناہ کرنا زیادہ سخت ہے نیز حلال کو اپنی طرف سے بلا دلیل حرام کہنا اللہ تعالیٰ پر اِفتراء کرنا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی تقاضۂ ایمان ہے

قُلۡ	کہہ دیجئے	صَدَقَ اللّٰهُ	اللہ نے سچ کہا	فَاتَّبِعُوۡا	لہٰذا تم اتباع کرو
مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ	دین ابراہیم کا	حَنِيۡفًا	(جو) حق پرست (تھا)		
وَمَا كَانَ	اور نہیں تھا (وہ)	مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ	شرک کرنے والوں میں سے۔(95)		

قُلۡ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا آپ ان سے کہئے کہ اللہ نے (جو کچھ فرمایا ہے) سچ فرمایا ہے لہٰذا تمہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کی پیروی کرنا چاہیے جو اللہ ہی کے ہو گئے تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا بیان صدق پر مبنی ہے کہ کھانے کی یہ قسم پہلے حلال تھی، اس کے بعد اسرائیل اور ان کی اولاد پر حرام کر دی گئی، لہٰذا "نسخ" صحیح ہے اور تمہارا

شبہ باطل ہے، رسول اللہ ﷺ نے جو ان کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے، یہ عین ملت ابراہیم علیہ السلام کے مطابق ہے۔لہٰذا تم بھی دین اسلام میں داخل ہو جاؤ، جو اصول وفروع کے اعتبار سے عین دین ابراہیم کے مطابق ہے۔(ابن کثیر) وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴿۹۵﴾ اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ملت ابراہیم سے مراد دین کی اصولی باتیں ہیں جو ہر نبی پر نازل کی جاتی رہیں۔مثلاً صرف ایک اللہ کی عبادت کرنا، اسے وحدہ لاشریک سمجھنا اور اس کے سوا کسی دوسری قوت کے سامنے سرِتسلیم خم نہ کرنا۔اللہ کو ہی حرام وحلال قرار دینے کا مختار سمجھنا، اخروی سزا وجزا کے قانون پر ایسے ہی اعتقاد رکھنا، جیسے کتاب اللہ میں اس کی وضاحت ہے وغیرہ۔رہے شرعی مسائل یا شریعت تو وہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق مختلف رہے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں کی حلت وحرمت بھی ایسے ہی مسائل سے ہے اور ان میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔یعنی اصل دین ابراہیمی یہ ہے کہ شرک سے باز رہو اور توحید پر کوئی آنچ نہ آنے دو، یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کا لب لباب تھا، بعض یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو (تفسیر ماجدی: ۲/۳۴۶) اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ کر دین ابراہیمی کی صریحاً خلاف ورزی کر رہے تھے۔اس آیت کریمہ میں دین ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا۔اس سے مراد یہ ہے کہ "دین محمدی کی پیروی کرو، کیونکہ اس کی پیروی ملتِ ابراہیمی کی پیروی ہے، دین محمدی اُس ملت کو اپنے اندر لیئے ہوئے ہے۔تفاسیر میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کی جائے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء نہ کرنا بدعقیدگی ہے۔

خانہ کعبہ کی جگہ سے زمین کی ابتدا

اِنَّ اَوَّلَ	بیشک پہلا	بَيْتٍ	گھر
وُّضِعَ	(جو) مقرر کیا گیا	لِلنَّاسِ	لوگوں کے لیے
لَلَّذِيْ	البتہ وہ ہے جو	بِبَكَّةَ	مکہ میں ہے
مُبٰرَكًا	بڑی برکت والا	وَّهُدًى	اور ہدایت ہے

تمام جہانوں کے لیے۔(96)	لِّلۡعٰلَمِیۡنَ

فرمایا: اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا بیشک اللہ کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے البتہ وہ ہے جو بکہ (یعنی مکہ مکرمہ) میں ہے۔ برکت والا ہے۔ یہ یہود کے دوسرے اعتراض کا جواب ہے، وہ کہتے تھے کہ بیت المقدس سب سے پہلا عبادت خانہ ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں نے اپنا قبلہ کیوں بدل لیا؟ اس کے جواب میں کہا گیا تمہارا یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ پہلا گھر، جو اللہ کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا ہے، وہ ہے جو مکہ میں ہے۔ اس آیت میں قرآن نے بتایا کہ دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ تو کعبہ ہے، جو" بکہ" میں ہے۔ بکہ مکہ ہی کا نام ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت بخشا۔ اس پر بہت سے واضح دلائل موجود ہیں۔ جن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ دور جاہلیت سے یہ محترم چلا آ رہا ہے کہ اگر کسی کے باپ کا قاتل بھی اس میں داخل ہو جائے تو وہ اس سے تعرض نہیں کرتا، نیز اس میں مقام ابراہیم، یعنی وہ پتھر ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور یہ کہ یہی ابراہیمی قبلہ ہے، کیونکہ بیت المقدس کی تعمیر کعبۃ اللہ سے چالیس برس بعد ہوئی۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا، حضور! زمین پر سب سے پہلے کونسا عبادت خانہ یا مسجد بنائی گئی۔ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا مسجد حرام جس میں بیت اللہ شریف واقع ہے۔ پھر حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا۔ حضور! دوسرے نمبر پر کونسی مسجد تعمیر ہوئی۔ ارشاد ہوا، مسجد اقصیٰ جو بیت المقدس ہے۔ پھر عرض کیا، ان دونوں کے درمیان کتنا وقفہ ہے فرمایا چالیس 40 سال۔

یہ بات تو واضح ہے۔ کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کی، اور بیت المقدس حضرت سلیمان کے ہاتھوں تعمیر ہوا۔ اور ان دونوں انبیاء علیہما السلام کے درمیان ایک ہزار سال کا وقفہ ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چالیس 40 سال کا وقفہ بتانا کیسے ہوا؟ حقیقت یہ ہے کہ روئے زمین پر سب سے پہلا عبادت خانہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے ہاتھوں سے بیت اللہ شریف کو تعمیر کرایا۔ جب حضرت آدم (علیہ السلام) زمین پر اترے تو انہیں وحشت ہوتی تھی اور

وہ پریشان رہتے تھے۔آپ کی اس وحشت کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا کہ جس طرح فرشتے آسمانوں پر بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں اور وہاں پر عبادت کرتے ہیں۔اسی طرح آپ بھی زمین پر عبادت خانہ بنائیں،جس کا لوگ طواف کریں۔چنانچہ آدم (علیہ السلام) نے زمین پر سب سے پہلے بیت اللہ شریف تعمیر کیا۔اس کے چالیس سال بعد آپ نے شام کا سفر کیا تو وہاں پر بیت المقدس تعمیر کیا۔اس طرح بیت اللہ شریف اور بیت المقدس کی تعمیرات میں چالیس سال کا وقفہ ہے۔

اس کے بعد حوادث اور طوفان آتے رہے۔اور یہ دونوں مقدس مقامات ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے،دونوں عمارات منہدم ہوگئیں۔اس کے ہزاروں سال بعد بیت اللہ شریف کی دوبارہ تعمیر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ہاتھوں سے ہوئی۔سورہ حج میں موجود ہے۔وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے بیت اللہ شریف کی جگہ ٹھیک کردی۔چنانچہ یہ جگہ اس وقت سے آباد ہے۔لہذا اولین عبادت خانہ بیت اللہ شریف ہی ہے۔ تمام انبیاء (علیہم السلام) نے اسکا حج کیا ہے۔اور یہی ملت ابراہیمی کا قبلہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن پر فرمایا کہ صرف بیت اللہ شریف کی طرف ہی اپنا رخ کرو۔حضرت امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نزدیک حنیف وہ شخص ہے۔جو نماز میں بیت اللہ شریف کا رخ کرتا ہے۔چنانچہ قبلہ اول بیت اللہ شریف ہی ہے۔یہی ملت ابراہیمی کا قبلہ ہے۔بیت المقدس بھی قبلہ رہا ہے مگر اب نہیں ہے۔ترتیب کے لحاظ سے وہ قبلہ ثانی تھا۔وہ مکرم ومحترم ہے۔حضور ﷺ کی حدیث پاک میں جن تین مقدس مقامات کا ذکر آتا ہے،وہ یہی ہیں،مسجد حرام،مسجد نبوی اور بیت المقدس یعنی مسجد اقصی۔یہ تینوں مقامات ہدایات کے مرکز ہیں،تاہم ان میں سے سب سے زیادہ محترم بیت اللہ شریف ہے۔اس کے فضائل میں سے ایک ہے مُبٰرَكًا وہ بڑا ہی بابرکت ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس میں ظاہری اور باطنی تمام برکات رکھی ہیں۔برکت کا معانی ایسی زیادتی ہے جس میں تقدس پایا جائے۔حرم پاک میں ہر وقت خدا تعالیٰ کی تجلیات کا نزول ہوتا ہے۔اور ہر عابد کو اس میں سے حصہ ملتا رہتا ہے۔

عرشِ الٰہی کے نیچے ساتویں آسمان پر ’’بیتِ معمور‘‘ (آباد گھر) ہے اور اس کے بالکل برابر زمین پر خانۂ کعبہ ہے، عرش پر فرشتے طواف کرتے ہیں اور فرش پر حضرتِ انسان۔ اوپر آسمان والوں کا کعبہ ہے اور نیچے زمین والوں کا۔ صحیحین کی روایت ہے کہ ہر دن ستر ہزار فرشتے بیتِ معمور کا طواف کرتے ہیں جن کو دوبارہ موقع نصیب نہیں ہوتا۔ (ابن کثیر ۷۶۹ طور) خانۂ کعبہ روئے زمین پر سب سے پُرانا اللہ رب العزت کا محترم و مکرم گھر ہے اسے کہیں بیتُ اللہ، کہیں کعبۃُ اللہ، کہیں بیت حرام اور کہیں بیتِ عتیق (پُرانا/ آزاد گھر) سے تعبیر کیا گیا ہے، یہاں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نماز کے برابر ہے، اسی کا حج اور اسی کا عمرہ کیا جاتا ہے، سارے عالم کے لیے یہ مرکز رشد و ہدایت ہے، خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی نسبت عطا فرمائی ہے، یہ اسی مکہ میں ہے جس سے اپنی والہانہ محبت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار فرمایا ہے۔ یہی چہار دانگِ عالم میں بسنے والے مسلمانوں کا قبلہ ہے، اس کی خصوصیات اور اس کے امتیازی اوصاف پر خامہ فرسائی کرنا بہت ہی مبارک کام ہے، اس لیے کہ یہ ایک ایسا ہیرا ہے جس کا ہر پہلو تابندہ، درخشندہ اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والا ہے۔ ربّ کعبہ نے اس کی تراش وخراش میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، یہی وہ گھر ہے جس کی خصوصیات و امتیازات کو خود ربِ دو جہاں اور سرورِ دو عالم ﷺ نے بیان فرمایا ہے تو دنیا کے کسی گھر کو وہ عظمت و رفعت اور وہ بزرگی و بڑائی کیوں کر حاصل ہوگی، جو اس گھر کو حاصل ہے۔

دنیا کی تخلیق کا مقصد عبادت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کے لیے روئے زمین کی ابتدا اسی جگہ سے فرمائی جس جگہ خانۂ کعبہ بنا ہوا ہے، یہ خصوصیت صرف خانۂ کعبہ کو حاصل ہے دنیا کی کسی دوسری جگہ کو نہیں۔ فرمایا مکہ مکرمہ بابرکت بھی ہے۔ وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝٩٦ اور تمام جہانوں کے لیے ذریعہ ہدایت بھی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: مَسْجِدِي هٰذَا، وَمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِ الْأَقْصَى (عبادت کے لیے) تین مسجدوں کے سوا رخت سفر نہ باندھا جائے: میری یہ مسجد، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ۔‘‘[صحیح مسلم/ کتاب الحج / حدیث: 3384]۔ اس کا مطلب یہی ہے۔ کہ یہ تینوں

مقامات مرکز ہدایت ہیں۔تاہم ان میں خانہ کعبہ کو سب سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔اسی لیے وہاں پر عبادت کا ثواب بھی زیادہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے نبی آخرالزمان کو وہاں پیدا کیا،قرآن پاک کو وہاں نازل کیا اور مسلمانوں کی ابتدائی جماعت وہیں تیار کی، جو اللہ کے دین کو پوری دنیا میں جاری وساری کرنے والی تھی۔مکہ مکرمہ کے مرکز ہدایت ہونے کی مثال ایسی ہے۔جیسے ماں کے پیٹ میں بچے کو ناف کے ذریعے خوراک بہم پہنچائی جاتی ہے۔ناف جسم انسانی کا مرکز ہوتا ہے تو اس کے ذریعے بچے کو خوراک پہنچا کر اس کی نشونما کی جاتی ہے۔اسی طرح بیت اللہ پوری دنیا کا مرکز ہے۔اور اس کے ذریعے تمام بنی نوع انسان کو روحانی غذا پہنچائی جاتی ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص مکہ یا مدینے کے حرم میں فوت ہو گیا، میں قیامت کے دن اس کی سفارش کروں گا۔بشرطیکہ ایسا شخص ایماندار ہو۔مختصر یہ ہے کہ اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں کعبۂ معظمہ کی بہت سی خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔(1)......سب سے پہلی عبادت گاہ ہے کہ حضرت آدم عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے اس کی طرف نماز پڑھی۔(2)......تمام لوگوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا جبکہ بیتُ المقدس مخصوص وقت میں خاص لوگوں کا قبلہ رہا۔(3)......مکہ معظمہ میں واقع ہے جہاں ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ ہے۔(4)......اس کا حج فرض کیا گیا۔(5)......حج ہمیشہ صرف اسی کا ہوا، بیتُ المقدس قبلہ ضرور رہا ہے لیکن کبھی اس کا حج نہ ہوا۔(6)......اسے امن کا مقام قرار دیا۔(7)......اس میں بہت سی نشانیاں رکھی گئیں جن میں ایک مقامِ ابراہیم ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ ہم کو شریعت اسلامیہ کا پورا پورا اتباع ظاہراً باطناً نصیب فرمائیں یا اللہ ہم کو صحیح معنی میں اسلام کا پیروکار بنادے اور شریعت اسلامیہ پر مستقیم رہنے کی توفیق عطا فرمادے۔آمین یارب العٰلمین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

حج بیت اللہ روحانی تربیت کا ایک بہترین ذریعہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ

الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۹۷

حجِ بیت اللہ کی فضیلت واہمیت

فِیْهِ	اس میں	اٰیٰتٌ	نشانیاں ہیں
بَیِّنٰتٌ	واضح	مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ	مقامِ ابراہیم (وغیرہ)
وَمَنْ	اور جو کوئی	دَخَلَهٗ	اس میں داخل ہوا
كَانَ	(وہ) ہوگیا	اٰمِنًا	امن میں
وَلِلّٰهِ	اور اللہ ہی کے لیے ہے	عَلَى النَّاسِ	لوگوں پر
حِجُّ الْبَیْتِ	خانہ کعبہ کا حج کرنا	مَنِ	جو کوئی
اسْتَطَاعَ	قدرت رکھتا ہو	اِلَیْهِ	اس کی طرف
سَبِیْلًا	راستے کی	وَمَنْ	اور جس نے
كَفَرَ	کفر کیا	فَاِنَّ اللّٰهَ	تو بلا شبہ اللہ
غَنِیٌّ	بے نیاز ہے	عَنِ الْعٰلَمِیْنَ	سارے جہانوں سے۔(97)

فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ اس میں کئی کھلی نشانیاں ہیں (جن میں سے ایک) حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام عبادت ہے۔مقام ابراہیم، زمزم، حجر اسود تو اللہ کی نشانیاں ہیں ہی،کعبۃ اللہ سراپا اللہ کی نشانی ہے،غور کیجئے کہ ایک چھوٹی سی چوکور عمارت، معمولی پتھروں سے بنی ہوئی، نہ نقش ونگار ہے اور نہ ظاہری حسن و جمال، ایک ایسے خطہ میں جہاں نہ کوئی درخت اگتا ہے اور نہ کوئی پودا، نہ پھل ہے اور نہ پھول، موسم کی ناہمواری اس کے علاوہ، نہ مادی اعتبار سے کوئی سامانِ کشش ہے اور نہ سیاحوں کے لئے کوئی سامانِ دلچسپی لیکن دنیا کے کونہ کونہ سے اللہ کے بندے سردی وگرمی اور بارش کی پرواہ کئے بغیر دن رات اور صبح وشام اس گھر کی طرف رواں دواں ہیں اور اس کے پھیرے لگا رہے ہیں، اس سے بڑھ کر نشانی اور کیا ہوگی؟

امن کی جگہ

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ط جوشخص اس گھر میں داخل ہوا وہ مامون ومحفوظ ہوگیا۔یعنی اللہ کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ مکہ کو اللہ تعالیٰ نے امن وامان کی جگہ بنا دیا ہے، جو حرم میں داخل ہو جائے، اسے امن حاصل ہو جاتا ہے؛ یہاں تک کہ حدودِ حرم میں شکار بھی جائز نہیں اور خود رو پودوں کو اکھاڑنا بھی منع ہے، (مجمع الزوائد: ۳/ ۲۸۳) اسلام کے آنے سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں ہزار لاقانونیت کے باوجود عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ مکہ میں ہر طرح کی دست درازی سے بچتے تھے اور اگر اپنے باپ کا قاتل بھی نظر آجائے تو نگاہ جھکا لیتے تھے، یہ بھی گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بڑی نشانی تھی۔

صاحب استطاعت پر حج فرض

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جوشخص اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔حج اسلام کے پانچ اہم ارکان میں سے ایک ہے، جس کے فرض ہونے پر اُمت کا اجماع واتفاق ہے، (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۴/ ۱۴۲) حج کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے

فرمایا کہ جو شخص قدرت کے باوجود حج نہ کرے، مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ یہودی بن کر مرے یا عیسائی، (شعب الایمان للبیہقی، باب فی المناسک، حدیث نمبر: ۳۹۷۹)

حج کی استطاعت سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کی پرورش کسی شخص کے ذمہ واجب ہے، سفرِ حج کے دوران ان کے نفقہ کے علاوہ سفر اور سفر کی حالت میں پیش آنے والی ضروریات کے بقدر پیسے اس کے پاس موجود ہوں اور مقامات حج تک پہنچنے میں کوئی قوی خطرہ درپیش نہ ہو، صحت مند ہو، چلنے پھرنے سے معذور نہ ہو، عورت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی محرم یا شوہر ساتھ ہو، یا خود عورت کے اندر اتنی مالی استطاعت ہو کہ وہ اپنے علاوہ اپنے شوہر یا محرم کے اخراجات سفر بھی برداشت کر سکے۔ (ہدایہ: کتاب الحج: ۲۰۳)

اسلام میں عبادتیں دو طرح کی ہیں، ایک کا تعلق انسان کے جسم سے ہوتا ہے، مثلاً نماز، روزہ وغیرہ اور عبادت کی دوسری قسم کا تعلق انسان کے مال سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب ثروت کی ذاتی کمائی میں معذور اور مجبور بندگانِ خدا کا بھی حصہ ہوتا ہے، جو زکوٰۃ صدقات کی شکل میں حق داروں کو پہنچایا جاتا ہے۔ ان دو عبادتوں کے مجموعے کو حج کہا جاتا ہے، جس میں جسمانی عبادت کے ساتھ مالی عبادت بھی انجام پاجاتی ہے۔ شاید اسی حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے خداوند عالم نے صرف صاحب استطاعت مسلمانوں پر ہی اس عبادت کو فرض کیا ہے، جس کی انجام دہی کے لیے جسمانی مشقت، مالی اخراجات کے ساتھ اپنے اہل وعیال اور وطن عزیز کی جدائی کا غم بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ جس طرح نماز، روزہ اور زکوٰۃ تمام عبادتیں سابقہ شریعتوں میں فرض تھیں، اسی طرح کسی مقدس ومحترم مقام کی زیارت کے لیے جانا بھی کسی نہ کسی صورت تمام شریعتوں میں تھا، مگر حقیقتاً فریضۂ حج ملت ابراہیمی کی یادگار ہے جو قیامت تک زندہ تابندہ رہے گی۔ قرآن پاک میں متعدد آیات میں حج بیت اللہ کی زیارت کا ذکر آیا ہے۔ اور آیات قرآنی میں حج کے تمام ضروری احکام وہدایات واضح کردی گئی ہیں۔ جیسا کہ اس آیت میں فرمایا گیا وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا فریضۂ حج صرف صاحب استطاعت لوگوں پر ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لیے ان لوگوں پر

بیت اللہ کا حج کرنا ہے جو اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ حج تو در حقیقت خدا کی اس مقدس سرزمین پر حاضری کا نام ہے، جہاں نبیوں، رسولوں اور برگزیدہ بندوں نے اپنی حاضری کے ذریعہ اطاعت و بندگی کا فریضہ انجام دیا ہے، اور اپنی اطاعت و بندگی کا عہد و پیمان کیا ہے۔ درحقیقت اس فریضہ کی ادائیگی کے ذریعہ خدا کی بارگاہ میں اپنی غلطیوں سے توبہ کرنا اور اپنے انتہائی محسن و منعم و مولیٰ و مالک کو منانا ہے، تاکہ وہ ہم پر نظر رحمت کر دے اور ہمارے ساتھ عفو درگزر کا معاملہ کرے، کیوں کہ وہ رحم و کرم اور لطف و عنایت کا بحرِ بے کراں ہے۔

حج انسان کو کس طرح سے اللہ رب العزت کی نگاہ میں معزز و مکرم اور موقر و محترم بنا دیتا ہے اور حج کی ادائیگی کے بعد اس کی زندگی میں کیسی زبردست تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور کس طرح سے اس کی تربیت ہو جاتی ہے، پیغمبر اعظم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: حج اور عمرہ یکے بعد دیگرے ادا کرو، اس لیے کہ یہ دونوں افلاس اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، چاندی اور سونے کے میل کو دور کر دیتی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب المناسک، ص:220)

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے پر وعید

وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۷﴾ اور جو شخص اس حکم کا انکار کرے (وہ خوب سمجھ لے کہ) اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔ صاحب استطاعت (مالی اور جسمانی طور پر اہل) ہونے کے باوجود فرض حج ادا نہ کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ احادیث مبارکہ میں اس پر سخت ترین وعیدیں آئی ہیں، اور غفلت برتنے والے کو یہود و نصاریٰ کی سی موت مرنے تک کی تنبیہ کی گئی ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جس شخص کو زاد راہ (سفر کا خرچ) اور سواری میسر ہو جس کے ذریعے وہ بیت اللہ تک پہنچ سکے، اور پھر بھی وہ حج نہ کرے، تو اس کی مرضی ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔“ [بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح] اس وعید کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بغیر کسی شرعی عذر (جیسے سخت بیماری، حکومتی پابندی یا سفر کے غیر محفوظ ہونے) کے حج کی ادائیگی میں تاخیر کرتا ہے اور اس حالت

میں انتقال کر جاتا ہے، تو وہ انتہائی بدنصیب ہے۔ استطاعت کے باوجود حج میں تاخیر کرنا یا نہ کرنا غفلت کی علامت ہے، اس لیے اگر صاحب استطاعت ہیں تو جلد از جلد اس فرض کو ادا کریں۔ واضح رہے کہ حج فرض ہونے کے لیے چند شرائط ہیں، یعنی وہ شرائط جن کی وجہ سے حج واجب ہوجاتا ہے مندرجہ ذیل ہیں: مسلمان ہونا، عاقل ہونا، بالغ ہونا، آزاد ہونا، حج کا وقت ہونا، سفر کے خرچ پر قادر ہونا (یعنی دوران سفر اور واپسی لوٹنے تک اپنے خرچ کے ساتھ ساتھ اپنے اہل وعیال کے نان نفقہ کی ادائیگی پر بھی قادر ہو) سواری پر قادر ہونا۔ جس شخص میں مذکورہ شرائط موجود ہوں اس پر حج بیت اللہ فرض ہے، اس کو بغیر عذر نہ کرنے والا آدمی کبیرہ گناہ میں مبتلا ہے، اور توبہ اس پر واجب ہے، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میں نے ارادہ کیا تھا کہ کچھ آدمیوں کو شہروں کی طرف بھیجوں تاکہ وہ دیکھیں کہ جس کے پاس حج کرنے کی استطاعت ہو اور پھر بھی وہ حج نہ کرے، تو ایسے لوگوں پر جزیہ لگا دیا جائے، کہ وہ (حقیقی) مسلمان نہیں ہیں۔

اس اہم عبادت کی خصوصی تاکید احادیث نبوی ﷺ میں وارد ہوئی ہے اور اُن لوگوں کے لئے جن پر حج فرض ہوگیا ہے، لیکن دنیاوی اغراض یا سستی کی وجہ سے بلا شرعی مجبوری کے حج ادا نہیں کرتے، سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، ان میں سے چند حسب ذیل ہیں: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فریضۂ حج ادا کرنے میں جلدی کرو، کیونکہ کسی کو نہیں معلوم کہ اسے کیا عذر پیش آجائے۔ (مسند احمد) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص حج کا ارادہ رکھتا ہے (یعنی جس پر حج فرض ہوگیا ہے) اسے جلدی کرنی چاہئے۔ (سنن ابو داوٗد) حج بیت اللہ کی خاص اہمیت اور متعدد فضائل احادیث نبوی ﷺ میں وارد ہوئے ہیں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا گیا کہ کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا۔ پھر عرض کیا گیا کہ اس کے بعد کون سا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ پھر عرض کیا گیا کہ اس کے بعد کون سا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: حج مقبول۔ (بخاری ومسلم)

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یوں تو ہر عبادت کے لیے قدم قدم پر رحمت وعنایت اور اجر وثواب کے وعدے فرمائے ہیں۔نماز وزکوٰۃ اور روزہ واعتکاف وغیرہ سب پر جنت اور جنت کی بیش بہا نعمتوں کے وعدے ہیں،لیکن تمام عبادات میں ''حج بیت اللہ'' کی شان سب سے نرالی ہے۔حج گویا دبستانِ عبدیت کا آخری نصاب ہے،جس کی تکمیل پر بارگاہِ عالی سے رضا وخوشنودی کی آخری سند عطا کی جاتی ہے،کتنے عجیب انداز سے فرمایا گیا''اور''حج مبرور''کا بدلہ تو بس جنت ہی ہے۔'' گویا''حج مبرور'' ایک ایسی عالی شان عبادت ہے کہ بجز جنت کے اس کا اور کیا بدلہ ہوسکتا ہے!۔''حجِ مبرور'' جس کا بدلہ صرف جنت ہی ہوسکتی ہے،اس کی تشریح یہ ہے کہ اس میں گناہ کی آلودگی اور ریاکاری کا شائبہ نہ ہو، یعنی تمام سفرِ حج میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے آدمی بچے اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر حج کیا جائے، بلاشبہ اس شرط کا نبھانا بھی بہت مشکل ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل ہی سے یہ مشکل مرحلہ طے ہوسکتا ہے۔عشق ومحبت کا سفر حج کی ظاہری صورت بھی عجیب وغریب ہے اور اس میں غضب کی جاذبیت ہے۔قدم قدم پر عشق ومحبت کی پُر بہار منزلیں طے ہوتی ہیں،سب سے بڑے دربار کی حاضری کا قصد ہے،دل میں دیارِ محبوب کی آرزوئیں مچلتی ہیں،سفر طویل ہے،حلال وطیب توشۂ سفر کا اہتمام کیا جارہا ہے،نیک اور صالح رفیق کی تلاش ہورہی ہے،چشم پُرنم کے ساتھ عزیز واقارب سے رخصت ہورہے ہیں،لین دین کا حساب بے باق کیا جارہا ہے،حق حقوق کی معافی طلب کی جارہی ہے،کوشش یہ ہے کہ اس دربار میں حاضر ہوں تو کسی کا معمولی حق بھی گردن پر نہ ہو۔بہرحال! حج بیت اللہ تو مومنین کے لیے توبہ وانابت،روحانی تربیت،اور رجوع الی اللہ کا بہترین ذریعہ ہے اور بندگی وطاعت اور خودسپردگی کا مظہر ہے۔ایک مومن کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ عشقِ خداوندی اور محبتِ الٰہی سے اپنے قلوب واذہان کو مسحور رکھے۔جب احرام باندھے اور تلبیہ لَبَّیْكَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ،لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ،إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِیْكَ لَكَ " کا ورد کرے،تو ایسا محسوس ہو کہ بارگاہ الٰہی سے بندہ کو اطاعت وفرمانبرداری کے لیے بلایا جارہا ہے،اس پکار سے آدمی کے اندر عبدیت وبندگی کا احساس

تازہ ہو اور خواہش نفس پر قابو پانے کا جذبہ نشو ونما پائے۔ اس عمل سے ہر ہر قدم پر تواضع وانکساری، روحانی کیف وسرور، خوف وخشیت، اخلاص وللہیت پیدا ہو جائے۔ صبر وتحمل کی عادت پڑ جائے، فریضۂ حج کی ادائیگی سے مؤمن ایسا پاک وصاف ہو جاتا ہے کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ کا حقیقی مصداق بن جاتا ہے۔ یعنی "گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص جیسا ہے جس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو" (سنن ابن ماجہ) بحسن وخوبی اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد آدمی کی پوری ذات اطاعت وبندگی، خوف وخشیتِ ربانی اور فنا فی اللہ کا ترجمان بن جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ ہر برے عمل سے اجتناب کرنے لگتا ہے، اس کے اندر اعمالِ صالحہ کی طرف سبقت کا ذوق وشوق بڑی تیزی سے بڑھ جاتا ہے، اس کی زندگی میں انقلاب آجاتا ہے، اب اس کی زندگی میں ایک نئی روح، ایک نئی حیات اور اس کا ایک نیا دور شروع ہو جاتا ہے، جس میں دین ودنیا کی بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابی شامل ہوتی ہے۔ حج بیت اللہ درحقیقت وہ عظیم الشان فریضہ ہے جس میں ایک حاجی کو وقت کی قربانی دینا پڑتی ہے، مال خرچ کرنا پڑتا ہے اور جسمانی مشقتیں جھیلنا پڑتی ہیں۔ مزید برآں اعزہ واقرباء اور احباب ورفقاء سے دور ہو کر اور ان کی یادوں کو بالائے طاق رکھ کر اللہ رب العزت اور اس کے حبیب محمد عربی ﷺ کی یادوں کے ورد کو اس تربیتی کورس میں اپنی زندگی کا شیوہ بناتا ہے، اس طرح اس کے اندر اخلاص وللہیت، اخوت ومحبت، ایثار وقربانی اور دوسرے ان تمام اوصافِ حسنہ کو نشو ونما دینے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے جس کے دوررس اثرات ونتائج اس کی عملی زندگی میں سامنے آتے ہیں اور پھر بلاشبہ اس کی زندگی قوم وملت بلکہ پوری دنیا کے لیے موجبِ سعادت ورحمت ثابت ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ مسلمانوں اور حجاج کرام کو توفیق نصیب فرمائے کہ اس مقام کی صحیح معرفت نصیب ہو۔

صراط المستقیم کیا ہے؟ اور اس پر چلنے کے لیے طریقے

مستشرقین کا معنی و مفہوم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
قُلْ یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ۖ وَاللّٰہُ شَھِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ
یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَھَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ
شُھَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا
مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَکَیْفَ تَکْفُرُوْنَ
وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیٰتُ اللّٰہِ وَفِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ ؕ وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ فَقَدْ
ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع

قرآنِ مجید کی اصطلاح میں اہل کتاب سے مراد

قُلْ	کہ دیجیے	یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ	اے اہل کتاب!	لِمَ	کیوں
تَکْفُرُوْنَ	تم کفر کرتے ہو	بِاٰیٰتِ اللّٰہِ	اللہ کی آیات کے ساتھ		
وَاللّٰہُ	اور اللہ	شَھِیْدٌ	گواہ ہے		
عَلٰی مَا	اُن پر جو	تَعْمَلُوْنَ	تم کرتے ہو۔(98)		

ارشاد ہوتا ہے قُلْ یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ آپ ان اہل کتاب سے کہئے! اہل کتاب سے مراد یہود و

نصاریٰ ہیں جو اپنے آپ کو اللہ کی کتابوں تورات اور انجیل کی طرف منسوب کرتے ہیں۔لغوی طور پر تو اہل کتاب ہر وہ شخص ہے جو کسی بھی آسمانی کتاب پر ایمان لاتا ہے یا اس کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے۔مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے نازل ہونے والی دیگر کتب وصحائف کے ماننے والوں نے اپنا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔لہذا اہل کتاب کا اطلاق ان دو گروہوں یعنی یہود ونصاریٰ پر ہوتا ہے۔جو اپنی نسبت تورات اور انجیل کی طرف کرتے تھے۔قرآن پاک نے اہل کتاب کا لقب صرف انہی دو اقوام کو دیا ہے،اور جگہ جگہ ان کو خطاب کیا ہے،یعنی قرآنِ مجید کی اصطلاح میں اہلِ کتاب سے مراد وہ مذاہب اور ان کے پیروکار ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام پر آسمانی کتابیں نازل فرمائی تھیں۔بنیادی طور پر اس سے مراد یہودی (جنہیں توراۃ دی گئی) اور مسیحی یا عیسائی (جنہیں انجیل دی گئی) ہیں۔کیونکہ ان کی آسمانی کتب (توراۃ، زبور اور انجیل) کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۖ تم اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو۔آیات میں اللہ کی توحید اور اس کے احکام، دلائل وبراہین اور معجزات وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔یہاں اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی آیتوں سے مراد توریت کی وہ آیات ہیں جن میں سلطانِ دو جہاں صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے اوصاف کا بیان ہے اور وہ عقلی دلائل مراد ہیں جو حضورِ اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔مقصد یہ ہے کہ جب یہ سب چیزیں تمہارے پاس پہنچ چکی ہیں،تو پھر تم انکار کیوں کرتے ہو،ایمان کیوں نہیں لے آتے۔یاد رکھو وَاللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ تم جو کچھ کر رہے ہو،اللہ تعالیٰ اس پر گواہ ہے۔یعنی سب کچھ اس کے سامنے ہو رہا ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔لہذا تمہارا فرض ہے کہ حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اس پر ایمان لے آؤ اور اگر پھر بھی تم کفر پر اڑے رہے،تو پھر یاد رکھو!اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچ نہیں سکو گے۔خدا تعالیٰ سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔شہید کا یہی معنی ہے۔

یہود کی اسلام دشمنی کا ایک طریقہ

قُلْ	کہہ دیجئے	یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ	اے اہل کتاب!	لِمَ	کیوں

تَصُدُّوْنَ	تم روکتے ہو	عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کے راستے سے
مَنْ	اس کو جو	اٰمَنَ	ایمان لایا
تَبْغُوْنَهَا	تم ڈھونڈتے ہو اس (راہ) میں	عِوَجًا	کجی
وَّاَنْتُمْ	حالانکہ تم	شُهَدَآءُ	گواہ ہو
وَمَا اللّٰهُ	اور نہیں ہے اللہ	بِغَافِلٍ	بیخبر
عَمَّا	اُس سے جو	تَعْمَلُوْنَ	تم کرتے ہو۔(99)

فرمایا قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ اے پیغمبر (علیہ السلام)! آپ اہل کتاب سے کہہ دیں لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تم اہل ایمان کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو۔ جو لوگ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو چکے ہیں۔ تم چاہتے ہو، کہ وہ پھر ایمان سے پھر جائیں۔ اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے مختلف حیلے بہانے کرتے ہو۔ یہودی اسلام دشمنی کا ایک طریقہ یہ تھا کہ جو شخص مسلمان ہونے لگتا اسے طرح طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیتے تھے۔ پہلی بات جو اسے ذہن نشین کرائی جاتی وہ یہ تھی کہ جس نبی آخر الزمان کی بشارت ہماری کتابوں میں دی گئی ہے وہ یہ نبی نہیں۔ اگر یہ وہی نبی ہوتا تو قبلہ کو کیوں تبدیل کرتا۔ جو سب انبیاء علیہم السلام کا قبلہ رہا ہے یا جو چیزیں حرام ہیں انہیں حلال کیوں بنا رہا ہے کیونکہ وہ اپنے غلط قسم کے مسائل کو اصل بنیاد قرار دے کر مسلمان ہونے والوں کو برگشتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کہ تم صراط مستقیم میں عیب، نقص اور کجی تلاش کرتے ہو۔ تا کہ اس کا اظہار کر کے لوگوں میں دین حق سے متعلق غلط فہمیاں پیدا کی جائیں اور وہ اس سیدھے راستے کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اللہ نے فرمایا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ موجودہ زمانے کے یہودی بھی اسلام کے خلاف سازش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ انہوں نے مصر سے تحریف شدہ قرآن پاک شائع کر کے پوری دنیا میں تقسیم کئے۔ آیت کریمہ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا میں لفظ غیر کو اڑا کر اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ کبھی الفاظ بدلے، کبھی معنی

بدلے اور کبھی قرآن پاک میں موجود پیش گوئیوں کو جھٹلانے کی کوشش کی۔ تاکہ مسلمانوں میں اشتباہ پیدا ہو جائے اور وہ اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ ان کا مقصد یہی ہے۔ کہ اسلام میں کجی تلاش کی جائے اور پھر اسے خوب مشتہر کیا جائے۔ مستشرقین نے اس ضمن میں بڑی کوششیں کی ہیں۔ (مستشرقین (واحد: مستشرق) ان مغربی محققین اور اسکالرز کو کہا جاتا ہے جو مشرقی زبانوں (خاص طور پر عربی، فارسی، اور سنسکرت)، مذاہب، تہذیب، تاریخ اور ثقافت کا سائنسی اور علمی مطالعہ کرتے ہیں، ان کا بنیادی مقصد اسلام اور مشرقی مذاہب کا مطالعہ کر کے ان میں نقائص تلاش کرنا اور عیسائیت کی بالادستی قائم رکھنا ہے) یعنی وہ علوم شرقیہ پر عبور حاصل کر کے قرآن و حدیث کی تفسیر وتشریح کرتے ہیں اور پھر ان میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ باطل نظریات داخل کر دیتے ہیں تاکہ لوگ اسلام سے بیزار ہو جائیں۔

اہل کتاب کے شبہات کی تردید کرنے کے بعد اب انھیں ڈانٹ پلائی جارہی ہے کہ تم نہ صرف یہ کہ حق پر خود ایمان نہیں لاتے، بلکہ جو لوگ اس پر ایمان لا چکے ہیں ان میں طرح طرح کے فتنے اور شوشے چھوڑ کر حق کی راہ میں کجی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ "تَبْغُوْنَ عِوَجًا" کا مطلب ہے: "تَبْغُوْنَ فِيْهَا عِوَجًا" (تم اس دین میں کوئی نہ کوئی کجی تلاش کرتے ہو) اور پھر یہ سب کچھ جان بوجھ کر کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے یہ کرتوت خوب معلوم ہیں، تمہیں اپنے اس جرم کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ "سَبِيْلِ اللّٰهِ" سے مراد یہاں اسلام ہے۔ اسلام یعنی صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کے اوصاف (1) کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چلنے والے (2) حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور جو اکابر اولیاء اللہ بزرگان امت علمائے راسخین متّقین حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سچی عقیدت اور محبت میں مضبوط قدم رکھتے ہیں، اتباع سنت کو حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں، خلاف سنت امور اور بدعات سے نفرت رکھتے ہیں، آخرت کی طرف راغب ہیں، دنیا اور اس کی زیب وزینت سے تعلق نہیں رکھتے، ایسے ثقہ علماء واکابر کے نقش قدم کو اپنانا صراطِ مستقیم پر چلنے کا سہل راستہ ہے۔ (3) جب متبع سنت علماء کاملین اہل تقویٰ سے مربوط ہو جائے دنیا سے نفرت اور آخرت میں رغبت اتباعِ سنت میں مضبوط قدم رکھنے کی فکر اور لایعنی باتوں سے پرہیز کرنے کا جذبہ

پیدا ہو جائے، ہر کام میں اللہ و رسول کے حکم کو مقدم رکھنا طبیعت ثانیہ بن جائے، گناہوں سے کامل نفرت ہو جائے، سب کا حق اداء کرنے کی طرف توجہ تام ہو جائے، سب کو اپنے آپ سے اچھا سمجھنے لگے اور بغیر وجہ شرعی کے دوسروں کے عیوب کے درپئے نہ ہو، تو ایسے شخص کو سمجھ لینا چاہیے کہ میں الحمدللہ صراطِ مستقیم پر چل رہا ہوں۔

شُهَدَآءُ کا عام فہم معنی

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر (علیہ السلام) کے ذریعے اہل کتاب سے فرمایا کہ تم ان لوگوں کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو، جو ایمان لا چکے ہیں۔ تم اللہ کے راستے میں کجی تلاش کرتے ہو۔ وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ط حالانکہ تم گواہ ہو۔ شہداء، شہید کی جمع ہے۔ جس کا عام فہم معنی گواہ ہے۔ یعنی اے اہل کتاب تم گواہ ہو یہ جملہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی ہٹ دھرمی اور تعصب کے حوالے سے نازل ہوا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم (اہلِ کتاب) خود اللہ کے دین اور اس کی سچائی کو اپنی آسمانی کتابوں میں پڑھ کر جانتے ہو، اور اس کے برحق ہونے کے گواہ ہو۔ اس کے باوجود تم لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہو۔ موجودہ زمانے کے یہودیوں نے ایک اور حربہ استعمال کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک اہل اسلام کے دلوں میں نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت موجزن ہے ہم ان پر غالب نہیں آسکتے، لہٰذا ان کی یہ کوشش ہے۔ کہ کسی طریقے سے اہل اسلام کے دل سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو نکال دیا جائے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ آج کے زمانے میں کتنا بھی گیا گزرا مسلمان ہے۔ اس کا دل پیغمبر اسلام کی محبت سے سرشار ہے۔ اہل کتاب کی ان تمام کارستانیوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ہر عمل کا مکمل علم

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٩﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے غافل نہیں ہے۔ وہ تمہاری نیتوں کو جانتا ہے۔ تم یقیناً سخت ترین سزا کے مستحق ہو گے۔ انسان دن ہو یا رات، کھلے میں ہو یا تنہائی میں، نیکی کرے یا بدی، اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مکمل اور تفصیلی علم رکھتا ہے۔ کوئی بھی عمل اس کی

نظر سے پوشیدہ نہیں۔غافل نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اعمال کی آزادی دی ہے،لیکن وہ ہر عمل کا حساب لے گا اور اسی کے مطابق آخرت میں جزا یا سزا دے گا۔

یہود و نصاریٰ میں سے بعض گروہوں کا بنیادی مقصد

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ	اے وہ لوگو جو	اٰمَنُوْۤا	ایمان لائے ہو
اِنْ	اگر	تُطِیْعُوْا	تم اطاعت کروگے
فَرِیْقًا	ایک گروہ کی	مِّنَ الَّذِیْنَ	اُن لوگوں میں سے جو
اُوْتُوا الْكِتٰبَ	دیے گئے کتاب	یَرُدُّوْكُمْ	وہ پھیر دینگے تمہیں
بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ	بعد تمہارے ایمان (لانے) کے	كٰفِرِیْنَ	کفر کرنے والے۔(100)

ارشاد ہوتا ہے۔یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اے اہل ایمان اگر تم اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی اطاعت کروگے،ان کی بات مانو گے،اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خبر دار کر رہے ہیں کہ یہود و نصاریٰ میں سے بعض گروہوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر انہیں دین سے دور کریں،تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ یہ لوگ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں گے،اسلام کے بتائے ہوئے عقائد و اعمال کے بارے میں شک و شبہ میں پڑ جانا بھی کفر ہے اور کافروں کے سے اعمال کرنا بھی ایک طرح کا عملی ارتداد ہی ہے،پس! جیسے اسلام کے عہد اول میں اہل کتاب چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو راہِ حق سے منحرف کر دیں،اسی طرح آج بھی یہودی اور عیسائی اہل علم اور اہل قلم مسلمانوں کو فکری اور عملی ارتداد میں مبتلا کرنے کے لئے دن رات کوشاں ہیں۔ان کے دل میں یہ چیز بری طرح کھٹک رہی ہے۔کہ تم کیوں ایمان آئے ہو۔لہذا ان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے۔کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے بدظن کر کے دوبارہ کفر کے اندھیروں میں دھکیل دیں۔بہر حال یہ کفر ہے خواہ وہ عقیدے میں ہو یا عمل میں ہو۔اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔کفار کے اعمال کی ایک مثال یہ ہے۔کہ وہ آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں۔اور اگر مسلمان بھی ویسے

ہی کام شروع کر دیں، تو دونوں میں کیا فرق رہ گیا۔اس آیت کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی درست ہیں۔ایک یہ کہ اگر تم یہودیوں کی بات ماننے لگو گے تو یہ تمہیں اسلام سے مرتد کر کے ہی دم لیں گے اور دوسرے یہ کہ تمہیں آپس میں لڑا بھڑا کر کافر بنا دیں گے جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کا آپس میں لڑنا کفر ہے اور خطبہ حجۃ الوداع کے دوران آپ نے مسلمانوں کے عظیم اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: سن لو! تمہاری جانیں، تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں۔ جیسے تمہارے اِس دن کی، اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرمت ہے۔سن لو! میرے بعد ایک دوسرے کی گردنیں مار کر کافر نہ بن جانا۔(بخاری)

نعمتِ تلاوت/نعمتِ رسالت

وَ كَيْفَ	اور کیسے	تَكْفُرُوْنَ	تم کفر کرو گے
وَاَنْتُمْ	حالانکہ تم	تُتْلٰى	تلاوت کی جاتی ہیں
عَلَيْكُمْ	تم پر	اٰيٰتُ اللّٰهِ	اللہ کی آیتیں
وَفِيْكُمْ	اور تمہارے اندر	رَسُوْلُهٗ	اس کا رسول (موجود) ہے
وَمَنْ يَّعْتَصِمْ	اور جو کوئی مضبوط پکڑ لے	بِاللّٰهِ	اللہ (کے دین) کو
فَقَدْ هُدِيَ	تحقیق وہ ہدایت دیا گیا	اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ	سیدھا راستے کی طرف۔

وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ط اور تم کیسے کفر کرتے ہو، حالانکہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول (موجود) ہے یہاں ”کفر“ سے مراد دائرہ اسلام سے خارج ہونا نہیں، بلکہ ان نعمتوں کی ناقدری، ناشکری، یا سابقہ جاہلی روش اور اختلافات کی طرف لوٹنا ہے جو انسان کو تباہی کے راستے پر ڈال سکتی ہے۔وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ تعالیٰ مسلمانوں کو یاد دلا رہا ہے کہ تمہارے پاس قرآن مجید کی صورت میں اللہ کا کلام موجود ہے جو ہر لمحہ تمہاری رہنمائی کر رہا ہے۔ ہدایت اور روشنی کا یہ مستقل ذریعہ موجود ہونے کے باوجود گمراہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آج کے دور میں ہمارے لیے پیغام

وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ط رسول اللہ ﷺ کی موجودگی مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی رحمت اور ڈھال تھی۔ آپ ﷺ کی صحبت، آپ ﷺ کی تعلیمات، اور آپ ﷺ کا روحانی و اخلاقی فیضان ہر قسم کے فتنوں اور کفر کی تاریکیوں سے بچانے کے لیے کافی تھا۔ اگرچہ ظاہری طور پر رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، لیکن آپ ﷺ کی سنت اور احادیث اور اللہ کی کتاب (قرآن) آج بھی ہمارے پاس اسی طرح محفوظ ہیں۔ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٠١﴾ اور جو شخص اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لے تو یقیناً اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی گئی۔ اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے کا معنی یہ ہے کی اس پر ایمان لائے۔ اس کے دین کی باتوں پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو۔ جس نے اللہ کی ذات پر پورا پورا بھروسہ کیا، اس نے اعتصام باللہ کو پالیا۔ بزرگان دین فرماتے ہیں کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اسباب پر بھی زیادہ انحصار نہ کرے بلکہ محض اللہ کی ذات پر ایمان رکھے، اس پر توکل رکھے تو شیطان بھی دفع ہوگا۔ اور یہود و نصاری بھی اپنی سازش میں ناکام ہوں گے۔ بدعت ختم ہوگی۔ یہ اکسیری نسخہ ہے۔ اسلام کی تعلیم ہی بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع ہوتی ہے۔ ہر کام اسی کے نام کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے۔ جو رحمن اور رحیم ہے اسی ذات پر ہمارا بھروسہ ہے، وہ وحدہ لاشریک ہے۔ تمام قوتوں کا مالک ہے یہی اعتصام باللہ ہے۔ لہذا جو کوئی اللہ پر ایمان لا کر اس کے احکام کو مضبوطی سے پکڑے گا، وہ کبھی گمراہ نہیں ہوگا۔ یہ آیت ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ جب تک ہم قرآن و سنت سے جڑے رہیں گے، ہم کسی بھی قسم کے فکری کفر، گمراہی اور انتشار سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

خوفِ خدا پیدا کرنے کے آٹھ (8) طریقے

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ
كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى
شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اللہ تعالیٰ جل شانہ سے ڈرنے کا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ		اے لوگو جو	اٰمَنُوا	ایمان لائے ہو!	
اتَّقُوا اللّٰهَ		تم اللہ سے ڈرو	حَقَّ	(جیسا کہ) حق ہے	
تُقٰتِهٖ		اس سے ڈرنے کا	وَلَا تَمُوْتُنَّ	اور نہ ہرگز تمہیں موت آئے	
اِلَّا	مگر	وَاَنْتُمْ	اس حال میں کہ تم	مُّسْلِمُوْنَ	مسلمان ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ اے ایمان والو! اللہ سے ایسے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کی تفسیر یوں مروی ہے: "اس کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے، اسے یاد رکھا جائے بھلایا نہ جائے، اس کا شکر ادا

کیا جائے ناشکری نہ کی جائے ۔"[ابن اَبی حاتم :3/112۔مستدرک حاکم:2/323،ح:3159]ابن کثیرؒ نے اس قول کی سند کو صحیح قرار دیا ہے ۔خوف سے مراد وہ قلبی کیفیت ہے جو کسی ناپسندیدہ امر کے پیش آنے کی توقع کے سبب پیدا ہو،مثلاً پھل کاٹتے ہوئے چھری سے ہاتھ کے زخمی ہو جانے کا ڈر۔جبکہ خوفِ خدا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی ،اس کی ناراضگی ،اس کی گرفت اور اس کی طرف سے دی جانے والی سزاؤں کا سوچ کر انسان کا دل گھبراہٹ میں مبتلا ہو جائے ۔اس کے معنی یہ ہوں گے اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ "اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اپنی طاقت کے مطابق ڈرنے کا حق ہے"(فتح القدیر)یعنی اپنی استطاعت کے مطابق اعمال حسنہ انجام دیتے رہو۔اس میں ہر آدمی کی طاقت کے مطابق رعایت موجود ہے ۔برے اعمال سے بچتا رہے، اگر کوئی خامی رہ جائے گی تو اللہ تعالیٰ مہربانی فرما کر معاف کر دیں گے ۔مگر تقوے کے عقیدے والے درجے میں معافی اور رعایت کی کوئی گنجائش نہیں ۔اگر ایمان میں نقص آئے گا،کفر،شرک یا نفاق میں سے کوئی شائبہ واقع ہوگا تو نجات کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی ۔عقائد میں تھوڑی سی کوتاہی بھی ناقابل برداشت ہے ۔

خوف خدا پیدا کرنے کے طریقے (1) سفرِ آخرت کو کامیابی سے طے کرنے کی خواہش رکھنے والے کو چاہیے کہ روانگی سے قبل گناہوں کا بوجھ اپنے کندھوں سے اتارنے کی کوشش کرے کہ کہیں یہ بوجھ اسے تھکا کر کامیابی کی منزل پر پہنچنے سے محروم نہ کر دے ۔اس بوجھ سے چھٹکارے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ بندہ اپنے پروردگار عَزَّ وَجَلَّ کی بارگاہ میں سچی توبہ کرے کیونکہ سچی توبہ گناہوں کو اس طرح مٹا دیتی ہے جیسے کبھی کیے ہی نہ تھے ۔چنانچہ فرمانِ مصطفٰے صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ہے:"گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔"(2) خوفِ خدا کے لیے بارگاہ ربّ العزت میں دعا کیجئے :یوں دعا کیجئے :اے میرے مالک عَزَّ وَجَلَّ !تیرا یہ کمزور وناتواں بندہ دنیا وآخرت میں کامیابی کے لئے تیرے خوف کو اپنے دل میں بسانا چاہتا ہے ۔اے میرے ربّ عَزَّ وَجَلَّ !میں گناہوں کی غلاظت سے لتھڑا ہوا بدن لیے تیری پاک بارگاہ میں حاضر ہوں ۔اے

میرے پروردگار عَزَّ وَجَلَّ! مجھے معاف فرمادے اور آئندہ زندگی میں گناہوں سے بچنے کے لئے اس صفت کو اپنانے کے سلسلے میں بھرپور عملی کوشش کرنے کی توفیق عطا فرمادے۔(3) فطری طور پر انسان ہر اس چیز کی طرف آسانی سے مائل ہو جاتا ہے جس میں اسے کوئی فائدہ نظر آئے۔اس تقاضے کے پیشِ نظر ہمیں چاہیے کہ قرآن و احادیث میں بیان کردہ خوفِ خدا کے فضائل پیشِ نظر رکھیں، چند فضائل یہ ہیں: خوفِ خدا رکھنے والوں کے لیے دو جنتوں کی بشارت دی گئی ہے۔خوفِ خدا رکھنے والوں کو آخرت میں کامیابی کی نوید(خوشخبری) سنائی گئی ہے۔خوفِ خدا رکھنے والوں کو جنت کے باغات اور چشمے عطا کیے جائیں گے۔خوفِ خدا رکھنے والے آخرت میں امن کی جگہ پائیں گے۔خوفِ خدا رکھنے والوں کو مدد و تائیدِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔خوفِ خدا رکھنے والے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے پسندیدہ بندے ہیں۔خوفِ خدا اَعمال میں قبولیت کا ایک سبب ہے۔(4) خوفِ خدا کی علامات پر غور کیجئے: جب کسی چیز کی علامات پائی جائیں گی تو وہ شے بھی خود بخود پائی جائے گی۔حضرت سیدنا فقیہ ابو اللیث سمرقندی عَلَیْہِ رَحْمَۃُ اللّٰہِ علیہ فرماتے ہیں: اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے خوف کی علامت آٹھ چیزوں میں ظاہر ہوتی ہے: (۱) انسان کی زبان میں، اس طرح کہ ربّ تعالٰی کا خوف اس کی زبان کو جھوٹ، غیبت، فضول گوئی سے روکے گا اور اسے ذکرُ اللہ، تلاوتِ قرآن اور علمی گفتگو میں مشغول رکھے گا۔(۲) اس کے شکم میں، اس طرح کہ وہ اپنے پیٹ میں حرام کو داخل نہ کرے گا اور حلال چیز بھی بقدرِ ضرورت کھائے گا۔(۳) اس کی آنکھ میں، اس طرح کہ وہ اسے حرام دیکھنے سے بچائے گا اور دنیا کی طرف رغبت سے نہیں بلکہ حصولِ عبرت کے لیے دیکھے گا۔(۴) اس کے ہاتھ میں، اس طرح کہ وہ کبھی بھی اپنے ہاتھ کو حرام کی جانب نہیں بڑھائے گا بلکہ ہمیشہ اِطاعتِ الٰہی میں استعمال کرے گا۔(۵) اس کے قدموں میں، اس طرح کہ وہ انہیں اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی نافرمانی میں نہیں اٹھائے گا بلکہ اس کے حکم کی اِطاعت کے لیے اٹھائے گا۔(۶) اس کے دل میں، اس طرح کہ وہ اپنے دل سے بغض، کینہ اور مسلمان بھائیوں سے حسد کرنے کو دور کر دے اور اس میں خیر خواہی اور مسلمانوں سے نرمی کا سلوک کرنے کا جذبہ بیدار کرے۔(۷) اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں، اس طرح کہ وہ

فقط اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی رضا کے لیے عبادت کرے اور ریاء ونفاق سے خائف رہے۔(۸) اس کی سماعت میں، اس طرح کہ وہ جائز بات کے علاوہ کچھ نہ سنے۔(5) جہنم کے عذابات پر غور وتفکر کیجئے: دوزخیوں میں سب سے ہلکا عذاب جس کو ہوگا اسے آگ کی جوتیاں پہنائی جائیں گی جس سے اس کا دماغ کھولنے لگے گا۔☆ دوزخیوں میں بعض وہ لوگ ہوں گے جن کے ٹخنوں تک آگ ہوگی اور بعض لوگ وہ ہوں گے جن کے زانوؤں تک آگ کے شعلے پہنچیں گے اور بعض وہ ہوں گے جن کی کمر تک ہوگی اور بعض لوگ وہ ہوں گے جن کے گلے تک آگ کے شعلے ہوں گے اگر اس زرد پانی کا ایک ڈول جو دوخیوں کے زخموں سے جاری ہوگا، دنیا میں ڈال دیا جائے تو دنیا والے بدبودار ہوجائیں۔(6) خوفِ خدا کے بارے میں بزرگانِ دین کے اَحوال کا مطالعہ کیجئے: مثلاً ☆ حضرت سیدنا ابراہیم خلیلُ اللہ عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو خوفِ خدا کے سبب اس قدر گریہ وزاری فرماتے کہ ایک میل کے فاصلے سے اُن کے سینے میں ہونے والی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی۔ایک دن حضرت سیدنا داود عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام لوگوں کو نصیحت کرنے اور خوفِ خدا دلانے کے لیے گھر سے باہر تشریف لائے تو آپ کے بیان میں اس وقت چالیس ہزار لوگ موجود تھے، جن پر آپ کے پُر اَثر بیان کی وجہ سے ایسی رقت طاری ہوئی کہ تیس ہزار لوگ خوفِ خدا کی تاب نہ لاسکے اور انتقال کر گئے۔حضرت سیدنا یحییٰ عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو خوفِ خدا کے سبب اس قدر روتے کہ درخت اور مٹی کے ڈھیلے بھی آپ کے ساتھ رونے لگتے۔حضرت سیدنا شعیب عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام خوفِ خدا سے اتنا روتے تھے کہ مسلسل رونے کی وجہ سے آپ کی اکثر بینائی رخصت ہوگئی۔ایک بار حضور نبی رحمت شفیع اُمت صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ایک جنازے میں شریک تھے، آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم قبر کے کنارے بیٹھے اور اتنا روئے کہ آپ کی چشمانِ اَقدس (مبارک آنکھوں) سے نکلنے والے آنسوؤں سے مٹی نم ہوگئی، پھر فرمایا: اے بھائیو! اس قبر کے لیے تیاری کرو۔(7) خود اِحتسابی کی عادت اپنائیے: اپنی ذات کا محاسبہ کرلینے کی عادت اپنا لینے

سے بھی خوفِ خدا کے حصول کی منزل پر پہنچنا قدرے آسان ہو جاتا ہے، انسان اُخروی اعتبار سے اپنے معمولات زندگی کا محاسبہ کرے، پھر جو کام اس کی آخرت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں، انہیں درست کرنے کی کوشش میں لگ جائے اور جو اُمور اُخروی اِعتبار سے نفع بخش نظر آئیں، اِن میں بہتری کے لیے اِقدامات کرے۔(8) خوفِ خدا رکھنے والوں کی صحبت اِختیار کیجئے: ایسے نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا بھی بندے کے دل میں خوفِ خدا بیدار کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ ہر صحبت اپنا اثر رکھتی ہے، مثال کے طور پر اگر آپ کو کبھی کسی میت والے گھر جانے کا اتفاق ہوا ہو تو وہاں کی فضا پر چھائی ہوئی اداسی دیکھ کر کچھ دیر کے لئے آپ بھی غمگین ہو جائیں گے اور اگر کسی شادی پر جانے کا اتفاق ہوا ہو تو خوشیوں بھرا ماحول آپ کو بھی کچھ دیر کے لئے مسرور کر دے گا بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص غفلت کا شکار ہو کر گناہوں پر دلیر ہو جانے والے لوگوں کی صحبت میں بیٹھے گا، تو غالب گمان ہے کہ وہ بھی بہت جلد انہی کی مانند ہو جائے گا اور اگر کوئی شخص ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرے گا جن کے دل خوفِ خدا سے معمور ہوں، اُن کی آنکھیں اللہ تعالیٰ کے ڈر سے روئیں تو امید ہے کہ یہی کیفیات اس کے دل میں بھی سرایت کر جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ خوف خدا جبھی حاصل ہوگا۔ جب کسی انسان کی دین پر استقامت ہو، یعنی اس کا عقیدہ کفر، شرک اور نفاق سے پاک ہو اور اس کے اعمال بھی بالکل درست ہوں۔ صغائر اور کبائر سے اجتناب کرتا ہو بلکہ ہر مشکوک چیز سے پرہیز کرے۔ اگر اس میں یہ چیزیں پیدا ہو گئیں تو اس کو کمال تقوی حاصل ہو جائے گا اور حَقَّ تُقٰتِهٖ کا یہی مقصد ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ تقویٰ کے کئی درجات ہیں۔ ان میں سے سب سے ادنا درجہ یہ ہے۔ کہ انسان کفر و شرک اور بدعقیدگی سے بچ جائے۔ شیطان اور دیگر گمراہی پھیلانے والے عوامل سے دور رہے، اگر کوئی شخص تقوی کا یہ ادنی درجہ بھی حاصل نہ کر سکے، تو پھر اس کی نجات کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ اس معاملہ میں کوئی رعایت ممکن نہیں۔ اور تقویٰ کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ انسان اعمال حسنہ پر بھی کاربند ہو، اور معاصی سے بچتا ہو۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ”تقویٰ محافظت برحدود شرع“ یعنی کمال درجے کا تقوی وہ ہے جو

شریعت کے حدود کی پوری پوری حفاظت کرتا ہو۔اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ میں بیان فرمایا ہے۔اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی ایک صفت یہ بھی بتائی ہے وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ یعنی مومن وہ لوگ ہیں جو حدود اللہ کی حفاظت کرتے ہیں،ان سے آگے نہیں بڑھتے۔کمال درجے کے متقین ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۰۲﴾ اور تمہیں موت نہیں آنی چاہیے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔چونکہ موت کا علم ہی نہیں کب آجائے،اس لیے موت آنے تک ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اسی طرح ڈرتے رہو۔یہاں پر سوال پیدا ہوتا کہ کسی شخص کی موت تو غیر اختیاری چیز ہے۔وہ خود چاہے بھی تو موت نہیں آسکتی، پھر اس آیت کا کیا مطلب کہ" نہ مرو تم مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبرداری کرنے والے ہو"۔مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پوری زندگی اعمال صالحہ میں مشغول رہو،حتی کہ انہیں پر تمہارا خاتمہ ہو جائے۔اگر ایسا ہو گیا، ایمان قائم رہا اور اسی پر خاتمہ ہو گیا،تو کامرانی یقینی ہے۔اور موت بہرصورت اسلام کی حالت میں آنی چاہیئے۔تاکہ حشر کو اسلام ہی کے عقیدے اور عمل پر دوبارہ اٹھایا جائے۔

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو

وَاعْتَصِمُوْا	اور تم مضبوطی سے پکڑلو	بِحَبْلِ اللّٰهِ	اللہ کی رسی
جَمِيْعًا	سب مل کر	وَّلَا تَفَرَّقُوْا	اور نہ جدا جدا ہو جاؤ
وَاذْكُرُوْا	اور یاد کرو	نِعْمَتَ اللّٰهِ	اللہ کی نعمت
عَلَيْكُمْ	(جو) تم پر (ہوئی)	اِذْ كُنْتُمْ	جب تھے تم
اَعْدَآءً	(باہم) دشمن	فَاَلَّفَ	تو اُس نے الفت ڈال دی
بَيْنَ	درمیان	قُلُوْبِكُمْ	تمہارے دلوں کے
فَاَصْبَحْتُمْ	تو تم ہو گئے	بِنِعْمَتِهٖٓ	اس کے احسان سے
اِخْوَانًا	بھائی (بھائی)	وَكُنْتُمْ	اور تھے تم
عَلٰى شَفَا	کنارے پر	حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ	آگ کے ایک گڑھے کے

فَاَنۡقَذَكُمۡ	توتمہیں (اللہ نے) بچالیا	مِّنۡهَا	اس (آگ) سے
كَذٰلِكَ	اسی طرح	يُبَيِّنُ اللّٰهُ	بیان کرتا ہے اللہ
لَكُمۡ	تمہارے لیے	اٰيٰتِهٖ	اپنی آیتیں
لَعَلَّكُمۡ	شاید کہ تم	تَهۡتَدُوۡنَ	ہدایت پاؤ۔

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۠ اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو واللہ کی رسی سے مراد اللہ کا دین یا کتاب وسنت کے احکام ہیں اور اللہ کی رسی اس لیے کہا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو تمام اہل ایمان کا اللہ سے تعلق قائم رکھتا ہے اور دوسری طرف اہل ایمان کو ایک دوسرے سے مربوط بناتا ہے اور کتاب وسنت کے احکام پر سختی سے عمل پیرا ہونے سے اس بات کا امکان ہی نہیں رہتا کہ مسلمانوں میں اختلاف، انتشار یا عداوت پیدا ہو۔ لہذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنی تمام تر توجہ دینی تعلیمات پر مرکوز رکھیں اور فروعی مسائل میں الجھ کر امت مسلمہ میں انتشار پیدا کر کے فرقہ بندیوں سے پرہیز کریں۔ فرمایا: وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر اس وقت کی جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تو تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔ یعنی جس وقت پورے عرب میں قبائلی نظام رائج تھا اور لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم تھا۔ کوئی حکومت یا عدالت سرے سے موجود ہی نہ تھی جس کی طرف رجوع کیا جاسکتا۔ اگر کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل ہو جاتا تو مقتول کا قبیلہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتا تھا جب تک اس کا انتقام نہ لے لیتا، قبائلی حمیت، جسے قرآن نے حمیۃ جاہلیہ کا نام دیا ہے۔ اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ کوئی فریق یہ سوچنے کی زحمت گوارا ہی نہ کرتا تھا کہ قصور کس کا ہے؟ صرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ چونکہ ہمارے قبیلہ کے آدمی کو فلاں قبیلہ کے آدمی نے نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے اس سے انتقام لینا ضروری ہے۔ پھر اس انتقام میں انصاف کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ جہاں کہیں کوئی جنگ چھڑتی تو پھر وہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ مکہ میں بنی بکر

اور بنی تغلب کی لڑائی شروع ہوئی جس میں نصف صدی لگ گئی (بنی بکر اور بنی تغلب جاہلیت اور ابتدائی اسلامی دور کے دو مشہور اور طاقتور ترین عرب قبائل ہیں جو آپس میں چچازاد بھائی تھے دونوں قبیلے وائل بن قاسط (بنو وائل) کی اولاد سے ہیں، اسی مناسبت سے انہیں ربیعہ قبائل میں شمار کیا جاتا ہے سلام سے پہلے ان کی آبادیاں نجد، یمامہ، شمالی عرب اور عراق کے سرحدی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھیں شجاعت، غیرت اور آزادی ان کی نمایاں صفات تھیں۔عرب کے دیگر قبائل ان کی جنگی طاقت کا اعتراف کرتے تھے)۔بنو بکر اور بنو تغلب کے درمیان چالیس سال تک لڑی جانے والی مشہور اور تباہ کن" جنگِ بسوس" کا تعلق اسی قبیلے سے تھا، جس کی ابتدا بنو بکر کی ایک عورت (بسوس) کی اونٹنی کے قتل سے ہوئی تھی خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے، کشتوں کے پشتے لگ گئے مگر لڑائی ختم ہونے میں نہ آئی تھی۔تقریباً ایسی ہی صورت حال مدینہ میں اوس وخزرج کے درمیان جنگ بعاث کی تھی۔عرب بھر کا ہوشمند طبقہ اس صورت حال سے سخت پریشان تھا۔مگر اس صورت حال سے نجات کی انہیں کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔پھر یہ صورت حال مکہ اور مدینہ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ پورے عرب میں ایک جیسی آگ لگی ہوئی تھی اور قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جائے کہ اس حال میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دولت اسلام سے سرفراز فرمایا۔جس سے پرانی رنجشیں اور کدورتیں دور ہو گئیں۔ عداوت کے بجائے مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے محبت و الفت پیدا ہو گئی اور وہ بالکل بھائیوں کی طرح بن گئے۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو لڑائی کی آگ کے گڑھے میں گرنے سے اور مرنے کے بعد جہنم کی آگ کے گڑھے میں گرنے سے بچالیا۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ اور تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا۔شفا فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنی کنارہ ہے۔اور اگر کسر کے ساتھ شفا تو اس کا معنی تندرستی ہوتا ہے۔ یہاں پر شفا سے مراد کنارہ اور حفرہ گڑھے کو کہتے ہیں۔مقصد یہ ہے کہ تم اپنی جاہلیت اور عصبیت کی بناء پر دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے۔موت آنے کی دیر تھی کہ گڑھے میں گر جاتے۔مگر اللہ نے تمہیں اس گڑھے سے بچالیا۔یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ تمہیں ایمان کی

دولت نصیب ہوگئی اور تم جہنم کے گڑھے میں گرنے سے بچ گئے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ فرمایا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ اللہ تعالیٰ اسی انداز سے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم راہ راست کو پاسکو۔ جن کے ذریعے تم فرمانبردار بن سکتے ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کے تمام سامان مہیا کر دیے ہیں اب ان سے فائدہ اٹھانا تمہارا کام ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امت مسلمہ کی اہم ذمہ داری

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

دعوتِ دین کا مفہوم اور فضیلت و اہمیت

وَلْتَكُنْ	اور چاہیے کہ ہو	مِّنْكُمْ	تم میں سے
اُمَّةٌ	ایک جماعت	يَّدْعُوْنَ	وہ بلائے
اِلَى الْخَيْرِ	بھلائی کی طرف	وَيَاْمُرُوْنَ	اور وہ حکم دے
بِالْمَعْرُوْفِ	اچھے کاموں کا	وَيَنْهَوْنَ	اور وہ روکے
عَنِ الْمُنْكَرِ	برے کاموں سے	وَاُولٰٓئِكَ هُمُ	اور یہی لوگ ہیں
الْمُفْلِحُوْنَ		فلاح پانے والے۔(104)	

ارشاد ہوتا ہے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ تم میں ایک گروہ یا جماعت ایسی ہونی چاہیئے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ”پہلے تقویٰ اور اعتصام بحبل اللہ کے ذریعے اپنی اصلاح، دوسرے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ دوسروں کی اصلاح، آیت ”وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ“ میں اس ہدایت کا بیان ہے، گویا ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ خود بھی اپنے اعمال

واخلاق کو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قانون کے مطابق درست کرو اور اپنے دوسرے بھائیوں کے اعمال کو درست کرنے کی بھی فکر رکھو۔" (معارف القرآن) یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دے نیکی اور اچھائی کی طرف بلائے۔ دعوت الی الخیر (نیکی کی دعوت) سے مراد لوگوں کو بھلائی، نیکی اور اللہ کے احکامات کی طرف بلانا ہے۔ یہ ہر مسلمان کی بنیادی دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے، جس کا مقصد معاشرے سے برائی کا خاتمہ اور خیر کو فروغ دینا ہے ظاہر ہے کہ تمام کے تمام لوگ تبلیغ کے کام پر نہیں لگ سکتے لہذا فرمایا کہ ایک گروہ یا جماعت کم از کم ایسی ہونی چاہیئے جو تبلیغ دین کا فرض اپنے ذمے لے وَلۡتَكُنۡ میں لام تاکیدی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کارِ خیر کے لیے کسی جماعت کا ہونا کوئی عام قسم کی نصیحت نہیں ہے۔ جس پر عمل کر لیا جائے یا نہ کیا جائے، ایک ہی بات ہو۔ بلکہ تاکیداً فرمایا کہ ایسی جماعت لازمی ہونی چاہیئے۔ دعوتِ دین کا کام دراصل انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا کام ہے، تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کو معبود برحق، وحدہٗ لاشریک ماننے کی دعوت دی، سورۃ الاعراف میں حق جل مجدہٗ نے سیدنا نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی اپنی قوموں کو دی گئی دعوت کو یوں بیان فرمایا: "یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ" (سورۃ الاعراف: ۸۵) "اے میری قوم! تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی اور تمہارا معبود ہونے کے لائق نہیں۔"

اس آیت کریمہ میں انسانی اصلاح کے تین اصول بیان کیے گئے ہیں یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ ہر وقت خیر کی دعوت دیتے رہیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی درست رہ سکے۔ اور اس جماعت کی دوسری ڈیوٹی یہ ہو کہ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وہ نیکی کا حکم کرتی رہے۔ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ اور برائی سے روکتی رہے، اگر ہر قوم میں ایسی جماعت پیدا ہو جائے گی، تو تمام نظام درست ہو جائے گا اور قوم اصلاح یافتہ ہو جائے گی۔ اور اگر یہ فریضہ ادا نہیں ہوگا، تو ظاہر ہے قوم منتشر ہو کر بربادی کی طرف جائے گی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ امت کے ہر فرد پر حسب استطاعت فرض ہے خواہ وہ علماء ہوں یا عوام الناس ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو محض خود نیک بن کر رہنے اور

برائی سے بچنے کا حکم ہی نہیں دیا، بلکہ ساتھ ساتھ دوسروں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا بھی حکم دیا ہے۔ یعنی امت مسلمہ بہترین امت ہے، یہ امت تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے وجود میں لائی گئی ہے، اس کا مقصد وجود یہ ہے کہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔

وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۱۰۴﴾ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بغیر نجات وفلاح کا حصول ممکن نہیں، امت مسلمہ خیر امت کے مقام پر اسی وقت فائز ہو سکتی ہے جب کہ وہ انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے۔ امت مسلمہ کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ نیکیوں کو فروغ دینے اور برائیوں کو مٹانے کے لیے اپنا اثر اور اپنی قوت استعمال کرے، گھر کے اندر اور گھر کے باہر جہاں بھی اس کے لیے ممکن ہو نیکیوں کا حکم کرے اور برائیوں سے روکے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اے اہلِ ایمان!) قسم ہے اس پاک ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم پر لازم ہے اور تم کو تاکید ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہو (یعنی اچھی باتوں اور نیکیوں کی لوگوں کو ہدایت وتاکید کرتے رہو اور بری باتوں اور برے کاموں سے ان کو روکتے رہو) یا پھر ایسا ہوگا کہ (اس معاملہ میں تمہاری کوتاہی کی وجہ سے) اللہ تم پر اپنا کوئی عذاب بھیج دے، پھر تم اس سے دعائیں کروگے اور تمہاری دعائیں قبول نہیں کی جائیں گی۔“ (معارف الحدیث، حصہ ہشتم، ص:۶۰)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ حدیث مبارکہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو واضح الفاظ میں آگاہی دی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میری اُمت کا ایسا فریضہ ہے کہ جب اس کی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ کسی فتنہ اور عذاب میں مبتلا کردی جائے گی اور پھر جب دعائیں کرنے والے اس عذاب اور فتنہ سے نجات کی دعائیں کریں گے تو ان کی دعائیں بھی قبول نہ ہوں گی۔ اس عاجز کے نزدیک اس میں قطعاً شبہ کی گنجائش نہیں کہ صدیوں سے یہ اُمت طرح طرح کے جن

فتنوں اور عذابوں میں مبتلا ہے اور اُمت کے اخیار اور صلحاء کی دعاؤں اور التجاؤں کے باوجود ان عذابوں سے نجات نہیں مل رہی ہے تو اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے امت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو ذمہ داری سپرد کی تھی اور اس سلسلہ میں جو تاکیدی احکام دیئے تھے اور اس کا جو عمومی نظام قائم فرمایا تھا وہ صدیوں سے تقریباً معطل ہے، اُمت کی مجموعی تعداد میں اس فریضہ کے ادا کرنے والے فی ہزار ایک کے تناسب سے بھی نہیں۔" (معارف الحدیث، حصہ ہشتم، ص: ۶۰-۶۱)

اسلام کی روح اور طاقت

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا بنیادی اور اصل کام دعوت الی اللہ یعنی انسانوں کو اللہ کی طرف بلانا تھا۔ وہ انسانوں کو اللہ کا تعارف کرواتے، اللہ کی عظمت و بڑائی دلوں میں اتارتے، ان میں آخرت کی فکر پیدا کر کے ان کا رخ دنیا سے آخرت کی طرف موڑتے اور انہیں اللہ کے لیے مرنا اور جینا سکھا کر اللہ والا بنا دیتے۔ نبیوں کا طریقہ براہ راست انسانوں تک پہنچ کر انہیں ایمان و اسلام پہنچانا تھا۔ انبیاء علیہم السلام دین کے دوسرے کام تعلیم و تعلم، تزکیۂ نفس، ذکر و تلاوت، صدقہ وخیرات، دعوت کے ضمن میں اور تابع کر کے انجام دیتے تھے۔ ان کی پوری زندگی اور زندگی کے ہر دن اور ہر لمحے کا بنیادی کام دعوت ہی تھا۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ علیہم الرضوان کا زندگی بھر یہی اصل مشغلہ تھا، البتہ کبھی کبھی دعوت کی راہ کی رکاوٹ دور کرنے کے لیے قتال کی بھی نوبت آجاتی تھی۔ دعوت کی بدولت ہجرت کے بعد دس سال میں روزانہ 274 میل کے حساب سے اسلام پھیلتا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تک کم و بیش دس لاکھ مربع میل کا علاقہ اسلام کے زیر نگیں آگیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد چالیس سال کی مختصر سی مدت میں تقریباً 65 لاکھ مربع میل علاقہ پر اسلام کی عمل داری قائم ہوگئی، یعنی اس دور کے تین معلوم براعظموں (ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بڑے حصہ) پر جسے آج مسلم ورلڈ یا عالم اسلام کہا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام علیہم الرضوان کی دعوت کا پھل ہے۔ بعد کے ادوار میں مسلمان تدریجاً دعوت سے دور

ہوتے گئے، اگرچہ بعد کے ادوار میں بھی کسی نہ کسی درجہ میں اسلام کی اشاعت ہوتی رہی اور اس اشاعت اسلام میں دیگر عوامل نے بھی تھوڑا بہت کردار ادا کیا لیکن دعوت اور غیر دعوت کے ادوار میں اشاعت اسلام میں نمایاں فرق یہ رہا کہ جن خطوں اور علاقوں میں دعوت کے ذریعہ اسلام پہنچا، وہ آج تک ایمان پر قائم اور پوری طرح محفوظ ہیں اور جن خطوں میں عسکری فتوحات یا دیگر عوامل سے اسلام پھیلا، عسکری قوت کے کمزور پڑنے کے ساتھ وہاں دوبارہ کفر کی عمل داری قائم ہوگئی۔

دعوت کی بنیادی ضرورت

دعوت کے لیے بنیادی ضرورت حالات کا نارمل رکھنا ہے۔قرآن نے حالات کو پرامن نارمل رکھنے کے لیے جگہ جگہ صبر اور اعراض کی تعلیم دی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشیدگی کم کرنے اور باہمی حالات کو نارمل بنانے کی خاطر حدیبیہ کے موقع پر کفار مکہ کی انتہائی غلط قسم کی اشتعال انگیز یک طرفہ شرائط بھی منظور فرمائی تھیں جس کے نتیجہ میں وہ صلح نامہ فتح مبین بن گیا۔قرآن وسیرت سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ ہر قوم پر عمل و کردار اور دعوت کے ذریعہ اتمام حجت کیا جائے۔ان تمام مراحل کے بعد آخری مرحلہ قتال کا آتا ہے۔آج ہم دعوت چھوڑ کر ایک جامد نسلی گروہ بن کر رہ گئے ہیں، جیسے کسی گڑھے میں پانی ٹھہر کر آہستہ آہستہ متعفن بدبودار اور گندا ہو جاتا ہے۔جب تک اس میں نیا پانی شامل ہوتا رہے، وہ چشمہ صافی رہتا ہے۔ضرورت ہے کہ اسلام کے چشمہ صافی میں ہر زمانہ میں ہر آن نیا خون شامل ہوتا رہے تاکہ کثافت دور ہوتی رہے۔تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے علمبردار اور اس کے پھیلانے والے ہر دور میں نومسلم ہی رہے ہیں۔حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی نومسلم تھے اور ساتویں صدی ہجری کے تاتاری اتراک بھی۔(اتراک عربی زبان کا لفظ ہے جو ”ترک“ کی جمع ہے، اور اس کا لغوی معنیٰ ”ترک لوگ“ یا ”ترکان“ (ترکی کے باشدے) ہے) اور بیسویں صدی کے تبلیغ جماعت کے میواتی بھی ایک طرح کے نومسلم تھے۔(میواتی سے مراد وہ شخص یا چیز ہے جو بھارت کے خطے مِیوات (ہے۔جو ہریانہ اور راجستھان کے درمیان واقع ہے) سے تعلق رکھتی ہے، یعنی اس خطے کی مشہور مسلم راجپوت یا مقامی قبائلی پس منظر کی حامل برادری جو ”میو“ کہلاتی ہے، ان سے منسوب

افراد کو بھی میواتی کہا جاتا ہے۔) جس طرح تیرہویں صدی عیسوی کے تاتاریوں نے سمرقند سے حلب تک تمام عالم اسلام کی مساجد تباہ کر کے کھنڈر بنا دی تھیں، پھر دعوت کی برکت سے انہی کی اولاد نے ان تمام مساجد کو نہ صرف تعمیر کیا بلکہ سجدوں سے آباد بھی کیا، آج بھی ہماری تمام مشکلات اور مصائب کا حل صرف ایک ہے۔ وہ ہے حالات کو معتدل رکھ کر اقوام عالم سے الجھے بغیر ان کو اسلام اور ایمان کی دعوت دی جائے۔ جس طرح حضرت یونس علیہ السلام دعوت کے معاملے میں اجتہادی کوتاہی سے مچھلی کے پیٹ میں ڈال دئے گئے تھے، آج پوری ملت اسلامیہ دعوت فراموشی کے جرم میں ہر قسم کے مسائل کے شکنجے میں اس طرح جکڑ دی گئی ہے کہ ایک مسئلہ حل ہوتا نہیں کہ دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔

دین پھیلانے کی محنت ہی امت مسلمہ کو متحد اور یکجا کر سکتی ہے

آج ہمارا بہت بڑا مسئلہ باہمی تشتت و افتراق ہے (تشتت و افتراق کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ انتشار، بکھراؤ، اور باہمی جدائی یا پھوٹ کے ہیں مجموعی طور پر تشتت و افتراق سے مراد افراد، معاشرے یا امت کا باہمی اتحاد ختم ہو کر ٹکڑوں میں بٹ جانا، خیالات اور مقاصد کا پراگندہ ہو جانا، اور باقاعدہ انتشار و افتاد کی کیفیت کا پیدا ہونا ہے۔ دینی اور سماجی تناظر میں یہ اصطلاح اتفاق و اتحاد کی ضد کے طور پر استعمال ہوتی ہے، جہاں باہمی اختلافات اور دوریوں کی وجہ سے اتفاق کا شیرازہ بکھر جاتا ہے) ہماری پوری تاریخ شاہد ہے کہ یہ امت صرف دعوت و جہاد پر ہی جمع و متحد ہو سکتی ہے نہ کہ کسی مسلک پر، کیونکہ پوری امت نہ حنفی بن سکتی ہے نہ مالکی نہ شافعی نہ حنبلی، نہ امت کسی ایک بزرگ کی بیعت پر اور تصوف کے کسی خاص سلسلے پر متفق ہو سکتی ہے، نہ کسی ایک جامعہ یا ادارہ مثلاً جامعہ ازہر یا دیوبند پر متحد ہو سکتی ہے۔ آج بھی کھلی آنکھوں سے یہ حقیقت دیکھی جا سکتی ہے کہ جہاں تبلیغ کا کام شروع ہوا، پوری امت ایک جگہ جمع ہو گئی۔ مثلاً تبلیغی جماعت (جس کا کام دعوت کے بجائے تذکیر ہے) کے اجتماعات میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی ہر مذہب کے لوگ اور تصوف کے ہر سلسلے کے افراد اور ہر نسل کے ہزارہا افراد جمع ملیں گے، مثلاً سوڈانی، نائجیرین، اردنی، سعودی، انڈونیشی وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح جہاد افغانستان میں سعودی، شامی، مصری، یمنی، الجزائری، مراکشی، لیبیائی، افریقی، یورپی، امریکی،

چینی، چیچن، البانی، ترکستانی غرض کہ ہر ملک ونسل کے مسلمانوں نے اپنا حصہ ڈالا، جبکہ دعوت و جہاد کے علاوہ دین کے دوسرے شعبوں میں صرف قومی نسلی جھلک ہی نظر آئے گی۔

بہرحال اس آیت سے معلوم ہوا کہ مجموعی طور پر تبلیغِ دین فرضِ کفایہ ہے۔ اس کی بہت سی صورتیں ہیں جیسے مصنفین کا تصنیف کرنا، مقررین کا تقریر کرنا، مبلغین کا بیان کرنا، انفرادی طور پر لوگوں کو نیکی کی دعوت دینا وغیرہ، یہ سب کام تبلیغِ دین کے زمرے میں آتے ہیں اور بقدرِ اخلاص ہر ایک کو اس کی فضیلت ملتی ہے۔ تبلیغ قولی بھی ہوتی ہے اور عملی بھی اور بسا اوقات عملی تبلیغ قولی تبلیغ سے زیادہ مُؤثّر ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ جہاں کوئی شخص کسی برائی کو روکنے پر قادر ہو وہاں اس پر برائی سے روکنا فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں، سرکارِ دو عالم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان کے ذریعے روکے، اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو دل میں برا جانے اور یہ کمزور ایمان والا ہے۔ (مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان۔۔۔ الخ، ص ۴۴، الحدیث: ۷۸(۴۹)) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف ایک اخلاقی ذمہ داری نہیں، بلکہ یہ اسلام کا بنیادی ستون ہے، اگر امت مسلمہ اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرے، تو وہ دنیا میں سر بلند ہو گی اور آخرت میں اللہ کی رحمت کا مستحق ٹھہرے گی۔ اللہ ہم تمام کو ہدایت اور توفیق سے نوازے، ہم سے دین کی خدمت لے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے۔

اختلاف کے اصول وآداب قرآن وسنت کی روشنی میں

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ ؕ

وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۰۵﴾

اختلافِ رائے کے آداب

وَلَا تَکُوْنُوْا	اور نہ تم ہو جاؤ	کَالَّذِیْنَ	ان لوگوں کی طرح جو
تَفَرَّقُوْا	جدا جدا ہو گئے	وَاخْتَلَفُوْا	اور انہوں نے (باہم) اختلاف کیا
مِنْ بَعْدِ	اس کے بعد	مَا جَآءَھُمُ	کہ آ گئیں ان کے پاس
الْبَیِّنٰتُ	واضح دلیلیں	وَاُولٰٓئِکَ	اور یہی لوگ ہیں
لَھُمْ	ان کے لیے	عَذَابٌ عَظِیْمٌ	بہت بڑا عذاب ہے۔

ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جو متفرق ہو گئے، گروہوں میں بٹ گئے اور انہوں نے اختلاف کیا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ ؕ واضح احکام و دلائل آ جانے کے بعد۔ یہ اختلاف کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں پیدا ہوئے۔ بلکہ انہوں نے اپنی خواہشات نفسانیہ کی تکمیل کے لیے دیدہ دانستہ اختلاف کا راستہ اختیار کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۰۵﴾ اور ایسے لوگ خدا کے نزدیک بڑے عذاب کے مستحق

ہیں۔اس آیت کے متعلق امام ابن کثیر، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور بعض دیگر مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ یہاں جس اختلاف کی ممانعت کی گئی ہے، وہ اصول دین کا اختلاف ہے۔ کیونکہ قطعی اصولوں میں اختلاف کرنا قطعی ناجائز ہے۔ ایسے اختلافات سے دین کا عقیدہ ہی بگڑ جاتا ہے اور انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔ اصول دین میں توحید، رسالت اور قیامت وغیرہ کے مسائل آتے ہیں۔ فروعات میں اختلاف روا ہے۔ مگر ایسا اختلاف بھی اگر نفسانی خواہشات کے تابع کیا جائے تو جائز نہیں ہوگا۔

امت مسلمہ پر اصلاً دین حق کی اقامت واشاعت اور اس کے احکام کی تعمیل فرض ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے مکلف ہے لیکن چونکہ انسانوں کے مزاج، میلانات اور فہم وفراست میں اختلاف پایا جاتا ہے اس لئے دین کی تعبیر و تشریح میں اختلاف پایا جانا فطری ہے مگر یہ اختلاف آراء صرف ان امور میں جائز ہے جہاں نصوص شریعت میں ایک سے زائد توجیہات کی گنجائش ہو، مسلّمات وکلیات دین میں اختلاف کی اجازت نہیں ہے، اس کے ساتھ دین رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ فروعی امور میں رائے یا نقطہ ہائے نظر اور مسالک وغیرہ کا اختلاف، دلوں کے اختلاف اور باہم تنازع ومنافرت کی شکل اختیار نہ کرنے پائے کہ دلوں کا اختلاف بالاتفاق حرام اور افراد امت کیلئے ایک عظیم خطرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحب امر ہیں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کے حوالہ کر دو اگر واقعی تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ صحیح طرز عمل ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔“ (نساء: ۵۹) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ مؤمن ہو جاؤ اور مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔“ (مسلم) گویا ایمان، دخول جنت کے لئے اور الفت ومحبت باہم تکمیل ایمان کے لئے شرط ہے۔ اسلام کے اس بنیادی اصول سے غفلت کے نتیجہ میں امت فرقوں میں بٹ گئی اور فکر ونظر اور رنگ ونسل کا اختلاف عملی اختلاف میں تبدیل ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان اتباع ہویٰ میں صحیح اور غلط کا فرق ملحوظ نہیں رکھ پاتا اور اصول وفروع کی عدم تعیین کی وجہ سے فروعی اختلاف، اصول وکلیات کے اتفاق پر غالب آجاتا ہے، نتیجتاً نوافل و مستحبات کا اختلاف، فرائض وواجبات سے دور کردیتا ہے حالانکہ صحیح اور راست طرز عمل یہ ہے کہ متفق علیہ امور میں ایک دوسرے کا تعاون کیا جائے اور مختلف ومتنازع فیہ مسائل میں اظہار نکیر اور طعن و تشنیع کے بجائے وسعت قلب ونظر اور رواداری کا ثبوت دیا جائے۔

اس بات سے کسے انکار ہوگا کہ اتباع حق، جستجوئے صواب اور التزام علی الحق، صراط مستقیم اور سواء السبیل کی طرف راہ نمائی کرتا ہے، ہوائے نفس، تعصب وتنگ نظری سے محفوظ رکھتا ہے اس لئے مختلف فیہ امور میں ہوائے نفس اور ذاتی مصالح کو در آنے کا کبھی موقع نہیں ملنا چاہئے۔کوشش تو یہ ہو کہ اختلاف پیدا ہی نہ ہو اور بحث وتکرار کے بجائے شریعت کی صریح اور متفق ہدایات کی روشنی میں مسائل کا حل تلاش کرلیا جائے، اس کے بعد بھی اگر کسی مسئلہ میں اختلاف واقع ہو جائے تو کتاب اللہ کی تعمیل کرتے ہوئے اللہ اور رسول کے حکم کے آگے سر اطاعت جھکا کر اس اختلاف کو دور کرلیا جائے کہ علمی فروگزاشتوں اور فقہی شذوذ کو تلاش کرنا (فقہی شذوذ سے مراد ایسا انفرادی، غیر معمولی یا ضعیف فقہی قول یا نظریہ ہے جو جمہور فقہاء کے مسلمہ اصولوں، اجماع یا راجح دلائل کے خلاف ہو۔) اور جمع کرکے عوام میں پھیلانا، اہل علم کا شیوہ نہیں ہے، اس سے کسی خاص مسلک ہی نہیں بلکہ پورے دین پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے نیز یہ بدترین اور دشمنانہ روش ہے جس کے پیچھے خاص وعام کوئی مصلحت نہیں ہے۔لغزشوں کو ڈھونڈنا اور غلطیوں کو تلاش کرنا بیمار دل اور بدنیت شخص کا کام ہے اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی انسان معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔اگر ایسا ہوتا تو مخطی (جس سے بے ارادہ خطا ہو جائے) مجتہد اجر وثواب کا مستحق نہ ہوتا۔امت کی پسماندگی اور زبوں حالی کا شدید تقاضا ہے کہ سچی اسلامی اخوت کے احیاء کے لئے سعی پیہم اور جہد مسلسل کی جائے تاکہ امت کے سبھی طبقے اور جماعتیں ہر چیز سے بلند ہو کر اللہ کے دین کی اعانت ومحبت اور اللہ ورسول کے لئے دوستی پر ایک ہوسکیں، ہر شخص کی رائے کا احترام ہو کہ کسی کی رائے پر بے وجہ اعتراض کرنا

اوراس کی تنقیص کرنا علم کے باب میں ناپسندیدہ ہے، کسی مجتہد کا اجتہادی سہو اس کی توہین کرنے کا جواز فراہم نہیں کرتی اور نہ کسی کو بدنام کرنے کی نفسانیت پسندیدہ ہے اہل علم کا فرض ہے کہ وہ اسلامی اخوت کی قدر و قیمت کا احساس کریں کیونکہ حق کسی خاص مسلک میں محدود نہیں ہے اور اختلاف رائے، لڑائی کا موجب نہیں ہوتا۔ اجتہاد کی شان یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں اختلاف ہوتا ہے مگر یہ اختلاف، نفاق وشقاق کی بنیاد نہیں بنتا (نفاق وشقاق سے مراد دل میں کچھ اور اور زبان پر کچھ اور رکھنا، مخالفت کرنا اور باہمی دشمنی یا پھوٹ پیدا کرنا ہے) اور نہ اس کی وجہ سے بغض وعناد کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ تنقید کا مطلب ہی یہ ہے کہ ناقد، حق کو اپنے اندر محدود نہ سمجھے، بحث ومباحثہ کا ادب یہ ہے کہ کسی کی عزت وآبرو اور دین وایمان پر حملہ نہ ہو، خصوصیت سے ان علماء اور خادمانِ دین کی، جو یگانہ ہیں، جنہوں نے اس دین کی بے لوث خدمت کی ہے، جو علم کے نہایت اونچے مرتبہ پر فائز ہیں، جنہوں نے راہ خدا میں جہاد کیا اور اس دین کے راستہ میں چوٹیں کھائیں اور خدمتِ دین میں جن کا اخلاص نمایاں ہے۔ اس گزارش کا مقصود انہیں لغزشوں سے بری قرار دینا نہیں ہے کہ ہر عالم کی رائے اخذ ومواخذہ کے قابل ہے لیکن کسی جنایت کار (جنایت کار" کا معنی مجرم یا گناہ کرنے والا ہے، شریعت میں ہر اس حرام یا ممنوع فعل کو" جنایت" کہا جاتا ہے جو قانونِ الٰہی یا حقوق کی خلاف ورزی ہو (عموماً اس کا اطلاق بڑے جرائم اور گناہوں پر ہوتا ہے) ملحد، خود غرض کافر، حاسد مستشرق اور عالم دین کی ہر تنقید وتردید میں بہت فرق ہوتا ہے، اسی فرق کی رعایت کی وجہ سے صحابہ کرام علیہم الرضوان، تابعین عظام اور ائمہ سلف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا اختلاف تفریق وانتشار کا سبب نہیں بنا، علم کی پہچان یہ ہے کہ وہ بحث وتکرار سے دور رہتا ہے کہ تکرار دلوں کو بدل دیتی ہے اور الفت ویگانگت کے بعد جدائی کا وارث بنا دیتی ہے لہٰذا کسی عالم کو زیب نہیں دیتا کہ وہ لوگوں کو کسی ایک مذہب پر عمل کے لئے مجبور کرے۔

کسی عالم سے فرض کیجئے کہ آپ کسی مسئلے میں اختلاف ہو جائے، یا دوسرا عالم آپ سے مختلف ہو جائے، تو مسئلے میں اختلاف کرنا تو جائز ہے جب اپنے کو دیانتاً علی التحقیق سمجھے، لیکن بے ادبی اور تمسخر

کرنا کسی حالت میں جائز نہیں ہے کیونکہ بے ادبی اور تمسخر کرنا دین کا نقصان ہے۔اور اختلاف کرنا محبت ہے، یہ عین دین ہے۔دین جائز ہے اور خلافِ دین جائز نہیں۔اختلافِ رائے کا حق حاصل ہے حتیٰ کہ اگر ذاتی رائے اور مشورہ ہو تو انبیاء علیہم السلام سے بھی آدمی رائے میں مختلف ہو سکتا ہے۔ احکام اور اوامر کا جہاں تک تعلق ہے، اختلاف اور رائے زنی جائز نہیں۔حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”کسی مومن اور مومنہ کے لیے جائز نہیں ہے کہ جب حکم آجائے اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تو پھر اس کے سامنے چوں چرا کی جائے۔“

ائمہ مجتہدین کا باہمی طرزِ عمل

ائمہ مجتہدین کا بھی یہی طریقہ ہے کہ ایک دوسرے سے ظاہری اختلاف رکھتے تھے لیکن ادب اور عظمت میں کمی نہیں کرتے۔جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغداد تشریف لائے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوئے تو امام (ابوحنیفہ) صاحبؒ کا مسلک ہے کہ نماز میں فاتحہ کے بعد آمین آہستہ کہنا، اور امام شافعیؒ کے ہاں زور سے کہنا افضل و اولیٰ ہے۔مگر جب امام شافعیؒ نے مزار والی مسجد میں نماز پڑھی تو آمین کو آہستہ سے پڑھا اور فرمایا، مجھے حیا آتی ہے اس صاحبِ مزار سے کہ اس کے قریب آکر اس کے اجتہاد کے خلاف کروں۔یہ ادب اور تادّب ہے (ادب اور تادّب دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں جو انسانی اخلاق، تہذیب اور شائستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔”ادب“ کے معنی سلیقہ اور اچھے طریقے کے ہیں، جبکہ ”تادّب“ کا مطلب ادب سیکھنا اور اخلاقی تربیت حاصل کرنا ہے۔) یعنی جس حد تک گنجائش ہو۔ایک تو حرام و حلال اور جائز و ناجائز کا فرق ہے کہ ایک کے ہاں جائز دوسرے کے ہاں حرام، اس میں تو دوسرے کے مسلک پر عمل نہیں کر سکتے، مگر جہاں اولیٰ و غیر اولیٰ کا فرق ہے وہاں ادب ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ نے افضل پر عمل ترک اور غیر افضل پر عمل کیا امام صاحب رحمہ اللہ کی رعایت سے، حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت مزار میں ہیں، سامنے نہیں ہیں مگر یہ ادب کا عالم تھا اور یہ ادب اور تادّب کی بات تھی۔

مسائل اور جذباتِ نفسانی

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان بھی اختلافات تھے۔ائمہ مجتہدین میں اجتہادی مسائل پر جو اختلافات ہیں وہ صحابہ میں بھی تھے لیکن باوجود اس کے اس ادب واحترام اور عظمت وتعظیم میں ذرہ برابر کمی نہ کی۔اس لیے ہمارے ہاں جھگڑوں کی وجہ مسائل کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہمارے نفسانی جذبات ہیں۔ہم نے اپنے جذبات کو نکالنے میں مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے۔اگر یہ مسائل کی خاصیت ہوتی تو سب سے پہلے صحابہ علیہم الرضوان لڑتے کیونکہ ان کے ہاں بھی اختلاف تھا۔اس کے بعد ائمہ مجتہدین کے ہاں لاٹھی چلتی، پھر علماء ربانیین آپس میں لڑتے۔مگر اختلاف بھی ہے اور ادب بھی۔یہ دراصل اختلافِ رائے کے نام سے ہم اپنے جذبات نکالتے ہیں۔اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ لڑنے کی چیز اصل میں جائیداد ہے، مکان ہے، جاگیر ہے۔جب مسلمان کے پاس یہ چیزیں نہ رہیں، نہ جائیداد، نہ مکان، نہ سلطنت تو سوچا کہ بھئی دین کو لڑنے کا ذریعہ بناؤ اور مسائل کو آڑ بناؤ۔تو یہ مسائل کی خاصیت نہیں۔اختلاف کرنے کی گنجائش ہے مگر لڑنے جھگڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اختلافی مسائل میں راہِ صواب

اگر اجتہادی مسئلہ ہے تو اسے بیان کرو مگر لڑنا کیوں ہے؟ وہ اپنی قبر میں جائے گا اور تم اپنی قبر میں جاؤ گے۔کیونکر اس سے مسخرگی کرو؟ (مسخرگی کا بنیادی معنی مسخرہ پن، ہنسی مذاق، دل لگی اور ٹھٹھول ہے) اور اسے کیا حق ہے کہ تمہارا استہزا کرے؟ آپ نے بیان کیا، امر بالمعروف کا حق ادا ہوگیا، اب اگر کوئی بات نہیں مانتا تو نہ مانے۔اگر اس کے پاس کوئی حجت ہے تو وہ عند اللہ جواب دے گا، تم ذمہ دار نہیں ہو، نہ تم سے آخرت میں پوچھا جائے گا۔اور پھر دین منوانا (یعنی اصولِ دین پر کسی کو مجبور کرنا) بھی ضروری نہیں، چہ جائیکہ فروعی اور اجتہادی مسائل کا منوانا ضروری ہو۔بہر حال آج کل ذرا ذرا سے اختلافی مسائل پر لوگ نزاع کا دروازہ کھول دیتے ہیں، اس سے مسلمانوں میں

جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی قوت زائل ہو رہی ہے۔

ایک شخص اجتہادی رائے کے بارے میں اتنا جمود کرے کہ کسی کو معذور بھی نہ سمجھ سکے، یہ درحقیقت عوام کی اصلاح نہیں، فساد ہے۔ تو ایک چیز، چلّانے کی ضرورت نہیں کہ بار بار کہے۔ بس ہو گیا ایک مسئلہ کا اعلان، ماننے والے مانیں گے، تم ذمہ دار اور خدائی ٹھیکیدار نہیں ہو۔ ایک مسئلہ کا ضد اور اصرار کے ساتھ پیش کرتے رہنا اور چباتے رہنا، اس سے خواہ مخواہ عوام میں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ کہنے والا تو بچ گیا اور مصیبت عوام پر آ گئی۔ ہاں ایک ہیں دین کے اصول، نماز فرض ہے، روزہ فرض ہے، زکوٰۃ دینا فرض ہے، آپ زور سے کہہ سکتے ہیں۔ لیکن فروعی اور اجتہادی چیزوں میں آپ زور دیں تو یہ تبلیغی چیزیں ہی نہیں، آپ زور کہاں سے دیتے ہیں؟ مثلاً حنفی مسائل ہیں جو تبلیغی مذہب ہی نہیں۔ آپ اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہیں کہ لوگو، تم شافعی بن جاؤ، حنفی مت بنو۔ یہ ترجیحی مذاہب ہیں تبلیغی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں عمل واجب یا افضل ہے اور فلاں عمل نہیں۔ تو ترجیحی مذاہب کو تبلیغی مذہب مت بناؤ کہ اگر کسی عالم کی کوئی جزئی تحقیق ہو، خواہ مخواہ اس کی تبلیغ پر ضد اور اصرار کیا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جس اختلاف کی ممانعت کی گئی ہے، وہ اصول دین کا اختلاف ہے۔ کیونکہ قطعی اصولوں میں اختلاف کرنا قطعی ناجائز ہے۔ ایسے اختلافات سے دین کا عقیدہ ہی بگڑ جاتا ہے اور انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔ اصول دین میں توحید، رسالت اور قیامت وغیرہ کے مسائل آتے ہیں۔ فروعات میں اختلاف روا ہے۔ مگر ایسا اختلاف بھی اگر نفسانی خواہشات کہ تابع کیا جائے تو جائز نہیں ہوگا بلکہ حرام ہوگا۔ ایسی چیزیں جو فروعات میں شمار ہوتی ہیں، مگر اجماع امت میں متفق علیہ ہیں، ان میں بھی اختلاف کرنا اصول دین میں اختلاف کرنے کے مترادف ہے۔ ایسے اجماع علیہ مسائل میں اختلاف کرنا بذات خود گمراہی ہے اس آیت کریمہ میں ایسے ہی اختلافات سے منع کیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے مختلف اسلوب اور پیرائے سے بار بار اس حقیقت کی نشان دہی کی ہے...... اور اس سے دور رہنے کی تاکید فرمائی۔ افسوس ہے کہ آج مسلمان کہلانے والوں میں بھی سینکڑوں فرقے

شریعت اسلامیہ کے صاف وصریح اور مسلّم ومحکم اصول سے الگ ہو کر اور ان میں اختلاف ڈال کر اس عذاب کے نیچے آئے ہوئے ہیں۔ تاہم اسی طوفان بدتمیزی میں اللہ و رسول کے وعدہ کے موافق ایک عظیم الشان جماعت بحمد اللہ خدا کی رسی کو مضبوط تھامے ہوئے مَآ اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِیْ کے مسلک پر قائم ہے اور تا قیام قیامت قائم رہے گی۔ باقی فروعی اختلافات جو صحابہؓ اور ائمہ مجتہدین میں ہوئے ہیں، انکو آیت بالا سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے عمل کی۔

مصائب ومشکلات میں توبہ اور رجوع الی اللہ کی ضرورت واہمیت

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ
بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ
وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٧﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ
بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٨﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿١٠٩﴾

چہرے کے سفید یا سیاہ ہونے کا مطلب

يَّوْمَ	جس دن	تَبْيَضُّ	سفید ہونگے
وُجُوْهٌ	کئی چہرے	وَّتَسْوَدُّ	اور سیاہ ہونگے
وُجُوْهٌ	کئی چہرے	فَاَمَّا	پس لیکن
الَّذِيْنَ	وہ لوگ جو	اسْوَدَّتْ	سیاہ ہونگے
وُجُوْهُهُمْ	ان کے چہرے (اُن سے کہا جائے گا)		
اَكَفَرْتُمْ	کیا تم نے کفر کیا تھا	بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ	بعد اپنے ایمان (لانے) کے
فَذُوْقُوا الْعَذَابَ	تو (اب) تم چکھو عذاب	بِمَا	بسبب اُس کے جو

كُنْتُمْ	تھے تم	تَكْفُرُوْنَ	کفر کرتے ۔(106)

فرمایا يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ جس دن بہت سے چہرے سفید ہوں گے ۔یقیناً اہل ایمان اور سنت پر عمل کرنے والوں کے چہرے قیامت کے دن سفید ہونگے ۔وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ البتہ کفر، شرک ،بدعت اور معصیت میں ملوث لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے،ان سے کہا جائے گا۔ چہرے کا سفید یا سیاہ ہونا عربی محاورے ہیں ۔جیسے سرخ رو ہونا اردو محاورہ ہے ۔اس میں چہرے کا سرخ ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے کامیابی کے تاثرات کا چہرے پر نمایاں ہونا۔اسی طرح عربی میں چہرے کے سفید یا سیاہ ہونے کا مطلب ہے...... کامیابی کے تاثرات اور ناکامی کے تاسف کا چہرے پر نمایاں ہونا ہے ۔فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ تو جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے (انہیں کہا جائے گا) کیا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا تھا؟ کفر اعتقاد میں بھی ہوتا ہے اور اعمال میں بھی ۔اگر عقیدہ بگڑ گیا، تو ایمان میں کفر پیدا ہوا اور اگر اعمال میں کفر کیا، تو اعمال کفار جیسے ہو گئے ۔اس سے بظاہر تو مرتدین مراد ہیں، مگر درحقیقت یہ تمام کفار کو شامل ہے، کیونکہ جب ثابت ہے کہ روز اول کے وقت سب نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کیا تھا اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ ہر شخص دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لہٰذا جو بھی کفر اختیار کرے گا وہ ایمان لانے کے بعد ہی کافر ہو گا۔اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اصلی کافر، مرتدین، منافقین اور پھر اہل بدعت سبھی آجاتے ہیں، کیونکہ یہ سب ایمان لانے کے بعد کفر کر رہے ہیں ۔(رازی ۔شوکانی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”معلوم ہوا کہ سیاہ منہ ان کے ہیں جو مسلمانی میں کفر کرتے ہیں، منہ سے کلمۂ اسلام کہتے ہیں اور عقیدہ اس کے خلاف رکھتے ہیں، سب گمراہ فرقوں کا یہی حکم ہے۔“ (موضح) فرمایا اس کی سزا یہ ہے فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿١٠٦﴾ سو جو تم کفر کرتے رہے اس کے بدلے عذاب کا مزا چکھو ۔یعنی یہ عذاب اس دن میں ہو گا جس میں کچھ چہرے سفید اور نورانی ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے اور وہ قیامت کا دن ہے ۔جس میں مومنین کے چہرے جگمگا رہے ہوں گے اور کافروں

کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔اور یہ اس لیے ہوگا تا کہ میدان حشر میں ہر شخص مومن اور کافر،سعید اور شقی اور نیک بخت اور بد بخت کو ان علامتوں سے پہچان لے۔

دو چہروں والا انسان،سماج کے لئے خطرناک

وَاَمَّا الَّذِيْنَ	اور لیکن وہ لوگ	ابْيَضَّتْ	(کہ) سفید ہوں گے
وُجُوْهُهُمْ	ان کے چہرے	فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ	تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے
هُمْ فِيْهَا	وہ اس میں	خٰلِدُوْنَ	ہمیشہ رہیں گے۔(107)

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ط رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو یہ اللہ کے سایہ رحمت میں ہوں گے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار مومن اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جگہ جنت میں ہوں گے اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔دنیا میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ستاری کے پردہ میں کیسے کیسوں کو ڈھانپ رکھا ہے،اگر یہ پردہ ہٹ جائے،تو بڑے بڑوں کے لئے آبرو بچانی مشکل ہو جائے،نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں میں سب سے براوہ ہے جس کے دو چہرے ہوں،جو کبھی ایک گروہ کے پاس جائے تو ایک چہرہ لے کر جائے اور دوسرے گروہ کے پاس جائے تو دوسرا چہرہ لے کر جائے۔یہ سماج کی ایک ایسی تصویر کھینچی گئی ہے کہ اگر سماج میں ایسا فرد ہو تو اس سے سماج کو کتنا نقصان پہنچے گا اور گھر اور خاندان کو کتنا نقصان پہنچے گا جس کے دو چہرے ہوں،جو کبھی ادھر ہو اور کبھی اُدھر۔موجودہ اصطلاح میں جسے ڈبل کراس ایجنٹ کہا جاتا ہے،کیونکہ وہ اپنے ملک کے لیے بھی جاسوسی کرتا ہے اور دوسرے ملک کے لیے بھی جاسوسی کرتا ہے۔اسی لیے وہ ڈبل کراس کہلاتا ہے۔مذہب اور اخلاق دونوں ہی دورنگی کو پسند نہیں کرتے بلکہ وہ انسان کو سیدھی راہ پر دیکھنا چاہتے ہیں۔دو چہرے والا فرد شیطانی طاقتوں کا اسیر اور ان کا غلام ہوتا ہے۔شاید اسی کو منافق بھی کہتے ہیں جو نہ اِدھر ہے اور نہ اُدھر،نہ اسلام میں ہے اور نہ کفر میں۔اسی لئے دنیا میں عام طور پر انسان کی صورت سے اس کے نیک و بد اور شریف و رذیل ہونے کا اندازہ کرنا دشوار ہوتا ہے؛لیکن آخرت میں انسان کا چہرہ بھی اس کے اعمال کی گواہی دے گا،جو نیک اور متقی ہوں گے،ان کے

چہرے نورانی اور روشن ہوں گے اور جو بدکار ہوں گے، ان کے چہرے بے نور اور تیرہ و تاریک، یہ بجائے خود اعزاز اور تذلیل کی ایک صورت ہوگی۔ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ﴿۱۰۷﴾ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار مومن...... اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جگہ جنت میں ہوں گے اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ کیونکہ جنت محض عمل سے نہیں ملتی۔ عمل کے بعد خدا کی رحمت سے ملتی ہے۔ اور وہی جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی رحمت کے سامان کیئے ہیں۔

لفظ ظلم کا بڑا وسیع مفہوم

تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ	یہ اللہ کی آیات ہیں	نَتۡلُوۡهَا	ہم انہیں پڑھتے ہیں
عَلَيۡكَ	آپ پر	بِالۡحَـقِّ	ٹھیک ٹھیک
وَمَا اللّٰهُ	اور نہیں اللہ	يُرِيۡدُ	ارادہ کرتا
ظُلۡمًا	ظلم کرنے کا	لِّلۡعٰلَمِيۡنَ	جہان والوں کے لیے۔

فرمایا تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَـقِّ ؕ یہ اللہ کی آیتیں ہیں۔ جن کو ہم آپ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں تِلۡكَ سے گذشتہ آیات کی طرف اشارہ ہے، یعنی یہ آیتیں ہم آپ پر اصل حقیقت واضح کرنے کے لیے نازل کرتے ہیں۔ یاد رکھو! وَمَا اللّٰهُ يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِيۡنَ﴿۱۰۸﴾ اللہ تعالیٰ جہان والوں پر ذرہ بھر بھی ظلم کا ارادہ نہیں رکھتا۔ جو کچھ ملے گا بندوں کے اپنے اعمال کا ثمرہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کسی پر زیادتی نہیں کرتے۔ ایسا نہیں ہوگا کہ بے عمل کو اچھا بدلہ دے دیا جائے، یا کم جرم کے مجرم کو زیادہ سزا دی جائے۔ ہاں! مگر کوئی شخص جرم کر کے سزا سے بچ بھی نہیں سکے گا۔ اسے اپنے جرم کی سزا بھگتنا ہوگی۔ لفظ ظلم بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے اور اس کی ضد عدل ہے اور اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ ظالم نہیں۔ اس لئے اس سے ایسے افعال کا صدور ممکن ہی نہیں جس میں ظلم کا شائبہ تک پایا جاتا ہو۔ مثلاً وہ کسی مستحق رحمت کو سزا دے دے، یا زیادہ اجر کے مستحق کو تھوڑا اجر دے یا کم سزا کے مستحق کو زیادہ سزا دے دے وغیرہ وغیرہ، ایسی سب باتیں اس کی صفت عدل کے منافی ہیں۔ یعنی لوگ جہنم میں لے جانے والے اپنے اعمال کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا...... اور کسی کو بے جرم عذاب نہیں دیتا

اور کسی کی نیکی کا ثواب کم نہیں کرتا۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ وہ مالک ومختار اور ہر چیز پر قادر ہے۔ اور سب کچھ جانتا ہے۔ اس لیے اسے اپنی مخلوق پر ظلم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

رجوع الی اللہ کا مطلب

وَلِلّٰهِ	اور اللہ ہی کیلئے ہے	مَا	جو کچھ
فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں ہے	وَمَا	اور جو کچھ
فِي الْاَرْضِ	زمین میں ہے	وَاِلَى اللّٰهِ	اور اللہ ہی کی طرف
تُرْجَعُ	لوٹائے جائیں گے	الْاُمُوْرُ	تمام کام۔(109)

فرمایا وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ ہر چیز پر اسی کا تصرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اور اس کے بنائے ہوئے آسمان کے نیچے بسنے اور اس کی نعمتوں کو استعمال کرنے والا اس کے خلاف کیسے کچھ کر سکے گا۔ اگر کوئی شخص اللہ کے ساتھ شریک بنائے گا۔ سنت کو ترک کریگا، دین میں رخنہ اندازی کریگا، تو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے۔ کیونکہ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ سب نے اس کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ تمام معاملات کا فیصلہ وہیں ہوگا۔ یعنی تمام معاملات کا فیصلہ اور تمام امور کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے یعنی جس نے انہیں پیدا کیا، انہیں رزق دیا، اور اپنی قضاء وقدر کے مطابق اور اپنی شریعت اور احکام کے مطابق ان میں تصرف کرتا ہے۔ قیامت کے دن وہ اسی کے پاس واپس جائیں گے پھر وہ انہیں اچھے اور برے اعمال کا بدلہ دے گا۔ جب زمین و آسمان اور ساری کائنات کا خالق و مالک اور متصرف ومختار اللہ ہی ہے تو پھر وہی عبادت اور پکار کے لائق ہے اس لیے عبادت صرف اسی کی کرو، اور ضرورتوں اور مصیبتوں میں صرف اسے ہی پکارو۔ یعنی جب کائنات کی چیزوں کے متعلق "رجوع الی اللہ" کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اگرچہ ظاہری طور پر انسانوں کی حکومت اور دنیوی چیزوں کا انسانوں کی ملکیت میں ہونا نظر آتا ہے، لیکن ایک وقت آئے گا (یعنی آخرت میں) جب انسان کے یہ تمام ظاہری اختیارات بھی ختم ہو جائیں

گے اور ہر چیز صرف اللہ کے حکم اور اختیار میں چلی جائے گی۔ رجوع الی اللہ“ کی اصطلاح عرف میں اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ واستغفار کے ذریعے رجوع کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے، لہٰذا مؤمن کے لیے جب ”رجوع الی اللہ“ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کا اپنے پچھلے گناہوں سے معافی مانگنا اور حقوق اللہ اور حقوق العباد میں اس پر جو ذمہ عائد ہوتے ہیں اس کی تلافی کی نیت کرنا اور آئندہ زندگی میں فرائض، واجبات ادا کرنے اور حرام چیزوں سے بچنے کی پابندی، نیز سنن، نوافل ادا کرنے اور مکروہات سے بچنے کا اہتمام کرنے کی نیت کرنا۔ اور غیر مسلم کے لیے ”رجوع الی اللہ“ کا لفظ استعمال ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اپنی گزشتہ نافرمانی اور کفر وشرک والی زندگی سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ اور اس کے احکامات کی طرف لوٹنا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو بندہ استغفار کرتا ہے، وہ اللہ کے عذاب سے مامون رہتا ہے (مسند احمد، حدیث: ۲۳۹۵۳) یہ ایک حقیقت ہے کہ آج امت کی اکثریت نہ صرف گناہوں میں مبتلا ہے، بلکہ زندگی کے ہر گوشے میں شریعت کے احکام کی دھجیاں اڑا رہی ہے، ان حالات میں کیسے اللہ کی رحمت متوجہ ہوگی اور مصیبتیں دور ہوں گی، لہٰذا مصیبت کی گھڑی میں خاص طور پر استغفار کا اہتمام کرنا چاہئے، استغفار کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کے سلسلے میں جو جو کوتاہیاں اس سے ہوتی رہی ہیں، انہیں یاد کرتے ہوئے مغفرت کا طلب گار ہو اور جن گناہوں کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہو، ان کے بارے میں اللہ سے مغفرت چاہنے کے علاوہ صاحب حق کا بھی حق ادا کرے، یا ان سے معاف کرالے۔

عصر حاضر کا اہم ترین تقاضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ
وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ
الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

بنی اسرائیل اور امتِ محمدیہ کی افضلیت میں فرق

كُنْتُمْ	ہو تم	خَيْرَ اُمَّةٍ	بہترین امت
اُخْرِجَتْ	جو نکالی (بنائی) گئی ہے	لِلنَّاسِ	لوگوں کے لیے
تَاْمُرُوْنَ	تم حکم کرتے ہو	بِالْمَعْرُوْفِ	اچھے کاموں کا
وَتَنْهَوْنَ	اور تم روکتے ہو	عَنِ الْمُنْكَرِ	بُرے کاموں سے
وَتُؤْمِنُوْنَ	اور ایمان لاتے ہو	بِاللّٰهِ	اللہ پر
وَلَوْ	اور اگر	اٰمَنَ	ایمان لے آتے
اَهْلُ الْكِتٰبِ	اہل کتاب	لَكَانَ	(تو) البتہ ہوتا
خَيْرًا	بہت بہتر	لَّهُمْ	ان کے لیے

مِنْهُمُ	(بعض) ان میں سے	الْمُؤْمِنُوْنَ	ایمان لانے والے ہیں
وَ اَكْثَرُهُمُ	اور اکثر اُن میں سے	الْفٰسِقُوْنَ	فاسق ہیں (110)

ارشاد ہوتا ہے۔ اے امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امت كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ تم بہترین امت ہو كُنْتُمْ ماضی بعید کا صیغہ ہے امام بیضاوی رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ اس بات کا تذکرہ ماضی میں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور لوح محفوظ میں بھی یہ بات موجود ہے کہ اللہ کے ہاں تم سب سے بہتر امت ہو، اس کا فیصلہ روز ازل سے ہو چکا ہے۔ یہودیوں میں سے مالک بن صیف اور وہب بن یہودا نے حضرت عبد اللہ بن مسعود وغیرہ صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُم سے کہا کہ ”ہم تم سے افضل ہیں اور ہمارا دین تمہارے دین سے بہتر ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (خازن ال عمران، تحت الآیۃ: ۱۱۰، ۱ / ۲۸۷) اور اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو تمام امتوں سے افضل قرار دیا۔ حضرت علی المرتضیٰ کَرَّمَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم سے روایت ہے، حضور پر نور صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ”مجھے وہ کچھ عطا کیا گیا جو کسی اور نبی کو عطا نہیں کیا گیا۔ ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، وہ کیا ہے؟ ارشاد فرمایا ”رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی، مجھے زمین کی کنجیاں عطا کی گئیں، میرا نام احمد رکھا گیا، میرے لئے مٹی کو پاکیزہ کرنے والی بنا دیا گیا اور میری امت کو بہترین امت بنا دیا گیا۔ (مسند امام احمد، ومن مسند علی بن ابی طالب، ۱ / ۲۱۰، الحدیث: ۷۶۳) اس آیت میں ہمارے آقا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی امت کو تمام امتوں سے افضل فرمایا گیا اور بعض آیات میں بنی اسرائیل کو بھی عالمین یعنی تمام جہانوں سے افضل فرمایا گیا ہے، لیکن ان کا افضل ہونا ان کے زمانے کے وقت ہی تھا جبکہ حضور سیدُ المرسلین صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی امت کا افضل ہونا دائمی ہے۔

فرمایا یہ ایسی امت ہے اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ جس کو لوگوں کے فائدے کے لیے نکالا گیا ہے۔ ظاہر کیا گیا ہے۔ اور یہ تین طریقوں سے لوگوں کو نفع پہنچاتی ہے پہلی بات یہ ہے تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کہ تم نیک باتوں کا حکم دیتے ہو۔ یہ نہیں فرمایا کہ نیکی کا حکم دو۔ یہ گزشتہ دروس میں

گزر چکا ہے۔کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو نیکی کا حکم کرے نیکی کی دعوت دینا وہ عظیم منصب اور عہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاءِ کرام عَلَیۡهِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو عطا فرمایا اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡهِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو مبعوث فرما کر نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تو اس نے اپنے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡهِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی امت کو اس منصب سے سرفراز فرما دیا اور اس عظیم خوبی کی وجہ سے انہیں سب سے بہترین امت قرار دیا۔اس مقام پر انداز بیان یہ ہے کہ تمہاری صفت ہی یہ ہے کہ تم اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو۔اب رہی یہ بات کہ نیکی کیا ہے۔تو توحید سے لے کر ادنی درجے کی اچھی چیزیں سب نیکی میں آجاتی ہیں۔حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ کہنا سب سے افضل نیکی ہے۔ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ سے سوال کیا گیا۔ حضور کونسا عمل افضل ہے،فرمایا ایمان باللہ یعنی اللہ پر ایمان لانا،توحید کو ماننا۔اس کے بعد دوسرے اعمال نماز،روزہ،حج،زکوۃ وغیرہ ہیں۔گویا لوگون کو ایمان اور توحید کی دعوت دینا سب سے بڑی نیکی ہے۔اس کے بعد چھوٹی چھوٹی نیکیاں ہیں۔حتی کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی مومن اپنے ایمان کے تقاضے سے ایک روڑا یا پتھر بھی راستے سے ہٹا دیے تا کہ کسی راہ گزر کو ٹھوکر نہ لگے۔تو وہ بھی نیکی شمار ہوگی۔ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں آتا ہے لَا تَحۡقِرَنَّ مِنَ الۡمَعۡرُوۡفِ شَیۡئًا نیکی کی کسی چیز کو بھی حقیر نہ سمجھو۔چھوٹی چھوٹی نیکیاں مل کر قیامت کے دن پہاڑ بن جائیں گی۔اسی طرح کسی برائی کو بھی حقیر اور کمتر نہیں سمجھنا چاہیئے،کیونکہ یہ اکٹھی ہو کر بہت بڑا ذخیرہ بن جائیں گی۔غرض فرمایا کہ اے امت محمدیہ! تمہاری صفت یہ ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔فرمایا کہ تمہارے بہتر امت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ؕ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ جو دین اور شریعت ہمیں نبی آخر الزمان (علیہ السلام) کے توسط سے ملا اس کی تمام جزئیات پر ہمارا ایمان ہے۔اور اس کے تمام احکام کی بجا آوری ہم پر لازم ہے۔جو شخص اللہ پر ایمان لانے کا دعویدار ہے مگر قرآن وسنت کے احکام کو نہیں مانتا،وہ کیسا مومن ہے یہی بات اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو بھی

فرمائی ہے وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ اگر اہل کتاب بھی اللہ پر ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ اللہ پر ایمان لانے کا یہی مطلب ہے کہ وہ نبی آخر الزمان ﷺ اور قرآن حکیم اور پوری شریعت اور پوری ملت اسلامیہ پر ایمان لاتے۔ مگر یہ لوگ تو دانستہ کفر میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب بگاڑ لی، عقیدہ خراب کرلیا اور طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا ہیں۔ اہل ایمان سے ان کو ضد ہے۔ انہوں نے تعصب کی بناء پر کفر کا راستہ اختیار کیا۔ ان کی بہتری اسی میں تھی کہ اللہ پر ایمان لے آتے۔ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ ان میں سے بعض لوگ ایماندار بھی ہیں۔ حضور ﷺ کے زمانے میں مدینے کے دس بڑے یہودی علماء میں سے صرف حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے بعض ساتھی ان کی دولت سے مشرف ہوئے مگر وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۱۱۰ ان کی اکثریت کافروں پر مشتمل رہی۔ یہود و نصاری کی اکثریت آج بھی فسق پر ہے۔ نزول قرآن کو ساڑھے چودہ سو سال سے کا عرصہ گزر چکا۔ مگر یہ لوگ ابھی تک کفر پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ عیسائی مسیح (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ بناوٹی انجیل پر ان کا ایمان ہے۔ یہودی ان سے بھی زیادہ خباثت میں مبتلا ہیں۔ ان میں مکاری اور بے ایمانی پائی جاتی ہے۔ انہیں آج تک کچھ سمجھ نہیں آئی کہ حضور خاتم النبیین ﷺ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ لوگ قرآن پاک اور نبی آخر الزمان ﷺ کی مخالفت میں ہ وقت سرگرداں رہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اسلام کے قریب نہ آئیں۔ ان کی اکثریت فساق کی ہے۔ ایسے زمانے میں خال خال ہی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو تعصب سے پاک ہوں۔ یہ لوگ تھوڑی سی توجہ کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں ایمان کی دولت عطا فرما دیں۔

الغرض! اس آیت میں اُمت محمدیہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ یہ اُمت پوری انسانیت کی طرف داعی و مصلح بنا کر بھیجی گئی ہے اور عالمگیر دعوت و تبلیغ کے منصب پر فائز کی گئی ہے، جس کا کام لوگوں کو حق کی طرف بلانا اور باطل سے روکنا ہے، بعض اہل علم کے نزدیک دعوت و تبلیغ اُمت پر فرض عین ہے، یعنی ہر مسلمان پر اپنی صلاحیت کے لحاظ سے دعوت دینا فرض ہے اور بعض اہل علم کے نزدیک یہ فرض کفایہ ہے، یعنی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہئے جو دعوت حق کا

کام کرتی رہے اور انسانیت کو اسلام کی طرف بلاتی رہے، اگر کچھ لوگ اس فریضہ کو ادا کرتے رہیں تو اجر تو ان ہی کو ہوگا؛ لیکن پوری اُمت گناہ سے بچ جائے گی اور اگر کوئی نہ کرے تو پوری اُمت گنہگار ہوگی معروف میں تمام نیکیاں داخل ہیں، غیر مسلموں کو دعوت اسلام، مسلمانوں کی اصلاح، منکر میں تمام برائیاں شامل ہیں، کفر، فسق، حرام اور مکروہات کا ارتکاب وغیرہ، نیز نیکی کی طرف بلانے اور برائی سے روکنے کا کوئی ایک طریقہ متعین نہیں، زبان سے، قلم سے، طاقت وقوت کے استعمال سے اور اثر و رسوخ سے، انفرادی طور پر یا جماعتی صورت میں، یہ تمام ہی صورتیں معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کی ہوسکتی ہیں۔

حاصل کلام

قبل اس کے کہ رب کائنات کے روبرو پیشی اور جواب دہی کا وقت کسی لمحہ اچانک سامنے آجائے اپنی کتاب زندگی اور کارنامہ حیات پر قرآن وسنت کی روشنی میں نظر ڈال کر دیکھ لینا چاہئے کے جس غرض کیلئے اللہ تعالٰی نے قرآن مجید کو نازل اور اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو کام ہم مسلمانوں کو اُمت وسط اور خیر اُمت بنا کر ہمارے سپرد کیا تھا اس کو انجام دینے کی ہم نے کیا اور کہاں تک فکر کی ہے قرآن وسنت سے یہ بات بہر حال روز روشن کی طرح واضح ہے کے اللہ تعالٰی اپنے بندوں سے صرف زبانی اقرار یا انفرادی تقوٰی و دینداری ہی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اپنی قوم کے علاوہ بھی جہاں تک پہنچانا ممکن ہو تمام لوگوں کی اصلاح وہدایت اب ہم پیروان خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہے اور اگر ہم نے یہ کام نہ کیا یا اس میں کوتاہی برتی تو اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں غفلت برتنے کے ہم خود ذمہ دار ہونگے اس کام میں غفلت کے بارے میں ہمیں اللہ تعالٰی کے روبرو اسی طرح جواب دہی کرنی ہوگی جس طرح کے نماز، روزے، اور دوسرے فرائض میں کوتاہی کے لئے کرنی ہے اس کے علاوہ یہ بھی اس دنیا کی مسلمہ حقیقت ہے کے جو قوم اپنے نصب العین اور مقصد زندگی کو پس پشت ڈال دیتی ہے وہ بہت جلد صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔

اہل ایمان کو تسلی

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ	وہ تمہیں ہرگز ضرر نہیں پہنچا سکیں گے	اِلَّاۤ	مگر

اَذًى	(تھوڑی سی) ایذا	وَاِنْ	اور اگر	يُّقَاتِلُوْكُمْ	وہ تم سے لڑیں گے

يُوَلُّوْكُمُ	(تو) پھیر دیں گے تمہاری طرف	الْاَدْبَارَ	پیٹھیں

ثُمَّ	پھر	لَا يُنْصَرُوْنَ	نہیں وہ مدد کئے جائیں گے۔(111)

اہل ایمان کی خصلت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تسلی دی لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ اہل کتاب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے مگر زبانی چھیڑ چھاڑ جاری رکھیں گے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف بڑی سازشیں کی مگر اللہ نے ہر سازش کو ناکام بنایا۔اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لیے بھی فرمادیا" وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تم ایمان پر قائم رہے، تو غالب تم ہی رہو گے۔اہل کتاب تم پر غلبہ نہیں کر سکتے۔ہاں اگر تم ایمان کو چھوڑ بیٹھو تو پھر اللہ تعالیٰ کا کوئی وعدہ نہیں ہے"۔ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ۔تمہاری بداعمالیوں کی وجہ سے اگر خدا تمہیں رسوا کردے تو پھر تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔فرمایا وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اگر اہل کتاب تم سے لڑائی کریں۔ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ تو تمہاری طرف پیٹھ پھیر دیں گے، تم سے لڑنے کی ہمت نہیں پائیں گے۔سورہ حشر میں بھی آتا ہے تم ان کی طرف سے پریشان نہ ہو، یہ تمہارے ساتھ کھلم کھلا جنگ نہیں لڑ سکتے۔اور اگر ایسا کوئی وقت آ بھی جائے تو یہ لوگ ذلیل وخوار ہو کر رہ جائینگے۔گالی دینا، برا بھلا کہنا، تمہارے خلاف سازشیں اور غلط پروپیگنڈا اور ستانے کے دوسرے کام ہی کر سکتے ہیں، اور ایسے کام عموماً ذہنی طور پر ہزیمت خوردہ فریق ہی کرتا ہے۔رہا جوان مردوں کی طرح مقابلے میں آنا تو اس بات کی ان میں سکت ہی نہیں اور اگر کریں گے تو بری طرح پٹ کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔اور اس وقت منافق بھی ان کی کچھ مدد نہ کر سکیں گے، جو ان سے ساز باز کرتے اور مدد کو پہنچنے کے وعدے کرتے رہتے ہیں۔اہل کتاب کے حق میں یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی ثُمَّ لَا

يُنْصَرُوْنَ﴿۱۱۱﴾ پھر ان کی ہرگز مدد نہیں کی جائے گی۔ یہ ناکام اور نامراد ہوں گے۔ چناچہ ایسا ہی ہوا۔ یہود کو مسلمانوں کے مقابلے میں ہر جگہ شکست ہوئی اور رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا، بالآخر نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ علیہم الرضوان نے انھیں جزیرۂ عرب سے جلاوطن کر دیا۔ یہ آیت اخبار بالغیب اور پیشین گوئی پر مشتمل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس میں فتح و کامیابی اور نصرت کی بشارت دی ہے۔اب اگر چہ یہود نصرانیوں کے بل بوتے پر فلسطین کے کچھ حصے اور بیت المقدس پر قابض ہیں، مگر وہ وقت قریب آرہا ہے کہ جب مسلمانوں کے ساتھ یہود کی جنگ میں پتھر اور درخت بھی مسلمان کو بلا کر کہیں گے: ”اے مسلم! یہ میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے، اسے قتل کر دے۔“

بنی اسرائیل پر ذلت، مسکنت اور غضب اِلٰہی کا عذاب

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ اَیۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ
وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الۡمَسۡکَنَۃُ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانُوۡا
یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ یَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّ کَانُوۡا
یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ لَیۡسُوۡا سَوَآءً ؕ مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ اُمَّۃٌ قَآئِمَۃٌ یَّتۡلُوۡنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ
الَّیۡلِ وَ ہُمۡ یَسۡجُدُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ
وَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾ وَ مَا
یَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلَنۡ یُّکۡفَرُوۡہُ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾

یہود پر ذلت مسلط ہونے کا مطلب

ضُرِبَتۡ	مسلط کردی گئی	عَلَیۡہِمُ	ان پر	الذِّلَّۃُ	ذلت
اَیۡنَ مَا	جہاں کہیں بھی	ثُقِفُوۡۤا	وہ پائے جائیں		
اِلَّا	مگر	بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ	اللہ کی پناہ کے ساتھ		
وَ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ	اور لوگوں کی پناہ کے (ساتھ)	وَ بَآءُوۡ	اور وہ لوٹے		
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ	اللہ کے غضب کے ساتھ	وَ ضُرِبَتۡ	اور مسلط کردی گئی		

عَلَيۡهِمُ	ان پر	الۡمَسۡكَنَةُ	محتاجی
ذٰلِكَ	یہ	بِاَنَّهُمۡ	اس سبب سے کہ بیشک وہ
كَانُوۡا	تھے	يَكۡفُرُوۡنَ	انکار کرتے
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	اللہ کی آیتوں کے ساتھ	وَيَقۡتُلُوۡنَ	اور قتل کرتے (تھے)
الۡاَنۡۢبِيَآءَ	نبیوں کو	بِغَيۡرِ حَقٍّ	ناحق
ذٰلِكَ بِمَا	یہ بسب اس کے کہ	عَصَوۡا	انہوں نے نافرمانی کی
وَّكَانُوۡا	اور تھے	يَعۡتَدُوۡنَ	(مسلسل) زیادتی کرتے۔(112)

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب خصوصا یہودیوں کے متعلق فرمایاضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡٓا ان پر ذلت مسلط کر دی گئی، جہاں بھی وہ پائے جائیں۔جب انہوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف کی ہے اور برائیوں میں ملوث ہوئے ہیں، اس وقت سے ذلیل خوار ہو رہے ہیں۔قرآن میں یہودیوں کی ذلت کا ذکر بہت سے دوسرے مقامات پر بھی موجود ہے، ان کی رسوائی کے متعلق پہلی بات تو یہ ہے کہ یہودی سیاسی عروج اور اقتدار سے محروم کر دیے گئے ہیں۔گذشتہ اڑھائی ہزار سالہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں ان کو اقتدار حاصل نہیں ہوا۔اس سے پہلے ان کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں، مگر اب اس سے محروم ہیں۔اور محکومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں این مَا ثُقِفُوۡٓا کا یہی مطلب ہے کہ یہ لوگ جہاں کہیں بھی ہیں ذلیل وخوار ہو کر ہی گزر اوقات کر رہے ہیں۔یہودیوں کی ذلت کی دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ عزت نفس سے محروم رہے ہیں۔کروڑ پتی ہونے کے باوجود بھکاریوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔مال سے محبت، ہر کام میں سازش اور ہر قوم سے مکاری اور چالاکی ان کی خصوصیت رہی ہے۔ان کو کہیں بھی آرام سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ایک جگہ شرارت کی تو دوسری جگہ چلے گئے وہاں سازش کی تو وہاں سے نکالے گئے۔گذشتہ تاریخ سے واضح ہے کہ دنیا کی کوئی قوم انہیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی۔کچھ عرصہ پہلے نصاریٰ سے بھی ان کی ایسی ہی ان بن تھی۔جیسے مسلمانوں کے ساتھ ہے۔یہودی کبھی عیسائیوں کے ماتحت رہے، کبھی مسلمانوں کے

اور کبھی دیگر اقوام کے دست نگر رہے۔

حبل اللہ اور حبل الناس سے کیا مراد ہے؟

اور ساتھ ہی ساتھ اس آیت میں استثناء بھی ہے ''اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ''سوائے اس کے کہ انہیں اللہ کی طرف سے سہارا مل جائے یا لوگوں کی طرف سے سہارا مل جائے۔ اِستِثناء کے آنے سے معنی یہ بن گیا کہ (یہودی) ذلت وخواری سے کسی صورت اور کسی طرح نہیں بچ سکتے مگر اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی رسی کے ساتھ اور لوگوں کی رسی کے ساتھ۔ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی رسی کے ساتھ یوں کہ یہودی مسلمان ہو جائیں تو خواری سے بچ سکتے ہیں اور حقیقی عزت حاصل کر سکتے ہیں اور لوگوں کی رسی کی صورت یہ کہ لوگوں سے عہد و پیمان کریں، اسلامی حکومت کے ذمی بن جائیں یا کافر حکومتوں سے بھیک مانگیں اور تعاون حاصل کریں تو دنیاوی عزت پا سکتے ہیں اور ایسی صورت میں ان کی سلطنت بھی بن سکتی ہے۔ فی زمانہ اگر دنیا کے کسی خطے میں کفار کے تعاون سے یہودی سلطنت وجود میں آئی ہے تو اس حکومت کا قائم ہونا قرآنِ کریم یا اسلام کی صداقت کے خلاف نہیں بلکہ قرآنِ کریم کی صداقت کی بڑی صاف اور واضح دلیل ہے کہ بحسب اِستثناء ''وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ' صدیوں سے ذلیل وخوار یہودیوں کی ایک جماعت کو دنیاوی عزت مل گئی۔ 1947ء میں تین عیسائی حکومتوں، برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی مدد سے انہوں نے مختصر سے خطہ پر اپنی ایک الگ حکومت قائم کر لی ہے جسے کئی ممالک نے تا حال تسلیم ہی نہیں کیا اور عیسائی حکومتوں نے مسلمانوں سے انتقام کے طور پر مسلمان ممالک کے درمیان یہ حکومت قائم کر کے مسلمانوں کے جگر میں خنجر گھونپا ہے۔ آج بھی اسرائیل کو امریکہ کی مکمل حمایت حاصل ہے اور اسی کے دم قدم سے یہ اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہے۔ اگر امریکہ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ جائے، تو فوراً اس کا وجود ہی ختم ہو جائے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ جس طرح یہود مغضوب علیہ قوم ہے اسی طرح آج کا مسلمان بھی اللہ کی نافرمانیوں کی بنا پر مغضوب علیہ قوم بن چکا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں پر اللہ کی طرف سے اسرائیل کی صورت میں عذاب نازل ہوا اور جب تک مسلمان باہمی اتفاق واتحاد کا ثبوت نہ دیں گے اور

آپس میں الجھتے اور لڑتے مرتے رہیں گے ان پر یہ عذاب مسلط ہی رہے گا۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ یہ لوگ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں اور محتاجی ان پر مسلط کر دی گئی ہے۔ یہودیوں کی ذلت ونکبت اور پستی کی جو پیشین گوئی قرآن مجید نے کی ہے، وہ ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے، جس پر کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں، گذشتہ ادوار میں رومن حکومت نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ تو اپنی جگہ، ماضی قریب میں بھی جرمنی اور چیکوسلواکیہ وغیرہ میں ان کے ساتھ جیسے جیسے انسانیت سوز سلوک روا رکھے گئے اور جگہ جگہ ان کا قتل عام ہوا، وہ گویا کل کی بات ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کر دیتے تھے۔ یعنی نافرمانی اور حد سے گزرنے کا اثر یہ ہوا کہ وہ کفر کرنے لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے، پھر کفر اور قتل انبیاء کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا غضب اترا، ذلیل ومحتاج ہو گئے، حکومت اور ریاست چھن گئی۔ حاصل یہ کہ ذلت وغضب اور مسکنت کی وجہ کفر اور قتل انبیاء علیہم السلام ہے اور کفر اور قتل انبیاء کی وجہ ان کی نافرمانی اور زیادتی ہے۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نافرمان تھے اور اللہ کی حدود سے آگے نکل جاتے تھے كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ عربی قاعدہ کے لحاظ سے ماضی استمراری کا صیغہ ہے، جس میں دوام واستمرار کا معنی پایا جاتا ہے، اسی مناسبت سے اس کا ترجمہ 'مسلسل زیادتی' سے کیا گیا ہے۔

سعید روحیں

لَيْسُوْا	نہیں ہیں وہ (سب)	سَوَآءً ؕ	برابر
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	اہل کتاب (میں) سے	اُمَّةٌ	ایک جماعت ہے
قَآئِمَةٌ	(حق پر) قائم	يَّتْلُوْنَ	وہ پڑھتے ہیں
اٰيٰتِ اللّٰهِ	اللہ کی آیات	اٰنَآءَ الَّيْلِ	رات کے وقت
وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ		اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔ (113)	

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ ان میں سے کچھ فیصدی اچھے بھی ہیں۔ان میں نیک بخت اور سعید روحیں بھی ہیں مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ اہل کتاب میں سے ایک گروہ سیدھے راستے پر بھی قائم ہے۔ان اچھے لوگوں کا کام یہ ہے یَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وہ اللہ کی آیتوں کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے ہیں ایسے لوگ ایمان قبول کرتے ہیں۔اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کرتے ہیں۔ چنانچہ نزول قرآن کے زمانے میں نجران کے چالیس 40 عربی النسل عیسائیوں نے فوراً اسلام قبول کرلیا۔حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفرؓ رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔وہاں کے اکتیس 31 مزید باشندے بھی ایمان لائے۔اسی طرح روم میں آٹھ آدمی فوراً مسلمان ہوگئے۔مدینہ کے حقیقت پسند لوگوں نے بھی اسلام کو لبیک کہا،عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زیارت کرنے پر ہی اسلام سے مشرف ہوگیا۔مدینے کی اکثریت مشرکوں کی تھی مگر بعض شرک کو برا سمجھتے تھے۔ مدینے کے اطراف میں یہودی آباد تھے۔ان میں کچھ سعید روحیں ضرور موجود تھیں۔ان میں حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کا نام آتا ہے۔محمد ابن مسلمہ رضی اللہ عنہ وغیرہ جنابت کا غسل کرتے تھے اور توحید کا تصور بھی رکھتے تھے۔جب نبی آخر الزمان (علیہ السلام) کے متعلق سنا تو فوراً ایمان لے آئے۔ بعد کے دور میں بھی بعض یورپین عیسائیوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ان میں برطانیہ کا مسٹر کویلم ہے جس کا نام عبداللہ کویلم رکھا گیا۔موجودہ زمانے میں محمد اسد ہے۔ یہ جرمنی کا یہودی تھا،مگر اللہ نے سمجھ عطا کی۔اب وہ فرانس میں ہے اور دین خدمت بھی کر رہا ہے۔راسخ العقیدہ مسلمان ہے۔ پاکستان میں بھی رہ چکا ہے۔اس نے کئی ایک کتابیں لکھی ہیں۔موجودہ دور کا محمد پکھتال ترکی میں ملازم تھا،اس نے اسلام قبول کیا،اس نے قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔غرضیکہ سارے کے سارے اہل کتاب بدبخت نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ سمجھدار لوگ بھی ہیں۔فرمایا اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کے علاوہ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ یہ لوگ اللہ کے سامنے سجدہ ریز بھی ہوتے ہیں "يَسْجُدُوْنَ" کے اصل معنی تو 'سجدہ کرتے ہیں' کے ہیں؛ لیکن بعض

مفسرین نے اس سے نماز پڑھنا بھی مراد لیا ہے۔(الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۱۷۶/۴)

صالحین کے اوصاف

يُؤْمِنُوْنَ	وہ ایمان لاتے ہیں	بِاللّٰهِ	اللہ کے ساتھ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	اور یومِ آخرت (کے ساتھ)	وَيَاْمُرُوْنَ	اور وہ حکم کرتے ہیں
بِالْمَعْرُوْفِ	اچھے کاموں کا	وَيَنْهَوْنَ	اور منع کرتے ہیں
عَنِ الْمُنْكَرِ	برے کاموں سے	وَيُسَارِعُوْنَ	اور وہ جلدی کرتے ہیں
فِي الْخَيْرٰتِ	بھلائیوں میں	وَاُولٰٓئِكَ	اور یہ لوگ
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ	صالحین میں سے ہیں (114)		

فرمایا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یہ لوگ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔جس حضور ﷺ کی سچائی کا علم ہوتا ہے۔فوراً ایمان قبول کرتے ہیں۔وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ پھر نہ صرف خود ایمان لاتے ہیں۔بلکہ دوسروں کو بھی نیکی کا حکم کرتے ہیں وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور برائی سے روکتے ہیں یعنی تبلیغ دین کا کام بھی کرتے ہیں۔اور پھر ان کی حالت یہ ہوجاتی ہے وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وہ نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے لگتے ہیں وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ یہی لوگ صالح ہیں۔معلوم ہوا کہ صالحین کے اوصاف یہ ہیں کہ رات کو عبادت میں قیام کرنا،نماز پڑھنا، رات کا ایک حصہ عبادت میں گزارنا،رات کے وقت قرآن کی تلاوت کرنا،اللہ تعالیٰ اور آخرت پر کامل ایمان رکھنا،نیکی کا حکم دینا،برائی سے منع کرنا،نیکیوں میں سبقت لیجانا،نیکی کو اختیار کرنا۔ایک کامل ایمان والے کے بھی یہی اوصاف ہونے چاہئیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں کاملین میں داخل فرمائے۔

تین شخصوں کیلئے دوگنا ثواب

وَمَا	اور جو (کچھ)	يَفْعَلُوْا	وہ کریں گے

مِنْ خَيْرٍ	بھلائی سے	فَلَنْ	تو ہرگز نہیں
يُّكْفَرُوْهُ	محروم کئے جائیں گے اُس (ثواب) سے	وَاللّٰهُ	اور اللہ
عَلِيْمٌ	خوب جاننے والا ہے	بِالْمُتَّقِيْنَ	پرہیزگاروں کو۔

فرمایا وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ط جو بھی نیکی کا کام کریں گے، ان کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکی کو قبول کر کے بہتر اجر عطا فرمائیں گے۔ بلکہ حدیث شریف کے مطابق ایسے لوگوں کو دوہرا اجر ملے گا۔ پہلے وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) یا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لاتے تھے، ایک اجر اس ایمان کا ہوگا اور دوسرا اجر حضور خاتم النبیین ﷺ پر ایمان لانے کا ہوگا۔ اس طرح وہ دوہرے اجر کے مستحق ہوں گے۔ فرمایا وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اللہ تعالیٰ متقیوں یعنی اس سے ڈرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ اس کے علم میں ہے۔ کہ کون لوگ ایسے ہیں، جو کفر و شرک کی برائیوں سے بچ کر نکل جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ متقیوں یعنی اس سے ڈرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ اس کے علم میں ہے۔ کہ کون لوگ ایسے ہیں، جو کفر و شرک کی برائیوں سے بچ کر نکل جاتے ہیں۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تین شخص ایسے ہیں جن کے لیے دوگنا ثواب ہے 1 وہ شخص جو اہل کتاب میں سے ہو، اپنے نبی پر ایمان لایا ہو اور (پھر) محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے۔ 2 مملوک غلام، جب کہ وہ اللہ کے حق کو اور اپنے مالکوں کے حق کو ادا کرتا رہے۔ 3 وہ شخص جس کے پاس اس کی لونڈی ہو، اس نے اسے ادب سکھایا اور عمدہ تربیت کی اور اسے اچھی اور عمدہ تعلیم دی، پھر اسے آزاد کر دیا اور اس سے نکاح کر لیا۔ پس اس کے لیے دوگنا ثواب ہے۔“ (بخاری)

مال و دولت اُمت کیلئے فتنہ اور آزمائش ہے

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡـًٔا ؕ
وَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا یُنۡفِقُوۡنَ فِیۡ ہٰذِہِ الۡحَیٰوۃِ
الدُّنۡیَا کَمَثَلِ رِیۡحٍ فِیۡہَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ فَاَہۡلَکَتۡہُ ؕ
وَمَا ظَلَمَہُمُ اللّٰہُ وَلٰکِنۡ اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾

فتنہ کی اقسام

اِنَّ	بلاشبہ	الَّذِیۡنَ	وہ لوگ جنہوں نے
کَفَرُوۡا	کفر کیا	لَنۡ تُغۡنِیَ	ہرگز نہیں کفایت کریں گے
عَنۡہُمۡ	ان سے	اَمۡوَالُہُمۡ	ان کے مال
وَلَاۤ	اور نہ	اَوۡلَادُہُمۡ	ان کی اولاد
مِّنَ اللّٰہِ	اللہ (کے عذاب) سے	شَیۡـًٔا	کچھ بھی
وَاُولٰٓئِکَ	اور یہ لوگ	اَصۡحٰبُ النَّارِ	دوزخی ہیں
ہُمۡ فِیۡہَا	وہ اس میں	خٰلِدُوۡنَ	ہمیشہ رہیں گے۔(116)

یہ آیت بنی قُریظہ اور بنی نَضیر کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہودی سرداروں نے مال و دولت

کی خاطر سرکارِ دوعالم صَلَّی اللہُ تَعالٰی عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے ساتھ دشمنی کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ ان کے مال و اولاد ان کے کچھ کام نہ آئیں گے، یہ نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعالٰی عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی دشمنی میں ناحق اپنی عاقبت برباد کررہے ہیں۔ (خازن)) ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ایسے لوگ خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، سب کا ایک ہی معاملہ ہے۔ فرمایا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْــٴًـاؕ ایسے لوگوں کے مال اور اولاد اللہ کے ہاں کچھ کام نہ آئیں گے۔ یہ چیزیں انہیں اللہ کے غضب سے نہ بچاسکیں گی۔ ان سب کو بتایا گیا کہ مال و اولاد میں سے کوئی بھی کام آنے والا اور عذابِ الٰہی سے بچانے والا نہیں۔ صرف رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ تَعالٰی عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے دامن سے وابستہ ہونا ہی نجات کا ذریعہ ہے۔ دنیا میں انسان بعض اوقات مال کے زور پر بچ جاتے ہیں اور بسا اوقات اولاد بھی بچاؤ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مگر اللہ کی بارگاہ میں یہ دونوں چیزیں کام نہ آئیں گی۔ عام طور پر یہ مشاہدہ میں آیا ہے کہ اکثر لوگ انہی دو چیزوں یعنی مال اور اولاد کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں دوسرے مقام پر موجود ہے اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ بیشک تمہارے مال اور اولاد فتنہ ہیں۔ فتنہ سے مراد آزمائش ہے۔ یعنی تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہی ہیں کہ کبھی آدمی اُن کی وجہ سے گناہ اور مَعْصِیَت میں مبتلا ہوجاتا ہے اور ان میں مشغول ہو کر اُمورِ آخرت کو سرانجام دینے سے غافل ہوجاتا ہے حالانکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پاس بڑا ثواب ہے جو کہ تمہارے اَموال اور اولاد سے حاصل ہونے والی مَنفَعت سے کہیں زیادہ عظیم ہے، تو تم لحاظ رکھو تاکہ ایسا نہ ہو کہ اَموال اور اولاد میں مشغول ہو کر ثوابِ عظیم کھو بیٹھو۔ (مدارک) حضرت کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) ہر امت کے لئے (کوئی نہ کوئی) فتنہ اور آزمائش ہے (جس میں اس امت کے لوگوں کو مبتلا کر کے ان کو آزمایا جاتا ہے)۔ چنانچہ میری امت کے لئے جو چیز فتنہ اور آزمائش ہے وہ مال و دولت ہے۔

فتنہ کی تعریف اور اس کی اقسام

حدیث مبارکہ کی وضاحت سے قبل لفظ "فتنہ" کی تعریف اور اس کی اقسام کو سمجھ لیں۔ فتن جمع فتنہ کی ہے، ابتلاء/ امتحان، انسان کا اچھی حالت سے بری حالت میں آنا کسی کی طرف میلانا اور خود پسندی، یہ سب معنی آتے ہیں۔ اصطلاحِ شرع میں "ہر ایسی چیز جو انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ سے غافل کر دے فتنہ کہلاتی ہے۔" مثال کے طور پر مال اور اولاد کو بھی خداوند تعالیٰ نے اپنی کتاب میں "فتنہ" کہا ہے کیونکہ مال اور اولاد انسان کو یادِ الٰہی سے غافل کر دینے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

ذاتی فتنہ: قلب کا سخت ہونا کہ طاعت ومناجات میں حلاوت ولذت محسوس نہ ہو۔

فتنۂ اہل: اولاد کی نافرمانی، زوجین میں نفرت اور گھریلو نظام کا بگڑ جانا۔

فتنۂ انسانیت: انسانیت ختم ہو جانا، خود غرضی، ایذا رسانی کے درپے ہونے لگنا۔

وبائی فتنہ: قحط، طوفان، خسف ومسخ۔

فتنۂ کذب: جھوٹ اور دھوکا دہی عام ہو جائے، دلوں سے احساسِ امانت نکل جائے۔

فتنۂ تاویلات: متشابہات (قرآنی آیات) میں کج روی کے ساتھ غلط تاویلات کرنا۔

فتنۂ سبّ وشتم: سلف صالحین کو گالی دینا۔

فتنۂ استحلال: حرام اشیاء کو ان کا نام بدل کر جائز سمجھ کر استعمال کرنا۔

اس حدیث مبارکہ کے پیش نظر عہد نبوی ﷺ سے لے کر موجودہ زمانے تک کی تاریخ پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ بات مخفی نہیں رہے گی کہ یہی مال و دولت سب کے لئے آزمائش بنا رہا ہے جس کے ذریعے بے شمار بندوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی بغاوت ونافرمانی کی اور مسلسل کر رہے ہیں۔ مال و دولت کے حصول کے لئے حلال اور حرام، جائز وناجائز ذرائع استعمال کرنے کو تیار ہیں، بس مال آنا چاہئے! ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: "تمہیں کثرتِ مال کی ہوس اور فخر نے (آخرت سے) غافل کر دیا۔" (التکاثر: ۱)

انسان ان چیزوں کی محبت میں مبتلا ہو کر ایمان اور آخرت کو فراموش کر جاتے ہیں، حلال وحرام

کی حدود کو توڑتے ہیں، اور اسی طرح مال اور اولاد ان کے لیے ذریعہ آزمائش بن جاتے ہیں۔ پھر جب اس آزمائش پر پورا نہیں اترتے تو ان پر وبال آجاتا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے، کہ مال انسان کا اچھا ساتھی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس میں سے اللہ اور اس کے بندوں کا حق ادا کرے۔ اور اگر حق ادا نہیں کرتا۔ تو یہی مال اس کے لیے وبال جان ہے۔ مال کی جتنی بہتات ہوگی، آزمائش بھی اتنی ہی بڑی ہوگی۔ فتنے بھی اتنے ہی زیادہ برپا ہوں گے۔ مال کی وجہ سے ہی اسلام کے نام لیوا برائی اور عیاشی میں مبتلا ہیں۔ فضول امور میں خرچ میں دوسری اقوام سے آگے ہیں۔ دولت تو ہے مگر صحیح جگہ پر خرچ نہیں ہوتی غلط جگہ پر خرچ ہو کر فتنہ بن جاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مال و جاہ کی محبت دل میں اس طرح نفاق اگاتی ہے جس طرح پانی سبزے کو اُگاتا ہے۔ ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: زیادہ امیدیں لگانے والے ہلاک ہوگئے۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں سب سے زیادہ برا کون ہے؟ فرمایا: مالدار۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کہتا ہے کہ میرا مال، جبکہ تیرا مال تو صرف وہی ہے جو تو نے کھا کر ختم کر دیا، پہن کر بوسیدہ کر دیا یا صدقہ دے کر باقی رکھ لیا۔ ایک تفصیلی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد ایسی قوم آئے گی جو دنیا کی عمدہ تر اور رنگا رنگ نعمتیں کھائے گی، ناز سے چلنے والے رنگا رنگ گھوڑوں پر سواری کرے گی، خوبصورت اور رنگا رنگ عورتوں سے نکاح کرے گی اور خوبصورت اور رنگا رنگ کپڑے پہنے گی، ان کے پیٹ تھوڑی چیز سے سیر نہیں ہوں گے، اللہ کو چھوڑ کر مال و دولت کو اپنا خدا بنائیں گے۔

انسان کے مقدر میں جتنا مال لکھ دیا گیا ہے اتنا ہی اس کو ملے گا۔ شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اے انسان اس بات کو جان لے کہ جو چیز تیری قسمت میں لکھی جا چکی ہے وہ ہر حال میں تجھے ملے گی خواہ تو طلب وسوال کی راہ اختیار کر یا اس کو ترک کر دے۔ اور جو چیز تیری قسمت میں نہیں لکھی وہ تجھ کو کسی حالت میں نہیں ملے گی، خواہ تو اس کی طلب کی کتنی ہی حرص رکھے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے کتنی ہی سعی وکوشش اور محنت ومشقت برداشت کرے، لہٰذا تجھے جو

کچھ مل جائے اس پر شاکر وصابر رہ، ہر جائز وحلال چیز کو حاصل کرنا ضروری سمجھ اور اپنی قسمت پر راضی ومطمئن رہ تاکہ رب ذوالجلال تجھ سے راضی وخوش ہو۔ یہ بات یاد رکھی جائے کہ مال و دولت کے سلسلے میں جو چیز مذموم ہے وہ مال و دولت کی محبت اور دنیاداری میں مبتلا ہونا اور اپنی چادر سے باہر پیر پھیلانا ہے۔ یہ خصلت انسان کو 'مال کا بندہ' بنا دیتی ہے کہ اس کی ہر سعی اور جدو جہد کا محور، اس کی ہر تمنا وخواہش کا مرکز اور اس کے ہر فعل اور عمل کی بنیاد صرف مال اور زر ہوتا ہے۔ ہمیں مال کا نہیں 'اللہ کا بندہ' ہونا چاہئے۔ مال داری بذات خود کوئی مذموم چیز نہیں ہے، کسی شخص کے پاس (حلال ذرائع سے کمایا ہوا) کتنا ہی مال کیوں نہ ہو اور وہ کتنا ہی بڑا دولت مند کیوں نہ ہو، اگر اس کا دل مال و دولت کی محبت میں گرفتار نہیں ہے تو اس کو بُرا کہنا درست نہیں۔

غرضیکہ اللہ نے فرمایا انسان کے حق میں مال اور اولاد دو بڑی آزمائشیں ہیں۔ لوگ انہی کی وجہ سے ایمان اور نیکی سے محروم ہوتے ہیں۔ مگر یہ دونوں چیزیں اللہ کے ہاں کچھ کام نہ آئیں گی۔ فرمایا ان چیزوں سے حد سے زیادہ محبت کرنے والوں کا انجام یہ ہوگا وَاُولٰٓىِٕكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ اور اسی میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ کافر جہنم کی بھٹیاں اور اس میں جلنے والی لکڑیاں ہیں، ان ظالموں کو اس دن کوئی عذر معذرت ان کے کام نہ آئے گی، ان پر لعنت ہے، اور ان کیلئے برا گھر ہے، ان کے مال ان کی اولادیں بھی انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکیں گی، اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے۔

کفار کا مہلک انفاق

مَثَلُ	مثال	مَا	(اُس کی) جو	يُنۡفِقُوۡنَ	وہ خرچ کرتے ہیں
فِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا	اس دنیا کی زندگی میں	كَمَثَلِ رِيۡحٍ	مانند مثال سخت ہوا کی ہے		
فِيۡهَا	اس میں (ہو)	صِرٌّ	پالا (سخت سردی)		
اَصَابَتۡ	وہ پہنچی	حَرۡثَ قَوۡمٍ	ایک ایسی قوم کی کھیتی کو		
ظَلَمُوۡۤا	جنہوں نے ظلم کیا	اَنۡفُسَهُمۡ	اپنی جانوں پر		

فَاَهۡلَكَتۡهُ		پھر اس نے اُسے تہس نہس کر دیا	
وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ	اور نہیں ظلم کیا اُن پر اللہ نے	وَلٰكِنۡ	بلکہ
اَنۡفُسَهُمۡ	اپنی جانوں پر	يَظۡلِمُوۡنَ	وہ (خود ہی) ظلم کرتے تھے۔

ارشاد ہوتا ہے مَثَلُ مَا يُنۡفِقُوۡنَ فِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا مثال اس کی جو خرچ کرتے ہیں، اہل ایمان تو اس دنیا میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں، وہ اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں، اور اس کا بدلہ اللہ کے ہاں یقینا بہتر ملے گا۔ مگر کافروں کے ساتھ معاملہ کیسے ہوگا برے کاموں میں خرچ کرنے کے علاوہ وہ لوگ بعض اوقات اچھے کاموں پر بھی خرچ کرتے ہیں۔ غریبوں کی امداد کرتے ہیں، سکول اور ہسپتال قائم کرتے ہیں، یتیم خانے تعمیر کرتے ہیں، پل اور سرائیں بنواتے ہیں اور اپنے اپنے مذاہب کے مطابق نیکی کے دوسرے کاموں میں روپیہ صرف کرتے ہیں۔ تو ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے خرچ کیے ہوئے کی مثال ایسی ہے كَمَثَلِ رِيۡحٍ فِيۡهَا صِرٌّ جیسے ہوا ہو جس میں سخت سردی ہو۔ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یہ سردھوا ایسی قوم کی کھیتی پر آئی ہو، جس نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ کھیت پک کر تیار ہو رہا ہے، اناج سے بھرا پڑا ہے۔ خوب لہلہا رہا ہے۔ اتنے میں سخت ٹھنڈی ہوا آتی ہے فَاَهۡلَكَتۡهُ ؕ اس کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اچھی بھلی کھیتی دیکھتے ہی دیکھتے تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور اس کے مالک منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ فرمایا کفر کرنے والوں کے خرچ کی مثال ایسی ہی ہے۔ وہ اس دنیا میں رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کر کے خوش ہو رہے ہیں کہ ان کا خرچ کیا ہوا مال انہیں بہت فائدہ دے گا۔ مگر حقیقت میں اللہ کے ہاں اس خرچ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جس طرح کھیتی کا مالک آس لگائے بیٹھا تھا۔ مگر یخ ہوا نے اسے برباد کر کے رکھ دیا، اسی طرح مال خرچ کرنے والے کافر امید کریں گے کہ مال خرچ کرنے کے عوض ان کو اجر عظیم ملے گا، مگر ان کا یہ سارا کیا کرایا یکدم ضائع ہو جائے گا۔ اور ان کے لیے کچھ مفید نہ ہوگا۔ فرمایا وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ایسے لوگوں کو اجر سے محروم کر کے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی۔ بلکہ وَلٰكِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں عمل کی قبولیت کے لیے ایمان، صحیح عقیدہ اور اعمال صالحہ کی شرط لگائی ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا فَمَن يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ اجر اس کو ملے گا جو ایمان لانے کے بعد اعمال صالحہ انجام دیگا، جس کا ایمان ہی درست نہیں ہے جس کا عقیدہ ہی صحیح نہیں۔ جو توحید پر قائم نہیں، اس کے نیک اعمال بھی آخرت میں کچھ کام نہ آئیں گے۔ ایسے لوگوں نے بدعقیدگی اختیار کر کے اپنے اندر مہلک مادہ پیدا کرلیا ہے، جو ان کے صحیح اعمال کو بھی ضائع کر رہا ہے۔ البتہ ان کے دنیا میں اچھے کام ان کے لیے دنیا میں ہی عزت، شہرت، وجاہت اور وقار کا باعث بن سکتے ہیں۔ یہ چیزیں تو ان کو دنیا میں ہی حاصل ہوجاتی ہیں، لہٰذا آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ باقی نہیں رہتا۔ کافروں کے علاوہ منافقوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہی حال کفر کرنے والوں کا ہے، کہ ان کا عقیدہ فاسد ہے۔ اس لیے ان کے نیکی کے کام بھی آخرت میں بے سود ہوں گے۔ البتہ اس دنیا میں ان کا بدلہ انہیں عزت وشہرت کی صورت میں مل جائے گا۔ اس آیت میں کافر کے خرچ اور ریاکاری کے طور پر خرچ کرنے والے کی مثال بیان فرمائی گئی کہ ان کے خرچ کو ان کا کفر یا ریاکاری ایسے تباہ کر دیتی ہے جیسے برفانی ہوا کھیتی کو برباد کر دیتی ہے اور ان کے ساتھ یہ معاملہ کوئی ظلم و زیادتی نہیں بلکہ یہ ان کے کفر یا نفاق یا ریاکاری کا انجام ہے تو یہ خود اِن کا اپنی جانوں پر ظلم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک ایمان نہیں ہوگا۔ صدقات، خیرات اور دیگر رفاہی کاموں پر رقم خرچ کرنے والوں کی چاہے دنیا میں کتنی ہی شہرت ہوجائے، آخرت میں انہیں ان کا کوئی صلہ نہیں ملے گا، وہاں تو ان کے لئے جہنم کا دائمی عذاب ہے۔ کیونکہ اس کا خرچ کرنا یا دنیاوی نفع کے لئے ہوگا یا آخرت کے نفع کے لئے۔ اگر صرف دنیاوی نفع کے لئے ہو تو آخرت میں اس سے کیا فائدہ اور ریاکار کو تو آخرت اور رضائے الٰہی مقصود ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کا عمل تو دکھاوے اور نمائش کے لئے ہوتا ہے ایسے عمل کا آخرت میں کیا نفع ہوگا جبکہ کافر کے تمام اعمال برباد ہیں، وہ اگرچہ آخرت کی نیت سے بھی خرچ کرے تو نفع نہیں پاسکتا، اس لیے ان کے نفقات وصدقات کو اللہ تعالیٰ نے باطل اور مردود کر کے ان پر ظلم نہیں کیا یہ ان کی اپنی ہی بے راہ روی کا نتیجہ ہے کیونکہ انہوں نے ایمان وطاعت اور توحید خالص سے اعراض کیا۔ جو صدقات اور دیگر اعمال کے قبول ہونے کی شرط اولین ہے لبتہ اس دنیا میں ان کا بدلہ انہیں عزت وشہرت کی صورت میں مل جائے گا۔

کفار سے تعلقات کے بارے میں اسلام کی تعلیمات

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا
عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ
بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝١١٨ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ
الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝١١٩
اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ
تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝١٢٠ۧ

غیر مسلموں کے ساتھ ظاہری اور دلی تعلق کا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ	اے لوگو! جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو!
لَا تَتَّخِذُوْا	نہ بناؤ	بِطَانَةً	دوست (راز دار)
مِّنْ دُوْنِكُمْ	سوائے اپنے (لوگوں کے)	لَا يَاْلُوْنَكُمْ	نہیں وہ کمی کرتے تمہیں
خَبَالًا	برباد کرنے میں	وَدُّوْا	وہ چاہتے ہیں
مَا عَنِتُّمْ	تمہارا تکلیف میں پڑنا	قَدْ	تحقیق

بَدَتِ	ظاہر ہو چکا ہے	الۡبَغۡضَآءُ	بغض (دشمنی)		
مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ	ان کے منہ سے	وَمَا	اور جو		
تُخۡفِیۡ	چھپاتے ہیں	صُدُوۡرُهُمۡ	ان کے سینے		
اَکۡبَرُ	وہ بہت بڑا ہے	قَدۡ	تحقیق	بَیَّنَّا	ہم نے کھول کر بیان کر دیا
لَکُمُ	تمہارے لیے	الۡاٰیٰتِ	نشانیوں کو	اِنۡ	اگر
کُنۡتُمۡ	ہوتم	تَعۡقِلُوۡنَ	عقل رکھتے۔(118)		

ارشاد ہوتا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اے ایمان والو! لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ اپنوں کرسوا دوسروں کو اپنا مخلص دوست نہ بناؤ۔ یہاں پر بطانہ کا لفظ آیا ہے جو کہ خاص الخاص راز داں دوست کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بِطَانَةً: پوشیدہ چیز اور وہ کپڑا جو او پر والے کپڑے کے نیچے جسم کے ساتھ ملا ہوتا ہے، مراد دلی دوست، خاص راز دار۔ یہ باب "نَصَرَ" سے مصدر ہے، واحد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ "مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ" (اپنے مخلص مسلمانوں کے سوا) اس کا تعلق (یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِیۡعُوۡا فَرِیۡقًا مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ یَرُدُّوۡكُمۡ بَعۡدَ اِیۡمَانِكُمۡ كٰفِرِیۡنَ) [آل عمران:100] سے ہے اور اس میں کفار کی طرف میلان اور ان کی دوستی سے منع فرمایا گیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے:"مسلمانوں میں سے کچھ آدمی یہودیوں سے میل جول اور تعلقات رکھتے تھے۔ کیونکہ اسلام سے پہلے وہ آپس میں ہمسائے اور حلیف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کر کے انھیں اپنے اندرونی راز داں اور دلی دوست بنانے سے منع فرما دیا۔ کیونکہ اس میں (راز افشا ہونے اور) ان کی طرف سے فتنے کا شدید خطرہ تھا۔" فرمایا غیر مسلموں کی دوستی سے اس لیے منع کیا گیا ہے۔ کہ لَا یَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا ؕ وہ تمہارے درمیان فساد پیدا کرنے میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔ خبال عربی میں فساد کو کہا جاتا ہے۔ غیر مومنوں کی ہمیشہ یہ خواہش ہوگی۔ کہ مومنوں کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچائیں، انہیں تمہاری خیر خواہی ہرگز منظور نہیں۔ ان سے راز داری قائم کرنے کی صورت میں

مسلمانوں کو دنیااور دین دونوں جگہ نقصان ہوگا۔غیر مسلموں کی خصلت بیان فرماتے ہوئے فرمایا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ وہ تمہاری مشقت کو پسند کرتے ہیں۔ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مسلمان مصیبت میں گرفتار ہوں۔اور دیکھو قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ ان کی اسلام دشمنی کی بات بعض اوقات ان کی زبانوں پر بھی آجاتی ہے۔وہ لاکھ کوشش کریں کہ ان کی اسلام دوستی مخفی رہے مگر پھر بھی منہ سے کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل جاتی ہے جو ان کی اندرونی خباثت کا مظہر ہوتی ہے۔سنہ 1971 میں جب مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا تو اندا گاندھی کی زبان سے یہ بات نکل گئی تھی کہ ہم نے ہندوستان پر مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کا بدلہ لے لیا ہے۔اسی طرح انگریز،عیسائی،امریکی، ہنود اور یہود ہمیشہ مسلمانوں کے بدخواہ ہی رہیں گے اور اس دشمنی کا اظہار وقتاً فوقتاً ان کی زبانوں سے ہوتا رہے گا۔یہ لوگ قرآن پاک اور حضور نبی کریم ﷺ کی توہین کا کوئی موقع نہیں چھوڑتے۔یہ ایسی چیزیں ہیں۔جو اہلِ اسلام کے لیے نہایت تکلیف دہ ہیں۔بات وہی ہے کہ اسلام دشمن طاقتیں کبھی مسلمانوں کی خیر خواہ نہیں ہوسکتیں۔ان کی اندرونی خباثت بسا اوقات ان کی زبانوں پر تو آتی رہتی ہے۔مگر وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ جو کچھ ان کے دلوں میں چھپی ہوئی غلاظت ہے، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔لہذا ان سے ہمیشہ خبردار رہنا چاہیئے۔کوئی راز کی بات ان تک نہیں پہنچنی چاہیئے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ ہم نے اپنی نشانیاں ار احکام کھول کھول کر بیان کر دیے ہیں اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۱۱۸ اگر تم عقل وشعور رکھتے ہو تو ان پر سختی سے عمل پیرا ہو جاؤ۔اور اگر اس کے باوجود تم غیر مسلموں پر اعتماد کرو گے ان کو وزیر مشیر بناؤ گے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرو گے تو پھر بہت بڑے قومی نقصان کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ کفار سے دوستانہ تعلقات، دلی محبت واخلاص حرام ہے اور انہیں اپنا راز دار بنانا بھی ناجائز ہے اور تجربات سے بھی یہی ثابت ہے کہ کفار مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کرتے۔نیز اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان حکمران کافروں اور مرتدوں کو اہم ترین عہدوں پر نہ لگائے جس سے یہ لوگ غداری کرنے کا موقعہ پائیں کیونکہ یہ لوگ تمہاری برائی

چاہنے میں کوئی کمی نہیں کریں گے، ان کی تو خواہش ہی یہ ہے کہ مسلمان تکلیف ومشقت میں پڑے رہیں نیز ان کی دشمنیاں ان کے الفاظ اور کردار سے ظاہر ہیں جو وقتاً فوقتاً سامنے آتا رہتا ہے۔ جب زبانی دشمنی بھی سامنے آتی رہتی ہے تو جو دشمنی اور مسلمانوں سے بغض وعداوت ان کے دلوں میں ہوگی وہ کس قدر ہوگی؟ یقیناً ان کے دلوں میں موجود دشمنی ظاہری دشمنی سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا اے مسلمانو! اِن سے دوستی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے اپنی آیتیں کھول کر بیان فرماتا ہے۔ قرآنِ پاک کی جامعیت اور حقانیت کو اگر سمجھنا ہو تو ان آیات کو سامنے رکھ کر تمام دنیا کے مسلمان اور کافر ممالک کے حالات کا جائزہ لیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بیان فرمایا وہ قطعی طور پر حق اور سچ نہیں ہے؟ یقیناً سچ ہے۔ تاریخِ عالم، تاریخِ اسلام اور موجودہ حالات تمام کے تمام قرآن کی ان آیات کی صداقت پر دلالت کررہے ہیں لیکن افسوس کہ ابھی بھی ہماری آنکھیں خوابِ غفلت میں ہیں، ہمارے لوگ ابھی بھی انہی کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا مان رہے ہیں جنہیں اپنے راز بتانے سے بھی اللہ تعالیٰ ہمیں منع فرمارہا ہے۔

یکطرفہ محبت

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ	خبردار تم ہی وہ لوگ ہو	تُحِبُّوْنَهُمْ	(کہ) تم اُن سے محبت رکھتے ہو		
وَلَا	اور نہیں	يُحِبُّوْنَكُمْ	محبت رکھتے وہ تم سے		
وَتُؤْمِنُوْنَ	اور تم ایمان رکھتے ہو	بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ج	سب کتابوں پر		
وَاِذَا	اور جب	لَقُوْكُمْ	وہ تم سے ملتے ہیں	قَالُوْٓا	(تو) کہتے ہیں
اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے	وَاِذَا خَلَوْا	اور جب (وہ اکیلے ہوتے ہیں		
عَضُّوْا	(تو) وہ کاٹتے ہیں	عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ	تم پر (اپنی) انگلیاں		
مِنَ الْغَيْظِ	غصے سے	قُلْ	کہہ دیجئے	مُوْتُوْا	تم مرجاؤ
بِغَيْظِكُمْ	اپنے (ہی) غصے کے ساتھ	اِنَّ اللّٰهَ	بلاشبہ اللہ		
عَلِيْمٌ	خوب جاننے والا ہے	بِذَاتِ الصُّدُوْرِ	سینوں کے راز (یعنی دل کی باتیں)		

اللہ تعالیٰ نے فرمایا هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ اے ایمان والو! تم تو دوسروں سے محبت کرتے ہو، وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ مگر وہ تم سے محبت نہیں کرتے مطلب یہ کہ تم تو عیسائیوں، یہودیوں، انگریزوں اور امریکہ والوں کو اپنا راز دار بنا رہے ہو، ان کو مشیر بنا رکھا ہے، ان سے محبت بڑھا رہے ہو۔ مگر وہ تم سے دلی لگاؤ نہیں رکھتے۔ لہذا ان کے ساتھ تمہاری محبت یکطرفہ ہے۔ محبت ہمیشہ جانبین کی طرف سے ہونی چاہئے۔ تالی دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ لہذا صرف تمہاری طرف سے یکطرفہ محبت کوئی محبت نہیں، وہ تو اللہ، اس کے رسول اور قرآن پاک کے شدید ترین دشمن لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ۔ مسلمانوں کے حق میں سب سے زیادہ دشمن یہودی ہیں۔ اس کے بعد مشرکین اور نصاریٰ کا نمبر آتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ صرف تمہاری طرف سے دوستی اور محبت اہل اسلام کے لیے لازماً نقصان کا باعث ہوگی۔ واضح رہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ حُسنِ اخلاق و نیک برتاؤ اور ظاہری خوش خُلقی سے پیش آنا درست ہے۔ اور اسلامی اخلاق سے متاثر کر کے غیر مسلم کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے اس کی اجازت ہے لیکن قلبی تعلق اور دلی دوستی کسی غیر مسلم کے ساتھ رکھنا جائز نہیں ہے۔ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ج تم یعنی اہل ایمان تو تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ منجانب اللہ ہونے کی حیثیت سے تمہارے نزدیک زبور، تورات، انجیل اور قرآن پاک سب برابر ہیں۔ مگر اہل کتاب قرآن پاک کو اللہ کی کتاب نہیں مانتے۔ یہودی ہمیشہ قرآن پاک کی مخالفت میں تمام اخلاقی حدود کو پامال کرتے رہے ہیں۔ اہل کتاب قرآن پاک کو انسانیت کا دشمن سمجھتے ہیں۔ جب کہ ہمارے نزدیک انسانیت کی بہتری کے لیے سب سے اعلیٰ کتاب قرآن کریم ہے۔ ان حالات میں جب کہ اہل ایمان اور اہل کتاب کی دوستی کی بنیاد ہی نہیں ہے، تو ان کے ساتھ دوستی کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا کہ ان کو راز داری کی بات نہ بتادینا، ورنہ وہ نقصان پہنچائیں گے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے یہودی منافقین کی ایک اور خصلت بیان فرمائی ہے وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ جب وہ تم سے یعنی مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے

ہیں وَاِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَیۡکُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَیۡظِ ؕ اور جب الگ ہوتے ہیں، تو غصے کے مارے انگلیوں کو چباتے ہیں۔ جب کسی انسان کی مرضی کے خلاف کوئی چیز واقع ہو جائے تو اسے نہایت افسوس ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی بے بسی کے طور پر غصے میں دانت پیستا ہے، اور کبھی ہاتھوں کی انگلیوں کو دانتوں سے کاٹتا ہے اور ہاتھ کی پشت پر دانت نصب کر دیتا ہے ایسا نہایت غصے کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس صورتحال میں قُلۡ آپ ان سے کہہ دیں مُوۡتُوۡا بِغَیۡظِکُمۡ ؕ تم اپنے ہی غصے کی آگ میں جل مرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ جب کسی سے قطع تعلقی کرنا ہو، تو اسے کوئی چبھتی ہوئی بات کہہ دینی چاہئے تاکہ وہ سمجھ جائے کہ اب یہ تعلقات قائم نہیں رہ سکتے، یہ الفاظ بھی اسی قسم کے ہیں۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اہل کتاب کے ساتھ مسلمانوں کا دوستانہ نہیں رہ سکتا، ہم تمام آسمانی کتابوں کو برحق سمجھتے ہیں مگر وہ قرآن پاک کو آسمانی کتاب ماننے پر تیار نہیں۔ ہم تمام انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرتے ہیں مگر وہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کو تیار نہیں تو پھر دوستی کی بنیاد ہی ختم ہوگئی۔ لہذا ان کو یہ دل شکن بات کہہ دی گئی۔ کہ جس غیظ وغضب کا اظہار تم مسلمانوں کے خلاف کر رہے ہو، خود اسی غصے سے مر جاؤ۔ فرمایا اگرچہ تم بظاہر ایمان کا اظہار کرتے ہو، مگر یاد رکھو! اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۱۹﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے سینوں کے راز یعنی ان میں بھری ہوئی غلاظت سے خوب واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ پیغمبر اسلام، اہل ایمان اور اللہ کی کتاب قرآن پاک کے خلاف تمہارے دلوں میں کس قدر زہر بھرا ہوا ہے، تمہاری کچھ خباثت تو تمہاری زبانوں سے بھی بعض اوقات ظاہر ہو جاتی ہے۔ مگر جس چیز کو تم چھپا رہے ہو، اللہ سے کچھ مخفی نہیں۔ وہ تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔ پھر اس کی گرفت سے بچ نہیں سکو گے۔

منافقین کی ناگواری

اِنۡ	اگر	تَمۡسَسۡکُمۡ	پہنچے تمہیں
حَسَنَۃٌ	کوئی بھلائی	تَسُؤۡہُمۡ	(تو وہ) انہیں بری لگتی ہے

وَاِنۡ	اور اگر	تُصِبۡكُمۡ	تمہیں پہنچے
سَيِّئَةٌ	کوئی برائی (تکلیف)	يَّفۡرَحُوۡا	(تو) وہ خوش ہوتے ہیں
بِهَا	اس سے	وَاِنۡ	اور اگر
تَصۡبِرُوۡا	تم صبر کرو		
وَتَتَّقُوۡا	اور تم تقویٰ اختیار کرو	لَا يَضُرُّكُمۡ	(تو) نہیں تمہیں نقصان پہنچائے گا
كَيۡدُهُمۡ	اُن کا مکر (ان کا فریب)	شَيۡــًٔا	کچھ بھی
اِنَّ اللّٰهَ	بلاشبہ اللہ	بِمَا	اس کو جو
يَعۡمَلُوۡنَ	وہ کرتے ہیں	مُحِيۡطٌ	گھیرنے والا ہے۔

فرمایا اے ایمان والو اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ اگر تمہیں کوئی اچھائی پہنچے تو منافقین کو ناگوار گزرتی ہے، تمہاری کامیابی دیکھ کر جل جاتے ہیں، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو، کسی جنگ میں فتح ہو تو ان پر گراں گزرتا ہے وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا ؕ اور اگر تم کو کوئی تکلیف پہنچے شکست ہو جائے، کچھ آدمی مارے جائیں۔ مالی نقصان ہو جائے۔ تو یہ بڑے خوش ہو جائے، ان حالات میں ان لوگوں سے دوستی کبھی مفید نہیں ہو سکتی ہے، کیونکہ اَلۡمُؤۡمِنُ مِرۡآةُ الۡمُؤۡمِنِ وَالۡمُؤۡمِنُ أَخُو الۡمُؤۡمِنِ مومن مومن کا آئینہ ہے، اور مومن مومن کا بھائی ہے، وہ اس کی جائیداد کی نگرانی کرتا اور اس کی غیر موجودگی میں اس کی حفاظت کرتا ہے"۔ (سنن ابی داود) اور پھر اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ۔ تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا دلی دوستی اپنے بھائیوں سے رکھو۔ دشمنانِ خدا اور دشمنان رسول سے لاتعلقی کا اظہار کرو۔ ان سے دوستی نقصان کا باعث ہوگی وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡــًٔا ؕ اور اگر تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو ان کی مکاری تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ دشمنان اسلام کی کوئی مکاری اور حیلہ سازی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ نقصان وہاں ہوگا۔ جہاں صبر اور تقوی کا فقدان ہوگا۔ صابرین کا نمونہ دیکھنا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام پر ایک نظر ڈال لو۔ وہ تقوی کی اعلیٰ منزل پر تھے۔ انہیں کے نقش قدم پر چل کر تم بھی صبر اور تقوی کے اوزار زیب تن کر سکتے ہو جن کے ذریعے

دشمن کے ہر حملے کا دفاع کیا جاسکتا ہے۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے اصول بتا دیے کہ اپنے علاوہ غیروں کو راز دار نہ بناؤ۔ ان کی مکاریوں کا دفاع صبر اور تقویٰ کے ساتھ کرو، تو تم ہمیشہ مامون رہو گے۔ لہٰذا ان وجوہات کی بنا پر تمہیں ان سے دوستی نہ رکھنا چاہیئے اور راز بتانا تو بڑی دور کی بات ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہر عمل کا احاطہ کرنے والا ہے۔ ان کی شرارتوں کی سزا ان کو ضرور مل کر رہے گی۔ وہ اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

غزوہ احد، پس منظر، حقائق اور نتائج / توکل علیٰ اللہ کی اہمیت وافادیت

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

صف بندی اور دوبدو لڑائی

وَاِذْ	اور جب	غَدَوْتَ	آپ صبح کو نکلے
مِنْ اَهْلِكَ	اپنے گھر والوں (کے پاس) سے	تُبَوِّئُ	آپ بٹھاتے تھے
الْمُؤْمِنِيْنَ	مومنوں کو	مَقَاعِدَ	مورچوں پر
لِلْقِتَالِ	لڑائی کے لئے	وَاللّٰهُ	اور اللہ
سَمِيْعٌ	خوب سننے والا	عَلِيْمٌ	خوب جاننے والا ہے۔

فرمایا: وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ اور (وہ وقت بھی یاد کیجئے) جب آپ صبح دم اپنے گھر سے نکلے اور مسلمانوں کو جنگ (احد) کے لیے مورچوں پر بٹھا رہے تھے۔ 3 ہجری 15 شوال المکرم میں "غزوہ احد" پیش آیا۔ غزوہ کے معنی وہ جنگ جس

میں حضور ﷺ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی ہو اور احد ایک پہاڑ کا نام ہے جو مدینہ سے دو میل بعض جگہ تین میل لکھا ہے کہ فاصلہ پر ہے۔ اس مقدس پہاڑ کا ذکر قرآن اور حدیث میں موجود ہے۔ غزوہ بدر میں قریش مکہ کو شکست ہوئی تو بدلہ لینے کے لیے فیصلہ کن اور منظم جنگ کی منصوبہ بندی کرنے میں مصروف ہو گئے، افرادی اور معاشی قوت کو جمع کرنے کے لیے مسلسل محنت شروع کر دی۔ بدر میں مسلمان جس قافلے کے لیے نکلے تھے وہ ابوسفیان کی معیت میں بچ نکلا اور مکہ پہنچ گیا یہ قافلہ جو مال تجارت لے کر آیا تھا قریش مکہ کو اس میں بہت نفع ہوا انہوں نے اس بات پر مشورہ کیا کہ جتنا نفع ہوگا وہ سب اس جنگ میں لگائیں گے۔ بہر حال اس کا پس منظر مختصراً یہ ہے کہ جب جنگ بدر ہجری میں کفار کو عبرت ناک شکست ہوئی، ان کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر قید ہوئے تو ان کفار کے لئے یہ بڑی بدنامی کا باعث اور ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست انتقامی جنگ کی تیاری کی جس میں عورتیں بھی شریک ہوئیں۔ ادھر مسلمانوں کو جب اس کا علم ہوا کہ کافر تین ہزار کی تعداد میں احد پہاڑ کے قریب خیمہ زن ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے صحابہ علیہم الرضوان سے مشورہ کیا کہ وہ مدینہ میں ہی رہ کر لڑیں یا مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کریں، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اندر رہ کر ہی مقابلہ کا مشورہ دیا اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا لیکن اس کے برعکس بعض پر جوش صحابہ نے جنہیں جنگ بدر میں حصہ لینے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی، مدینہ سے باہر جا کر لڑنے کی حمایت کی۔ آپ ﷺ اندر حجرے میں تشریف لے گئے اور ہتھیار پہن کر باہر آئے، دوسری رائے والوں کو ندامت ہوئی کہ شاید ہم نے رسول اللہ ﷺ کو آپ کی خواہش کے برعکس باہر نکلنے پر مجبور کر کے ٹھیک نہیں کیا چنانچہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ﷺ آپ اگر اندر رہ کر مقابلہ کرنا پسند فرمائیں تو اندر ہی رہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ لباس حرب پہن لینے کے بعد کسی نبی کے لائق نہیں ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے کے بغیر واپس ہو یا لباس اتارے۔ نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم جمعہ کے روز نمازِ جمعہ کے بعد ایک انصاری کی نمازِ جنازہ پڑھ کر روانہ ہوئے اور پندرہ شوال 3 ہجری بروز اتوار اُحد میں پہنچے چنانچہ

مسلمان ایک ہزار کی تعداد میں روانہ ہوئے مگر صبح دم جب مقام شوط پر پہنچے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سوساتھیوں سمیت یہ کہہ کر واپس آ گیا کہ اس کی رائے نہیں مانی گئی۔خواہ مخواہ جان دینے کا کیا فائدہ؟اس کے اس فیصلے سے وقتی طور پر بعض مسلمان بھی متاثر ہو گئے اور انہوں نے بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا۔(ابن کثیر) پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو ثابت قدم رکھا یہاں تک کہ مشرکین کو شکست ہوئی۔یہ آیت صاف بتلا رہی ہے۔کہ جنگ بدر کی طرح جنگ احد میں بھی کمان خود حضور ﷺ نے کی،آپ ﷺ کے علاوہ کوئی دوسرا کمانڈر نہیں تھا۔آپ نے میدان جنگ کا اچھی طرح جائزہ لیا۔جبل احد پانچ سات میل میں پھیلا ہوا لمبا چوڑا پہاڑ ہے۔

جبل رماۃ پر مقرر دستہ

آپ ﷺ نے جنگی حکمت عملی کے تحت اُحد پہاڑ کی ایک طرف دَرہ ہے جو جبل رماۃ کے نام سے معروف ہے۔یہ وہ جگہ ہے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھ پچاس تیر اندازوں کو مقرر فرمایا اور تاکید کی کہ جب تک میرا حکم نہ ہو آپ لوگوں نے یہاں سے ہٹنا نہیں، چاہے فتح ہو یا شکست۔تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انتہائی جانثاری اور جوانمردی کے ساتھ کفار سے لڑتے رہے اور مشرکین بھاگنے پر مجبور ہو گئے کچھ مسلمان ان کو بھگا رہے تھے اور کچھ مال غنیمت اکٹھا کر رہے تھے۔دَرہ پر مقرر تیر انداز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اکثر نیچے اتر کر اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر غنیمت اکٹھی کرنے لگے۔دوسری طرف خالد بن ولید جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے انہوں نے درہ خالی دیکھا اور اچانک حملہ کر دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ جب تک میں نہ کہوں آپ نے یہاں سے نہیں ہلنا چاہے، فتح ہو یا شکست۔اس کے باوجود وہ نیچے کیوں اترے؟ پہلی بات یہ ہے کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتہاد تھا اور اس میں خطا سرزد ہو گئی۔اللہ رب العزت نے ان کی اس اجتہادی خطا کو معاف فرما دیا ہے۔لہٰذا ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ان پر اعتراض کریں۔قرآن کریم میں ہے: دو فوجوں کی باہمی لڑائی (غزوہ اُحد) والے دن جو لوگ تم میں سے

پیچھے ہٹ گئے، شیطان نے انہیں اُن کے بعض (پہلے والے) گناہوں کی وجہ سے بہکایا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اس کی بھی معافی دے دی۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی ذات بخشنے والی اور بردبار ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین محفوظ ہیں۔ محفوظ ہونے کا معنی یہ ہے کہ اگر ان میں سے کسی ایک سے بشری تقاضوں کے مطابق کبھی کوئی گناہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان کے ذمے میں وہ گناہ باقی نہیں رہنے دیتے یعنی دنیا میں اس گناہ سے معافی اور اس گناہ کی وجہ سے ملنے والے اُخروی عذاب سے ان کو محفوظ فرما لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے معاف فرما دینے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر الزام درست نہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اللہ کی بے پناہ محبت

دوسری وجہ یہ ہے کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنگ کی ابتداء سے مورچے پر مامور تھے، انہیں میدان میں اتر کر لڑائی کا موقع ہی نہ ملا، اگرچہ مورچہ سنبھالنے کا اور پہرے کا ثواب ملا ہے لیکن انہوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں میدان میں اتر کر بہادری کے ساتھ لڑنے اور کفار کو بھگانے والی شجاعت کا ثواب نہیں مل رہا۔ اب جب انہیں دشمن کے بھاگ جانے کا اور لشکر اسلام کے فتح یاب ہونے کا یقین ہوا تو وہ نیچے اتر آئے تاکہ دونوں اجر حاصل کر سکیں۔ مورچہ پر پہرے دینے والا بھی اور میدان میں جہاد و قتال کرنے والا بھی۔ جب کفار میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس مبارک جذبے کے تحت درے سے نیچے اترے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ مال غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا، اس بابرکت کام میں ان کی مدد کرنے لگے۔ اس وجہ سے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید درست نہیں۔ یہ حضرات قُربِ خدا اور قُربِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مقام پر فائز تھے کہ جہاں ان کی صورتاً لغزش پر بھی محبوبانہ عتاب نازل ہوا۔ لیکن جہاں یہ محبوبانہ عتاب نازل ہوا اسی کے متصل بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی کا اعلان بھی کر دیا اور محبت کی شدت اور انتہاء کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ تسلی پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ فوراً ساتھ دوسری مرتبہ بھی از راہ شفقت مزید فرمایا کہ بخش دیا ہے۔ اور یہ وہاں ہوتا ہے جہاں محبت بہت زیادہ ہو تاکہ کمال محبت کا اظہار ہو جائے۔ یہ واقعہ تکوینی

طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کرایا گیا تاکہ خدا تعالیٰ کی ان سے محبت سب کے سامنے آشکار ہو سکے، ان سے محبت خداوندی کا اظہار ان کے لیے اعزاز ہے، ان پر الزام نہیں۔

احد کے میدان میں 70 اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت

خالد بن ولید جو کہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے انہوں نے شدید حملہ کر دیا جس کے بعد مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا۔ صرف دس افراد درہ پر باقی بچے تھے اور گیارہویں حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ تھے سب شہید ہو گئے۔ اب جیتی ہوئی جنگ بظاہر ہاتھ سے نکل گئی۔ اس افراتفری کی شدید کیفیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے چند مہاجرین و انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ الغرض! احد کے میدان میں 70 اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے شہادت پائی جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عزیز چچا تھے اور عبداللہ بن جحش یاسرؓ اور ابو دجانہ رضی اللہ عنہم جیسے اکابرین شامل تھے۔ مدینہ کے ہر گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی اس موقع پر بھی عبداللہ ابن ابی سردار منافقین نے گھر گھر جا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس معرکہ سے متعلق زہر افشانی کی، وہ کہہ رہا تھا کہ اوس اور خزرج کا کیسا بھاری نقصان ہُوا ہے ہماری طرح لوٹ آتے تو یہ مالی اور جانیں نقصان نہ ہوتا۔ شیدائیان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جذبۂ شہادت سے سرشار شمع رسالت کے پروانوں نے ایسا منہ توڑ جواب منافقین کو دیا کہ وہ ایسی شکستہ حالت میں مشرکین مکہ کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔
مولانا ابو الکلام آزاد، رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لکھتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زخمی صحابہ علیہم الرضوان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: مسلمانوں ہمارا دشمن میدان سے بھاگ کھڑا ہُوا ہے ہم ان کے تعاقب میں جائیں گے اور دیکھو! اس مہم میں صرف اسی شخص کو شرکت کا حق ہوگا جو احد کے میدان میں ہمارے ساتھ تھا۔ تمام مجروحین نے ایک آواز ہو کر کہا: لبیک یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم حاضر ہیں۔ (مجروحین لفظ "مجروح" کی جمع ہے، جس کے لغوی معنی زخمی، گھائل یا چوٹ کھائے ہوئے افراد کے ہیں) لوگوں نے اپنے زخموں پر پٹیاں باندھیں اپنے ہتھیار درست کیے اپنے شہداء کے غم کا پتھر دل پر رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے ہو لیے مدینہ سے آٹھ میل تک اسی حالت میں مشرکین

مکہ کا پیچھا کرتے رہے کہ پٹیوں کی وجہ سے اکثر کی شاخت بھی مشکل ہو رہی تھی تاکہ دنیا دیکھ لے کہ مسلمانوں نے اپنے نبی ﷺ کی قیادت میں کسی غزوہ میں نقصان بھلے ہی اٹھایا لیکن شکست نہیں کھائی۔ یہ غزوہ احد مشرکین مکہ سے دوسری اور آخری معرکہ آرائی نہ تھی بل کہ یہ ایک اور بڑی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس میں اور دیگر قبائل نے بھی حصہ لیا۔

وَاللّٰهُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۲۱﴾ اللہ تعالیٰ تمام باتوں کو سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ دکھا دیا کہ بدر میں اللہ عَزَّ وَجَلَّ اور اس کے رسول صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی فرمانبرداری کی برکت سے فتح ہوئی تھی جبکہ یہاں حضور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے حکم کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دلوں سے رعب و ہیبت دور کر دی اور وہ پلٹ پڑے اور مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے ساتھ ایک جماعت رہ گئی جس میں حضرت ابوبکر، حضرت علی، حضرت عباس، حضرت طلحہ اور حضرت سعد رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم تھے۔ اسی جنگ میں دندانِ اقدس شہید ہوئے اور چہرۂ اقدس پر زخم آیا۔ اسی کے متعلق یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔ (خازن)

توکل علی اللہ کا مفہوم

اِذۡ هَمَّتۡ	جب ارادہ کیا	طَّآئِفَتٰنِ	دو گروہوں نے
مِنۡكُمۡ	تم (میں) سے	اَنۡ	یہ کہ
تَفۡشَلَا	ہمت ہار دیں	وَاللّٰهُ	حالانکہ اللہ
وَلِيُّهُمَا	ان کا دوست تھا	وَعَلَى اللّٰهِ	اور اللہ ہی پر
فَلۡيَتَوَكَّلِ	چاہیے کہ توکل کریں	الۡمُؤۡمِنُوۡنَ	سب مومن۔

مدینے کے دو قبیلے بنو سلمہ اور بنو حارثہ تھے۔ ایک اوس خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا خزرج سے۔ عبداللہ بن ابی ان قبیلوں پر بھی اثر انداز ہوا۔ اور انہیں جنگ احد میں شرکت سے روکنا چاہا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر اس طرح کیا اِذۡ هَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ مِنۡكُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا ۙ جب تم میں سے

دو گروہوں نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کیا۔قریب تھا کہ یہ دو قبیلے عبداللہ بن ابی کے کہنے پر مسلمانوں سے الگ ہو جاتے ،مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ان کی دستگیری فرمائی اور وہ ثابت قدم ہو گئے ۔اللہ نے ان کی تعریف فرمائی ہے وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ اللہ تعالیٰ ہی ان کا کارساز ہے ۔اس نے عین موقع پر ان کی مدد فرمائی اور وہ غلطی سے بچ گئے ،ورنہ منافقین کی صف میں شامل ہو جاتے ۔اللہ نے فرمایا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ اہل ایمان کو چاہئے کہ اللہ پر ہی مکمل بھروسہ رکھیں، فتح وشکست اسی مالک الملک کے ہاتھ میں ہے ۔انسان کو چاہئے کہ وہ اس پر بھروسہ کرتے ہوئے حتی الامکان کوشش کرے ۔اسلحہ جمع کرے ،مجاہدین تیار کر کے میدان جنگ میں اترے اور پھر نتیجہ اللہ کی ذات پر چھوڑ دے ۔فتح ونصرت اسی کی طرف سے ہوگی ۔مومنوں کو ہر حال میں اللہ پر توکل کرنا چاہئے ۔کمزوروں ،مجبوروں ،اور بے سہارا لوگوں کو خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے میدان عمل میں اترنا چاہئے ۔مسلمان جب تک اس اصول پر پر عمل کرتے رہے ۔کامیاب ہوئے ،جب صبر اور تقوی کا دامن چھوٹ گیا،تو نقصان اٹھانا پڑا ۔آیت کے آخر میں توکل کی عظمت کو بھی بیان فرمایا۔توکل کا مفہوم یہ ہے کہ اپنا کام کسی کے سپرد کر کے اس پر اعتماد کرنا،اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی کارساز ہونے کا یقین رکھتے ہوئے اپنے کام اس کے سپرد کر دینا۔توکل اللہ کو کتنا پسند ہے اور متوکلین کا مقام کس درجہ بلند ہے'اس کو قرآن کریم کے تاکیدی حکم سے سمجھا جاسکتا ہے ۔ایمان وتوحید کا معاملہ ہو یا فتح ونصرت کی طلب'رزق میں فراخی مقصود ہو، چاہے مصائب ومشکلات سے نجات...... ہر جگہ توکل علیٰ اللہ کی روح ہونی چاہیے ۔چند آیات کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :اور اللہ ہی پر مومنوں کو اعتماد کرنا چاہیے ۔"(التوبہ :51)"اگر تم مومن ہو تو بس اللہ ہی پر توکل کرو"۔(المائدہ :23)"اگر تم اللہ پر ایمان لائے تو اس پر اعتماد کرو'اگر تم فرماں بردار ہو۔"(سورۃ یونس :84)"تو انہوں نے کہا: ہم نے اللہ پر توکل کیا'اے ہمارے رب ۔"(سورہ یونس :85)اللہ تعالیٰ ہمیں متوکلین میں شامل فرمائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عقیدت ،محبت اور ان کی اطاعت نصیب فرمائے ۔(آمین)

ہر کام میں اللہ کی مدد حاصل کریں! مگر کیسے؟

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ
تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ
رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

بدر کے واقعہ کی بھی یاد دہانی

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	نَصَرَكُمُ اللّٰهُ	اللہ نے تمہاری مدد کی
بِبَدْرٍ	بدر میں	وَّاَنْتُمْ	جب کہ تم
اَذِلَّةٌ	کمزور تھے	فَاتَّقُوا اللّٰهَ	چنانچہ تم اللہ سے ڈرو
لَعَلَّكُمْ	تا کہ تم	تَشْكُرُوْنَ	شکر کرو۔(123)

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ بدر کے مقام پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ بدر ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان مدینہ سے ستر یا اسی میل کے فاصلے پر ہے۔ دراصل جاہلیت کے زمانے میں بدر بن قیس یا امام ابن کثیر کے مطابق بدر ابن نارین نامی ایک شخص نے اس مقام پر کنواں کھودا تھا، جس کے نام پر، اس کنویں کا نام بدر مشہور ہو گیا، اور اسی

نسبت سے اس جگہ کا نام بھی بدر ہی پڑ گیا۔ چار پانچ میل کا یہ ایک میدانی علاقہ ہے جس کے اردگرد پہاڑیاں ہیں، تاہم ساحل سمندر سے قریب ہی ہے۔ اس مقام پر بروز جمعہ سترہ رمضان 2ھ میں اہل حق اور اہل باطل کے درمیان ایک عظیم واقعہ پیش آیا، جو مسلمانوں کے لیے ہجرت کے بعد سب سے اہم لڑائی تھی۔ اس سے پہلے چھوٹی چھوٹی دو تین جھڑپیں ہو چکی تھیں، تاہم یہ سب سے بڑا معرکہ تھا۔ وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ ۚ کہ تم نہایت ہی کمزور تھے۔ اذلۃ، ذلیل کی جمع ہے اور یہ لفظ عربی زبان میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ایک معنی کمزور اور بے سروسامان ہوتا ہے۔ اور اس موقع سے یہی معنی زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ غزوہ بدر میں مسلمانوں کے پاس صرف ایک یا دو گھوڑے، ستر اونٹ اور چند ایک شکستہ تلواریں تھیں، کچھ زرہیں بھی تھیں۔ مجاہدین کی تعداد 313 یا 319 تھی۔ برخلاف اس کے کفار کی تعداد ایک ہزار افراد پر مشتمل تھی، ان کے پاس ایک سو زبردست گھوڑے، ماہر سوار ہر سپاہی کے پاس دو دو اونٹ اور سامان خوردونوش کی فراوانی تھی۔ وہ سامان ضرب وحرب سے لیس تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مقابلے میں مسلمان کمزور اور بے سروسامان ہی تھے، اور یہی اذلۃ کا معنی ہے۔ اس آیت میں جنگ احد میں شکست کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معرکۂ بدر کے واقعات پر غور وفکر کی دعوت اور آئندہ ثابت قدم رہنے کے لیے تقویٰ کی تعلیم دی ہے۔ لہٰذا اے مسلمانو! فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ اللہ سے ڈر جاؤ، تاکہ تم شکر ادا کرسکو۔ تقوی سے مراد کفر، شرک اور معاصی سے بچنا حدود شریعت کی کی حفاظت کرنا اور عدل وانصاف پر عمل پیرا ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس معیار پر پورا اترے گا، وہ یقیناً شکر گزار ہوگا۔ برخلاف اس کے کافر، مشرک بدعقیدہ لوگ اس معیار پر پورے نہیں اترتے اس لیے وہ ناشکر گزار ہوتے ہیں مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر اسی صورت میں ادا ہوسکتا ہے کہ انسان تقوی اختیار کرے۔

بدر کے واقعہ کی بھی یاد دہانی فرمادی کہ جب مسلمانوں کی کل تعداد 313 تھی اور پوری فوج کے پاس سواری کے لیے صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے اور تلواریں بھی صرف غالباً آٹھ تھیں اور باقی سامان جنگ بھی نہایت قلیل اور ناکافی تھا۔ لیکن اس بے سروسامانی کے باوجود انہوں

نے ہمت نہ ہاری اور نہ ہی صبر وتقویٰ کا دامن ہاتھ سے چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی مدد اور نصرت بھی فوراً آپ پہنچی۔ بدر کا واقعہ یاد دلا کر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاد میں ثابت قدم رہنے اور تقویٰ اختیار کرنے کی تعلیم فرمائی ہے۔اور تمہاری عددی قلت اور مادی بے سروسامانی کے باوجود ابھی کل خدا نے تمہاری مدد فرمائی اور تمہیں شاندار فتح دی تو اس خدا سے کیوں مایوس ہوتے ہو وہ آج بھی تمہارا حامی و ناصر اور ولی و کارساز ہے۔آخر میں فرمایا کہ خدا کی شکر گزاری کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے تقویٰ ضروری ہے۔جو لوگ عزم و ہمت سے خالی ہوں گے وہ شیطان سے ہر قدم پر مار کھائیں گے اور حق کے بجائے باطل کی راہ اختیار کریں گے۔ایسے لوگ خدا کی شکر گزاری کا حق ادا نہ کرسکیں گے۔

اللہ کی مدد کیسے حاصل ہو گی؟

اِذْ تَقُوْلُ	جب آپ کہتے تھے	لِلْمُؤْمِنِيْنَ	مومنوں سے
اَلَنْ	کیا ہرگز نہ	يَّكْفِيَكُمْ	کفایت کرے گی تمہیں
اَنْ	یہ (بات) کہ	يُّمِدَّكُمْ	مدد کرے تمہاری
رَبُّكُمْ	تمہارا رب	بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ	ساتھ تین ہزار
مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ	فرشتوں کے (جو)	مُنْزَلِيْنَ	اتارے گئے ہیں (آسمان سے)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ جب آپ ایمان والوں سے کہہ رہے تھے اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں کے ساتھ۔اس آیت کریمہ کا پس منظر یہ ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کافروں کی تعداد تو پہلے ہی زیادہ تھی ،بعض نے یہ تعداد ایک ہزار لکھی ہے جو زیادہ مشہور ہے اور بعض نے پندرہ سو بھی لکھی ہے۔اس کے باوجود وہاں یہ مشہور ہو گیا۔کہ کافروں کی مدد کے لیے کرز بن جابر مزید لشکر لا رہا ہے۔ظاہر ہے کہ اس خبر سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہونے ک خطرہ تھا۔لہذا اس وحشت کو دور کرنے کے لیے اللہ نے اپنے

بذریعہ وحی یہ بشارت دی، کہ مسلمان دشمن کی کثرت تعداد سے خوف نہ کھائیں، اللہ تمہاری مدد کے لیے آسمان سے تین ہزار فرشتوں کو نازل فرمادے گا۔ اس آیت میں اس بات کا حوالہ ہے جو نبی ﷺ نے مسلمانوں کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے اس وقت فرمائی جب عبداللہ بن ابی اپنے تین سوساتھیوں کو لے کر واپس ہوگیا اور بعض مسلمانوں میں، جیسا کہ اوپر والی آیت میں ذکر ہے، اس سے بددلی پھیلی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تین سو آدمی الگ ہو گئے تو کیا ہوا؟ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تین سو کمزور اور پست ہمت آدمیوں کی جگہ تین ہزار تازہ دم اتارے ہوئے فرشتوں کے ذریعے سے تمہاری مدد فرمائے "اتارے ہوئے" سے مقصود اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اسی کار خاص کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تازہ دم کمک کے طور پر آسمان سے اتارے جائیں گے۔ اللہ کی مدد (نصرتِ الٰہی) اہل ایمان کے لیے سب سے بڑی طاقت ہے، جس کے ذریعے کوئی ان پر غالب نہیں آسکتا۔ یہ مدد تقویٰ، صبر، شکر، اور اللہ کے دین کی نصرت کرنے والوں کو ملتی ہے۔ جب بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے، اللہ اس کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

خدا کی نصرت کا مستحق بننے کی شرط ایک لفظ میں یہ ہے کہ "جب تم مدد کرو گے تو تمہاری مدد کی جائے گی"۔ خدا ہماری مدد پر اس وقت آتا ہے جب کہ ہم دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو ہم خدا سے اپنے لئے چاہتے ہیں۔ ہماری ذات سے اگر دوسروں کو زحمت پہنچ رہی ہو تو خدا کے فرشتے ہمارے لئے خدا کی رحمت کا تحفہ لے کر نہیں آسکتے۔ اگر ہمارا یہ حال ہو کہ جس پر ہمارا قابو چلے اس کو ہم ناحق ستانے لگیں تو ناممکن ہے کہ خدا وہاں ہماری مدد کرے جہاں کوئی دوسرا ہمارے اوپر قابو پا کر ہمیں ستانے لگتا ہے۔ ایک آدمی اپنی مصیبت میں ہم کو پکارے اور ہم استطاعت کے باوجود اس کی پکار پر دھیان نہ دیں تو کبھی یہ ممکن نہیں کہ خدا اس وقت ہماری پکار کو سنے جبکہ کوئی طاقتور ہمارے اوپر چڑھ آتا ہے اور ہم خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے مقابلہ میں آدمی طاقتور ہوتا ہے اور کسی کے مقابلہ میں کمزور۔ یہی صورت حال نصرتِ خداوندی کے معاملہ میں آدمی کے امتحان کا پرچہ ہے۔ کوئی شخص یا قوم اپنے طاقتوروں کے مقابلہ میں خدا کی جو نصرت

چاہے اس کا ثبوت اس کو اپنے کمزوروں کے معاملہ میں دینا پڑتا ہے۔ اگر آدمی اپنے کمزوروں پر ظلم کرتا ہو تو اپنے طاقتوروں کے مقابلہ میں وہ خدا کی مدد کا مستحق نہیں بن سکتا، خواہ وہ کتنا ہی خدا کو پکارے، خواہ وہ کتنا ہی یوم دعا منائے۔

فرشتوں کے ذریعے مدد

بَلٰٓی	کیوں نہیں (ہاں)	اِنۡ تَصۡبِرُوۡا	اگر تم صبر کرو
وَتَتَّقُوۡا	اور تم ڈرو	وَیَاۡتُوۡکُمۡ	اور وہ (دشمن) آجائے تمہارے پاس
مِّنۡ فَوۡرِہِمۡ	فوراً (اسی دم ابھی) سے	ھٰذَا	یہ
یُمۡدِدۡکُمۡ	وہ مدد کرے گا تمہاری	رَبُّکُمۡ	تمہارا رب
بِخَمۡسَۃِ اٰلٰفٍ	ساتھ پانچ ہزار	مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ	فرشتوں کے
مُسَوِّمِیۡنَ	(جو خاص) نشان والے ہوں گے۔(125)		

فرمایا بَلٰٓی کیوں نہیں اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا اگر تم صبر کرتے رہو۔ بدر کی جنگ میں واقعی مسلمانوں نے صبر کا عظیم مظاہرہ کیا۔ صبر اور بے قراری متضاد چیزیں ہیں۔ صبر روح کی صفت ہے اور بے قراری نفس کی صفت ہے۔ جب روح کی صفت نفس کی صفت پر غالب آجائے، تو انسان کو اطمینانِ قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ صبر بہت بڑی صفت ہے اور اس کا امتحان مصیبت کے وقت، اطاعت کرنے کے موقع پر اور معاصی کے ارتکاب کے وقت ہوتا ہے۔ یہ ملت ابراہیمی کا بہت بڑا اصول ہے۔ اسی لیے مسلمانوں سے فرمایا کہ اگر تم صبر کرتے رہو گے وَتَتَّقُوۡا اور تقوی اختیار کرتے رہو گے۔ اگر انسان کو تقوی کی دولت حاصل ہو جائے، تو اس کے لیے شریعت کے احکام پر چلنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک عظیم صفت ہے۔ جسے حاصل ہو جائے۔ اسی لیے فرمایا۔ وَیَاۡتُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡرِہِمۡ ھٰذَا اگر دشمن تمہارے مقابلے میں اچانک آجائیں، دشمن کو پیچھے سے مزید کمک پہنچ جائے تو پھر بھی تم جی نہ ہارنا، گھبرانا نہیں، یُمۡدِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ بِخَمۡسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ اللہ تمہاری مدد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا، مطلب یہ کہ اگر دشمن کی تعداد بڑھ جائیگی، تو

ان کے مقابلے کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتوں کی فوج بھی بڑھا دے گا،اس لیے ہمت نہ ہاریں۔آگے ان فرشتوں کی صفت بیان کی مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وہ نشان لگانے والے ہوں گے،ہر قوم کے اپنے جنگی نشان ہوتے۔آج کل کے دور میں ٹینک،توپ،بندوق،ہوائی جہاز وغیرہ تمام آلات حرب پر مخصوص نشان ہوتے ہیں اسی طرح قدیم زمانے میں شناخت کے لیے گھوڑوں پر فوجی نشان ہوتے ہیں اسی طرح قدیم زمانے میں شناخت کے لیے گھوڑوں پر فوجی نشان ہوا کرتے تھے۔اس سورہ کے ابتدا میں بھی یہ لفظ آیا تھا۔ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ یعنی نشان لگے ہوئے گھوڑے۔الغرض!مسومین سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے فرشتوں سے مدد فرمائے گا،جو دشمن پر،اس کے گھوڑوں پر اور سامان حرب پر نشان لگائیں گے تاکہ انہیں تباہ و برباد کیا جاسکے۔مسومین سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے فرشتوں سے مدد فرمائے گا،جو دشمن پر،اس کے گھوڑوں پر اور سامان حرب پر نشان لگائیں گے تاکہ انہیں تباہ و برباد کیا جاسکے۔مسومین سے مراد فرشتوں کی اپنی نشانیاں بھی ہوسکتا ہے۔حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فرشتوں کی نشانی سفید عمامے تھے۔جب کہ احد کے میدان میں ان کی نشانی شرخ عمامے تھے۔تو اللہ نے فرمایا کہ صبر اور تقوی کا پھل یہ ہے کہ اللہ نے بدر میں فتح نصیب فرمائی۔رہا غزوہ احد کا معاملہ تو وہاں مجاہدین سے کچھ کوتاہی ہوگئی تھی۔

یہ اللہ کی سنت ہے جس کی کسوٹی پر ہر وہ جماعت پرکھی جاتی ہے جو حق کی حامل بن کر کھڑی ہوتی ہے۔ان راہوں میں جنھوں نے قدم رکھا،ان کو جو مصائب پیش آئے وہ جھنجھوڑ دیے گئے،ہلا مارے گئے۔آپ غور تو کریں،ان الفاظ پر مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (کب آئے گی اللہ کی مدد)۔ یہ الفاظ ان زبانوں سے ادا ہو رہے ہیں جن زبانوں پر سوائے ذکر اور شکر کے کچھ نہ ہوتا تھا۔وہ قلوب مضمحل ہیں جو اللہ پر پختہ یقین رکھتے تھے،جن کی للہیت اور اخلاص کے بارے میں کسی کو شک اور شبہہ نہ ہوسکتا تھا۔کس قدر نا قابل بیان ہوگی وہ آزمایش جو الْبَاْسَآءُ یعنی فقر و فاقہ کی بھی ہے اور الضَّرَّآءُ یعنی درد و اذیت کی بھی۔شدید حالت اِضطرار میں یہ لفظ جو زبان سے ادا ہوتے ہیں مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ،ان میں کوئی شکایت ہے نہ مایوسی،بلکہ ایک عرض ہے،التجا ہے،دعا ہے،اس لیے کہ اللہ

تعالیٰ کو تو بندوں کا رجوع مطلوب ہے کہ وہ رب کو پکاریں، ان کی نصرت طلب کریں، کیونکہ نصرت کا آنا تو یقینی ہے، البتہ اس کا مقام اور وقت متعین نہیں ہے۔اس لیے اس نصرت کی طلب ہمیشہ التجا بن کر زبان پر رہنا چاہیے۔واضح رہے کہ ایک مومن کا اس بات پر ایمان ہونا چاہیے کہ ہمارا اصل مدد گار صرف اللہ ہی ہے، چنانچہ اللہ سے مدد حاصل کرنے کے کئی طریقے ہیں جن میں سے تین طریقے درج ذیل ہیں۔(1) عمل میں اِخلاص پیدا کرنا: ہماری جدو جہد اور عمل میں اِخلاص ہو تو اللہ کی مدد کا حصول ہوگا، (2) نماز: آپ ﷺ ہر پریشان کن معاملہ میں نماز کا سہارہ لیتے تھے، اور قرآن میں بھی نماز کے ذریعے اللہ سے مدد مانگنے کا حکم ہے۔قرآن مجید میں ہے: وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ وَ اِنَّہَا لَکَبِیۡرَۃٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ (سورہ بقرۃ: آیت: 45) اور مدد لو صبر اور نماز سے، اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب (دلوں) میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، (بیان القرآن) (3) صبر اور دعا: دعا مومن کا ہتھیار ہے، ہر موقع پر دعا کے ذریعے مومن رب کی رضامندی اور مدد حاصل کرتا ہے، اور مصائب پر صبر کرنے سے بھی اللہ کی مدد آتی ہے، جو مومن صبر کے ساتھ اللہ کو پکارتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ہر بلا سے نجات دیتا ہے اور مدد کرتا ہے۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ عمل میں اخلاص، نماز، صبر ار دعا کے ذریعے اللہ کی مدد حاصل کی جا سکتی ہے، تاہم اس کے علاوہ اور اسباب بھی ہے جس کے ذریعے اللہ کی مدد حاصل ہوتی ہے۔مسلمانوں کا توحید الٰہی کو اپنا کر شریعت محمدیؐ کو اپنے تمام معاملات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح اپنانا ہی دونوں جہانوں میں کامیابی کا ضامن ہے۔دعا ہے کہ اللہ پاک ہمیں اپنے دین حق پر کار بند رہتے ہوئے صرط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے اور کبھی بھی اپنی مدد سے محروم نہ رکھے۔آمین!

قرآن کی سچائی اور کفار کے منصوبوں کی ناکامی

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ
اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا
خَآىِٕبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ؑ

زمین پر فرشتوں (ملائکہ) کے نزول کا بنیادی مقصد

وَمَا	اور نہیں	جَعَلَهُ اللّٰهُ	کیا اُس کو اللہ نے
اِلَّا	مگر (وہ صرف)	بُشْرٰى	خوشخبری ہے
لَكُمْ	تمہارے لیے	وَلِتَطْمَىِٕنَّ	اور تاکہ مطمئن ہو جائیں
قُلُوْبُكُمْ	تمہارے دل	بِهٖ	اس سے
وَمَا النَّصْرُ	اور نہیں ہے مدد	اِلَّا	مگر (سوائے)
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ	اللہ ہی کی طرف سے	الْعَزِيْزِ	(جو) نہایت غالب
الْحَكِيْمِ		خوب حکمت والا ہے۔(126)	

ارشاد ہوتا ہے وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ نہیں بنایا اللہ تعالیٰ نے نزول ملائکہ کو اِلَّا بُشْرٰی لَکُمْ مگر تمہارے لیے خوشخبری ۔ تاکہ تمہیں بشارت ہو کہ اللہ کے فرشتوں کی امداد تمہارے ساتھ ہے ۔ تاہم فتح تو بہرصورت اللہ کے حکم سے ہی ہوگی ، مگر اطمینان قلب کے لیے یہ بھی کافی ہے کہ مسلمانوں کو فرشتوں کی تائید بھی حاصل ہے دنیا کی اس زندگی میں اس قسم کے معاملات پیش آتے رہتے ہیں ۔ اگر کسی کو حاکم اعلیٰ یا کسی بڑے چودھری کی حمایت حاصل ہو ، تو اسے دل میں تسلی ہوتی ہے ۔ کہ کوئی بات نہیں ، فلاں بڑی ہستی میرے ساتھ ہے ، مجھے کیا پرواہے ۔ اس پر قیاس کر کے سمجھا جاسکتا ہے ۔ کہ ایک عام انسان کی حمایت دوسرے کے لیے تسلی و تشفی کا باعث ہوتی ہے تو جس کا حمایتی اور طرفدار خود احکم الحاکمین ہو ، اسے کس قدر سکون حاصل ہوگا ۔ ۔ چنانچہ بدر کے میدان میں اللہ نے چار طرح سے مسلمانوں کی مدد فرمائی تھی ۔ مثلاً (1) اللہ نے ہوا کا رخ کفار کے لشکر کی طرف موڑ دیا اور ریت نے اڑ اڑ کر ان کے لشکر کو بدحال بنا دیا ۔ (2) بارش کا نزول جس سے کفار کے پڑاؤ میں تو پھسلن اور دلدل مچ گئی ۔ جبکہ مسلمانوں کے پڑاؤ میں ریت جم کر بیٹھ گئی ۔ نیز انہیں استعمال کے لیے وافر پانی میسر آ گیا ۔ (3) فرشتوں کا نزول چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے بدر کے دن فرمایا : یہ جبریل آن پہنچے اپنے گھوڑے کا سر تھامے ہوئے ، لڑائی کے ہتھیار لگائے ہوئے (بخاری ، کتاب المغازی ، باب شہود الملائکہ بدرا) نیز حضرت رفاعہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جبریل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر کہنے لگے : آپ اہل بدر کو کیسا سمجھتے ہیں ؟ آپ نے جواب دیا : سب مسلمانوں سے افضل یا کوئی ایسا ہی کلمہ کہا : جبریل کہنے لگے : اسی طرح وہ فرشتے جو غزوہ بدر میں حاضر ہوئے تھے دوسرے فرشتوں سے افضل ہیں (بخاری ۔ حوالہ ایضاً) اور (4) مسلمانوں کی مدد کا چوتھا طریقہ یہ تھا کہ کفار کو مسلمان مجاہدین کی تعداد اصل تعداد سے دوگنی نظر آنے لگی تھی ۔ اسی لیے فرمایا کہ نزول ملائکہ کا مقصد ایک تو تمہیں بشارت سنانا ہے اور دوسرے وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ط تاکہ تمہارے دل اطمینان حاصل کریں ۔ اور تم کسی خوف میں مبتلا نہ ہو جاؤ ۔ جہاں تک نصرت غیبی کا تعلق ہے وہ تو منجانب اللہ ہی

ہوتی ہے ۔سورہ انفال میں موجود ہے اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر وحی نازل کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ۔اور ان کو حکم دیا فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہ اہل ایمان کے دلوں کو مضبوط کریں ۔مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ کے ملائکہ تو ویسے بھی مومنوں کے دلوں میں اچھے خیالات القا کرتے ہیں ۔جس طرح شیاطین دراندازی کر کے انسان کو برے کاموں کی ترغیب دیتے ہیں، اسی طرح رحمت کے فرشتے اچھے کاموں کی طرف ابھارتے ہیں ۔وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو بڑا زبردست اور حکمت والا ہے ۔اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اتار کر جو تمہاری مدد فرمائی وہ صرف تمہاری خوشی کے لئے کی اور اس لئے کہ اس سے تمہارے دلوں کو اطمینان نصیب ہو اور دشمن کی کثرت اور اپنی قِلّت سے تمہیں پریشانی اور بے قراری نہ ہو مسلمانوں کو ویسے ہی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حقیقی مدد اسباب سے نہیں بلکہ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی طرف سے ہوتی ہے لہٰذا چاہئے کہ بندہ صرف اَسباب پر نہیں بلکہ مُسَبِّبُ الاسباب پر نظر رکھے اور اسی پر توکل کرے ۔اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کی خوشی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے کہ ان کی خوشی کیلئے ان کی مدد کی گئی ۔اگر یہ بشارت نہ بھی اترتی جب بھی اہل ایمان کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ فتح ونصرت ہمیشہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ عزیز وغالب ہے جس کو چاہے فتح وغلبہ عطا فرمائے، اور حکیم بھی ہے اس وجہ سے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ جو ایسا زبردست ہے کہ ان اسباب کا محتاج نہیں لیکن اپنی تکوینی حکمت کے تحت ہر کام کو اس کے سبب سے متعلق فرماتا ہے ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے صاف اعلان فرما دیا ہے کہ حقیقت میں کارساز اور متصرف ومختار اللہ تعالیٰ ہی ہے ۔فتح وظفر اور امداد ونصرت نہ پیغمبر خدا ﷺ کے اختیار میں ہے اور نہ ہی فرشتوں کے ۔جنگ بدر اور جنگ احد کے واقعات ہمارے سامنے ہیں صحابہ کرام علیہم الرضوان کی مقدس جماعت مشرکین کے مقابلہ میں صف آرا ہے اور سید الانبیاء ﷺ کی بزرگ ترین ہستی بنفس نفیس ان میں موجود ہے ۔مگر اس کے باوجود وہ امداد خداوندی کے

محتاج ہیں۔ بدر میں ایک ہزار فرشتہ بالفعل امداد کے لیے میدان جنگ میں موجود ہے اور آٹھ ہزار آنے کے لیے حکم ربانی کے منتظر کھڑے ہیں۔ مگر ان سب کی حیثیت ظاہری سبب سے بڑھ کر کچھ نہیں اور حقیقی مؤثر اور ناصر ومددگار صرف اللہ ہے جل جلالہ۔

کفار کی ناکامی کا بنیادی سبب

لِيَقْطَعَ	تاکہ وہ کاٹ (ہلاک کر) دے	طَرَفًا	ایک گروہ کو
مِّنَ الَّذِيْنَ	اُن لوگوں میں سے جنہوں نے	كَفَرُوْٓا	کفر کیا
اَوْ يَكْبِتَهُمْ	یا انہیں ذلیل کرے	فَيَنْقَلِبُوْا	پھر وہ پھر جائیں
خَآئِبِيْنَ۔	نامراد ہو کر (127)		

فرمایا: لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا تاکہ کفار کی جمعیت میں سے ایک گروہ کو قطع کر دے۔ لِيَقْطَعَ میں لام نَصَرَكُمْ سے متعلق ہے۔ قطع کے معنی قتل کے ہیں اور طرف جماعت گروہ کے معنی میں ہے یعنی جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے تمہاری غیب سے امداد اس لیے فرمائی تاکہ کافروں کی ایک جماعت تمہارے ہاتھوں ماری جائے اور وہ ذلیل وخوار ہو جائیں اور نامراد ہو کر گھروں کو لوٹیں اور اس طرح کفر کا زور ٹوٹ جائے، ان کی کمر توڑ کر رکھ دے اور ان کے غرور کا سر نیچا کر دے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جنگ بدر میں ستر بڑے بڑے آئمۃ الکفر مارے گئے جن میں ان کا سرغنہ ابوجہل اور امیہ بھی شامل تھے۔ ایک گروہ تو مارا گیا، فرمایا اَوْ يَكْبِتَهُمْ یا ان کو ذلیل کر دے۔ چنانچہ ستر قتل ہوئے اور اتنی ہی تعداد میں قیدی بنا لیے گئے۔ جو کہ مشرکین مکہ کے لیے نہایت ہی ذلت ورسوائی کی بات تھی، ان قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ دینا پڑا۔ اور وہ ذلیل وخوار ہو کر رہ گئے۔ بڑے جوش وخروش کے ساتھ مکہ سے نکلے تھے۔ کہ مسلمانوں کو نیست ونابود کر دیں گے۔ مگر خود پس کر رہ گئے۔ جو باقی بچ گئے فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ وہ سخت ناکام ہو کر لوٹے۔ مکہ والے فتح کی خوشخبری سننے کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ کہ انہیں ذلت اور رسواکن شکست کی خبر سننا پڑی۔ اس آیت کریمہ میں اللہ غالب وکارفرما کی مدد کا نتیجہ بتلایا جا رہا ہے۔

غزوہ احد! مومنین کے لئے آزمائش

لَيۡسَ	نہیں ہے	لَكَ	آپ کے لیے	مِنَ الۡاَمۡرِ	اس معاملے میں		
شَیۡءٌ	کچھ(اختیار	اَوۡ يَتُوۡبَ	یا وہ متوجہ ہو(مہربانی سے)				
عَلَيۡهِمۡ	ان پر	اَوۡ يُعَذِّبَهُمۡ	یا وہ انہیں عذاب دے				
فَاِنَّهُمۡ	پھر بیشک وہ	ظٰلِمُوۡنَ	ظالم ہیں ۔(128)				

لَيۡسَ لَكَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ اَوۡ يَتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ اَوۡ يُعَذِّبَهُمۡ اے نبی آپ کا اس بات میں کچھ اختیار نہیں ۔اللہ چاہے تو انہیں معاف کر دے، چاہے تو عذاب دے ۔ہجرت کے چوتھے سال صفر کے مہینے میں سرکارِعالی وقار صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ستر قاری صحابہ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنۡہُم کو مکہ اور عسفان کے درمیان ایک جگہ بئر معونہ کی طرف بھیجا تا کہ وہاں لوگوں کو قرآنِ پاک اور دینی مسائل کی تعلیم دیں، عامر بن طفیل نے دھوکے سے انہیں شہید کر دیا، ان کافروں کے خلاف حضور سیدُ المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے بربادی کی دعا کا ارادہ فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو روک دیا، اس کے متعلق یہ آیتِ کریمہ اتری ۔(صاوی اٰل عمران، تحت الآیۃ:۱۲۸، ۱/ ۳۱۱-۳۱۲، مدارک اٰل عمران، تحت الآیۃ: ۱۲۸، ص ۱۸۴، ملتقطاً)

فَاِنَّهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ کیوں کہ بلا شبہ وہ ظالم ہیں ۔فرمادیا گیا کہ آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ان کیلئے کوئی دعا نہ کریں ۔ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ چاہے تو انہیں توبہ کی توفیق دے اور چاہے تو عذاب دے ۔ یہ حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی وہ مبارک تربیت ہے جو ربُّ العالمین عَزَّ وَجَلَّ نے خود فرمائی اور ہر جگہ اپنے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی کامل رہنمائی فرمائی ۔غزوۂ اُحد میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کر دیئے گئے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لہولہان ہو گئے، دندانِ مبارک شہید ہوا، خود کی کڑیاں رخسار مبارک میں گھس گئیں، اس موقعہ سے کچھ سرداران قریش ابوسفیان، حارث ابن ہشام، سہیل بن عمرو اور صفوان ابن امیہ وغیرہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بددعاء فرمائی، اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی، (بخاری

،کتاب التفسیر، حدیث نمبر ۴۵۵۹) یہ گویا آپ ﷺ کے لئے اور آپ ﷺ کے واسطہ سے تمام اُمت کے لئے تنبیہ ہے کہ دشمن گو بددعاء کے مستحق ہیں ؛لیکن پیغمبر اور داعیان دین کے لئے یہ بات زیبا نہیں کہ وہ ایسے نازک وقت میں بھی بددعاء کے لئے ہاتھ اُٹھائیں ؛ کیوں کہ ہدایت دینا اور ہدایت سے محروم رکھنا اللہ کے ہاتھ میں ہے، ممکن ہے اللہ ان کو ہدایت دے دیں، اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ نظام قدرت میں اللہ کے پیغمبروں اور رسولوں کو بھی کوئی دخل نہیں اور ہدایت وگمراہی صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

حاکمیت اور اختیارات

وَلِلّٰهِ	اور اللہ ہی کے لیے ہے	مَا	جو کچھ
فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں ہے	وَمَا	اور جو کچھ
فِي الْاَرْضِ	زمین میں ہے	يَغْفِرُ	وہ معاف کرتا ہے
لِمَنْ	جسے	يَّشَآءُ	چاہتا ہے
وَيُعَذِّبُ	اور عذاب دیتا ہے	مَنْ	جس کو
يَّشَآءُ	چاہتا ہے	وَاللّٰهُ	اور اللہ
غَفُوْرٌ	بہت بخشنے والا	رَّحِيْمٌ	نہایت رحم کرنے والا ہے۔(129)

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا ہے وہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ ہر چیز پر اسی کا تصرف ہے، ہر چیز کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس میں اسی کا تصرف چلتا ہے اور اسی کی تدبیر کارفرما ہے، یہ بھی اس کی ربوبیت کی نشانی ہے۔ دیکھیے تمام انسان اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کائنات اور انسان درحقیقت کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔ جب انسان اس دنیا میں آتا ہے، ننگا ہوتا ہے، تن پر کپڑا ہوتا ہے نہ پاؤں میں جوتا اور جب اس دنیا سے جاتا ہے تب بھی خالی ہاتھ، چند گز کپڑا اس کے جسم کو ڈھانپے ہوتا ہے تو کیسے کہا جائے کہ انسان کسی چیز کا مالک ہے؟ وہی تمام زمین وآسمان اور ان کی

ہر چیز کا اکیلا خالق اور مالک ہے۔ زندگی، موت، رزق اور تمام نعمتیں صرف اسی کے اختیار میں ہیں۔ وہ اپنی کائنات میں جیسے چاہے تصرف اور فیصلے کرتا ہے، اسے کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہونا پڑتا۔ ہر ہر مقام پر حکم اور حکومت اللہ جل شانہ کی ہے۔ آپ تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرنے والے ہیں۔ خدا کی خوشنودی کے کام انجام دینے والے ہیں۔ آپ دوسروں کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ وَيُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۹﴾ اور جسے چاہتا ہے سزا دے دیتا ہے۔ وہ بخش دینے والا اور نہایت رحم والا ہے۔ وہ جس کو چاہے سزا دے۔ آپ پر اس ضمن میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ دل برداشتہ ہو کر ان کے لیے بددعا نہ کریں، اللہ تعالیٰ بڑا ہی بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہ جس کو چاہے گا، توبہ کی توفیق دے کر اس کے لیے بخشش کے دروازے کھول دے گا۔

سود کی حرمت اور وبال/ نیکیوں میں سبقت کا قرآنی و نبوی تصور

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ
وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

سود حرام اور جہنم میں لے جانے والا کام ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ	اے (وہ) لوگو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو!
لَا تَاْكُلُوا	نہ کھاؤ تم	الرِّبٰوۤا	سود
اَضْعَافًا	دوگنا	مُّضٰعَفَةً	چوگنا ہوا (کرکے)
وَّاتَّقُوا اللّٰهَ	اور تم اللہ سے ڈرو	لَعَلَّكُمْ	تاکہ تم
تُفْلِحُوْنَ		فلاح پاؤ۔(130)	

ارشاد ہوتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ مت کھاؤ سود گنے پر دگنا۔ یہاں پر لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ مت کھاؤ سود دگنے پر دگنا۔ یہاں پر لَا تَاْكُلُوا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا معنی کھانا ہے۔ تو کیا سود

کھانا ہی حرام ہے اور اس کا لینا دینا جائز ہے؟ ہرگز نہیں۔ چونکہ کھانا ایک اہم چیز ہے اس لیے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ورنہ مراد لینا دینا ہی ہے۔ جس طرح کسی چیز کا کھانا حرام ہے اسی طرح اس کا پہننا بھی حرام ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ سود کی رقم سے خرید کردہ غلہ تو حرام ہو مگر اسی رقم سے لیا گیا کپڑا حلال ہو۔ سود خواہ کسی بھی شکل وصورت میں ہو، حرام ہی ہوگا۔ لہٰذا لَا تَاْكُلُوا سے مراد صرف کھانا ہی حرام نہیں ہوگا بلکہ سود کا استعمال ہر صورت میں حرام ہوگا۔ دوسری خاص چیز جو اس آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہے۔ وہ دگنے کی قید ہے کہ دگنے پر دگنا سود نہ کھاؤ۔ یہ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ اس لیے فرمایا کہ عربوں کا طریقہ یہ تھا، جو اَب بھی سود خواروں کے یہاں مروج ہے کہ وہ اصل رقم پر تو سود لیتے ہی تھے؛ لیکن اگر وقت پر رقم ادا نہ ہو پائی تو اصل رقم کے علاوہ بقایا سود پر بھی سود لیا کرتے تھے، مہلت دیتے جاتے اور سود در سود کا معاملہ کرتے جاتے، اس طرح سود اصل رقم سے بھی کئی گنا زیادہ ہو جاتا چنانچہ اس وقت سود در سود کی جو صورت مروج تھی، قرآن نے یہاں اس کا ذکر کیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر سود پر سود نہ لیا جائے اور اصل بقایا پر اکہرا سود لیا جائے تو یہ جائز ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے بقول یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کہا جائے کہ مسجد میں گالیاں مت بکو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسجد سے باہر گالی بکنے کی اجازت ہے، قرآن نے دوسری جگہ مطلق سود کی حرمت کا اعلان کیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے کہ اللہ نے تجارت کو حلال رکھا ہے اور سود کو حرام وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔ (البقرۃ: ۲۷۵) اسی کے متعلق فرمایا کہ اے ایمان والو! دگنا چوگنا سود مت کھاؤ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ سے ڈر جاؤ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ۔ چار شخص ایسے ہیں جن کے لیے اللہ پاک نے لازم کر دیا کہ انہیں جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ ہی وہ اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے؛ شرابی، سود خور، ناحق یتیم کا مال کھانے والا اور والدین کا نافرمان۔ (مکاشفۃ القلوب، ص 479) ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام علیہم الرضوان کو خطبہ دیا اور سود اور اس کی برائیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک ایسا درہم جسے آدمی بطور سود لیتا ہے اللہ کے ہاں 33 مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ برا ہے اور سب سے بڑا سود مسلمان کے مال میں سے کچھ لینا

ہے۔(مکاشفۃ القلوب،ص 481)سود کے جہاں اخروی نقصانات ہیں وہیں دنیاوی نقصانات بھی ہیں،سود سے مال میں برکت ختم ہو جاتی ہے آخر کار وہ تنگدستی کا شکار ہو جاتا ہے،معاشرے میں سودی آدمی کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔آئیے اس برے فعل سے جان چھڑائیے ہمت کیجیے توبہ کرلیں کہ سود دنیا میں تو ہمیں بظاہر فائدہ دے اور اس سے ہماری آخرت قبر وحشر خراب ہوں اللہ ناراض ہو دنیا کا یہ معمولی فائدہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام سے بڑھ کر تو نہیں جبکہ اس میں نہ دنیا کی بھلائی ہے نہ آخرت کی۔اسلام میں سود قطعی طور پر حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔اس کی حرمت قرآن مجید،احادیثِ مبارکہ اور اجماعِ امت سے قطعی طور پر ثابت ہے۔

قرآن کی سب سے زیادہ ڈرانے والی آیت

وَاتَّقُوا	اور ڈرو	النَّارَ	(اُس) آگ (سے)

الَّتِیۡ	وہ جو	اُعِدَّتۡ	تیار کی گئی ہے	لِلۡکٰفِرِیۡنَ	کافروں کے لیے

فرمایا: وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا: اس آیت میں ایمانداروں کو تہدید(دھمکی) ہے کہ سود وغیرہ جو چیزیں اللہ عَزَّ وَجَلَّ نے حرام فرمائی ہیں ان کو حلال نہ جانیں کیونکہ حرام قطعی کو حلال جاننا کفر ہے۔(خازن) یہ سود خوری پر وعید شدید ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ سود خوری کبیرہ گناہ ہے۔اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔کہ جہنم کی آگ بالذات کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔مگر اس آیت میں ایمان والوں کو ڈرایا گیا ہے۔کہ اس آگ سے بچ جائیں۔اس ضمن میں تفسیر مدارک والے لکھتے ہیں کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن میں سب سے زیادہ ڈراوے کی آیت ہے کیونکہ اس میں خدا کے محارم سے نہ بچنے والوں کو جہنم کے اس طبقہ میں عذاب دینے کی دھمکی دی گئی ہے جو دراصل کافروں کے لیے تیار کیا گیا ہے اور آگ سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام اعمال سیئہ سے بچا جائے جو عذاب نار کے موجب ہوں۔مقصد یہ ہے کہ اگر اہل ایمان بھی کافروں والے کام کریں گے،کفر،شرک،بدعت اور معاصی

میں مبتلا ہوں گے تو وہ بھی دوزخ کی آگ سے بچ نہیں سکیں گے۔

کامیابی کا اصل راز

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ	اور تم اطاعت کرو اللہ کی	وَالرَّسُوْلَ	اور رسول کی
لَعَلَّكُمْ	تا کہ تم (پر)	تُرْحَمُوْنَ	رحم کیا جائے۔(132)

آگے اہل ایمان کو دوزخ سے بچنے اور کامیابی حاصل کرنے کا راز بتایا جارہا ہے وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کرو لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝۱۳۲ تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ غزوہ احد میں اسی چیز کی کمی آ گئی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ آپ نے پچاس آدمیوں کے ایک دستہ کو پہاڑ کی چوٹی پر مقرر فرمایا تھا۔ اور واضح حکم دیا تھا کہ ہمیں فتح ہو یا شکست، تمہیں ہر صورت میں اس محاذ پر قائم رہنا ہے۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ جنگ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو رہا ہے۔ تو وہ مورچہ چھوڑ کر پہاڑ سے نیچے اتر آئے۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں یہی کوتاہی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو عظیم نقصان اٹھانا پڑا۔ لہٰذا اہل اسلام کو سمجھایا جارہا ہے۔ کہ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو ہمیشہ مقدم رکھنا۔ یہی کامیابی کا راز ہے اور اسی کی بدولت تم پر رحم کیا جائے گا۔ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم ماننا بھی فی الحقیقت خدا ہی کا حکم ماننا ہے کیونکہ اس نے حکم دیا ہے کہ ہم پیغمبر کا حکم مانیں اور ان کی پوری اطاعت کریں۔ جن احمقوں کو اطاعت اور عبادت میں فرق نظر نہ آیا وہ اطاعت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شرک کہنے لگے۔ چونکہ جنگ احد میں رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی تھی اس لئے آئندہ کے لئے ہوشیار کیا جاتا ہے۔ کہ خدا کی رحمت اور فلاح و کامیابی کی امید اسی وقت ہو سکتی ہے جب اللہ و رسول کے کہنے پر چلو گے۔

نیکیوں میں سبقت، ایمان کا تقاضہ

وَسَارِعُوْٓا	اور تم جلدی کرو	اِلٰى مَغْفِرَةٍ	بخشش کی طرف

مِّنْ رَّبِّكُمْ	اپنے رب کی	وَجَنَّةٍ	اور جنت (کی طرف)
عَرْضُهَا	(کہ) اس کا عرض ہے	السَّمٰوٰتُ	آسمان
وَالْاَرْضُ	اور زمین	اُعِدَّتْ	وہ تیار کی گئی ہے
لِلْمُتَّقِيْنَ	پرہیز گاروں کے لیے۔(133)		

فرمایا وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اور سبقت کرو، دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف، مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ اور اس کے رسول کا اتباع کرو گے، ایمان اور تقوی اختیار کرو گے، صبر کا دامن تھامے رکھو گے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے بخشش کی بشارت ہے۔ اور پھر بخشش کا نتیجہ ہوگا وَجَنَّةٍ کہ تمہیں جنت میں داخلے کا ٹکٹ مل جائیگا۔ اور وہ جنت ایسی ہوگی جسے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے باغ پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے جس جنت کا وعدہ فرمایا ہے عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وہ اتنی وسیع ہے کہ اس کا عرض یعنی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہوگی۔ یہاں پر آسمان و زمین کی مثال اس لیے دی گئی ہے۔ کہ انسانی ذہن میں زمین و آسمان سے وسیع کوئی چیز نہیں ہے۔ لہذا انہی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے۔ کہ اللہ رب العزت کی جنت آسمانوں اور زمین سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اس کے نیچے سے لے کر اوپر تک آٹھ طبقات ہیں اور سب سے بالائی طبقے کا نام جنت الفردوس ہے اس میں ہر طرح کی نعمتیں میسر ہوں گی۔ ایسی نعمتیں جو اس وقت انسانی ذہن میں نہیں آسکتیں۔ اور یہ سب کچھ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ ان متقیوں کے لیے ہے۔ جو اللہ کے احکام کی پابندی کرنے والے ہیں۔ لہذا اپنے اندر وہ صفات پیدا کرو، جو اللہ نے بیان فرمائی ہیں تاکہ تم جنت کے حقدار بن سکو۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت اور جہنم کے جو اوصاف قرآن و حدیث میں جس طرح مذکور ہیں اسی طرح ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے، خواہ ہماری عقل و ذہن کی رسائی ان تک نہ ہو، اور یہی نہیں، آخرت کے تمام معاملات کا یہی حال ہے۔

نیکی میں سبقت کرنے کے متعلق ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ

سَبْعًا یعنی سات چیزیں پیش آنے سے پہلے پہلے اچھے اعمال انجام دے لو، ورنہ پھر موقع نہیں ملے گا۔ وہ سات چیزیں کونسی ہیں۔ فرمایا: پہلی چیز هَلْ تَنْتَظِرُونَ إِلَّا فَقْرًا مُنْسِيًا تمہیں ایسے فقر کا انتظار ہے جو سب کچھ بھلا ڈالنے والا ہے؟ یعنی ایسا فقر لاحق ہو جائے جو سب کچھ فراموش کرا دے۔ ناداری کی حالت میں بعض اوقات انسان متفکر اور مغموم ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے نیکی کے کام بھول جاتے ہیں۔ ایسی حالت وارد ہونے سے پہلے نیکی میں سبقت حاصل کرلو فرمایا: دوسری چیز أَوْ غِنًى مُطْغِيًا، یا ایسی مالداری کا جو طغیانی و سرکشی پیدا کرنے والی ہے؟ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ ناداری کی حالت میں دین دار ہوتے ہیں جب مال آجاتا ہے۔ تو بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ اس لیے فرمایا ایسی دولت مندی آنے سے پہلے پہلے اچھے اعمال کرلو۔ تیسری چیز أَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا یا ایسی بیماری کا جو مفسد ہے (یعنی اطاعت الٰہی میں خلل ڈالنے والی) ہے؟ بیماری میں بھی انسان نیکی سے محروم ہو جاتا ہے فرمایا: چوتھی چیز أَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا یا ایسے بڑھاپے کا جو عقل کو کھو دینے والا ہے؟ ا۔ یا ایسا بڑھاپا آجائے جو انسان کو عقل وفہم سے عاری کر دے۔ اسی لیے ایسے بڑھاپے سے بھی پناہ مانگی گئی ہے جو انسان کے قویٰ کو کمزور کر دیتا ہے۔ فرمایا پانچویں چیز أَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا یا ایسی موت کا جو جلدی ہی آنے والی ہے؟۔ یا موت ہی آ کر انسان کا فیصلہ کر دے۔ پھر تو اعمال کی دنیا ختم ہوگئی۔ اب مزید نیکی کا کوئی موقع باقی نہیں فرمایا: چھٹی چیز أَوِ الدَّجَّالَ فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ یا اس دجال کا انتظار ہے جس کا انتظار سب سے برے غائب کا انتظار ہے؟ دجال کا ظہور ہوگا، تو بڑے فتنے برپا ہوں گے۔ لہٰذا اس کے ظہور سے پہلے نیکی کرلو فرمایا ساتویں چیز أَوِ السَّاعَةَ فَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ یا اس قیامت کا جو قیامت نہایت سخت اور کڑوی ہے"۔ اور قیامت تو بڑی کڑوی اور تلخ ہے۔ اس کے بعد تو ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ اور پھر حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ ان سات چیزوں کے ظہور سے پہلے پہلے نیکی میں سبقت کرلو، ورنہ پھر موقع نہیں ملے گا۔ یعنی ان اعمال و اخلاق کی طرف جھپٹو جو حسب وعدہ خداوندی اسکی بخشش اور جنت کا مستحق بناتے ہیں۔ چونکہ آدمی کے دماغ میں آسمان و

زمین کی وسعت سے زیادہ اور کوئی وسعت نہیں آسکتی تھی اس لئے سمجھانے کے لئے جنت کے عرض کو اسی سے تشبیہ دی گئی۔گویا بتلادیا کہ جنت کا عرض زیادہ سے زیادہ سمجھو پھر جب عرض اتنا ہے تو طول کا حال خدا جانے کیا کچھ ہوگا۔قرآن وحدیث میں اہلِ ایمان کو نیکیاں کرنے کی بار بار ترغیب دی گئی اور اس کے لیے مختلف اجر وثواب کا وعدہ کر کے اس کی رغبت پیدا کی گئی ہے۔لیکن اس سے بڑھ کر نیکیاں کرنے کے ساتھ ساتھ نیکیوں میں پہل کرنے، نیکی کرنے کے معاملے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور اس معاملے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی تلقین کے ساتھ ساتھ اس پر حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے۔اسلامی تاریخ کا اگر توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جس میں ہمارے معاشرے کا ہر فرد ہمیشہ نیک اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی فکر اور کوشش میں ہمیشہ لگا رہتا تھا اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کو اپنی ترقی کی معراج سمجھتا تھا، دنیا اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ان کی نظر میں پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی تھی۔(پرِ کاہ: نہایت ہلکی، بے حقیقت یا حقیر شے: مجازی معنوں میں یہ لفظ ایسی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کی کوئی وزن، اہمیت یا حقیقت نہ ہو) پس عقلمند وہ ہے جو نیکی کرنے کے معاملے سستی نہ دکھائے، نیکی کرنے میں پیچھے رہ جانے والوں سے مقابلہ کرنے کے بجائے نیکی میں سبقت کرنے والوں سے مقابلہ کرے۔وقت، صحت، جوانی، فراخی اور زندگی کو غنیمت جانتے ہوئے نیکی کرنے کا جو موقع ہاتھ آئے وہ کر گزرے۔آج ہم لوگ دنیا کی مادی اور فانی چیزوں میں تو ایک دوسرے کے مقابلے میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، لیکن کبھی ہم نے حرف غلط کے طور پر بھی یہ سوچا ہے کہ خیر وبھلائی اور دین کے کاموں میں بھی ہمیں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنی چاہیے۔

متقین کی خصوصیات اور اوصاف/ استغفار! گناہوں کا تریاق

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ
النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا
اَنۡفُسَهُمۡ ذَکَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ ۪ وَمَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ۟ۙ
وَلَمۡ یُصِرُّوۡا عَلٰی مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُهُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ
وَجَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ وَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۱۳۶﴾

اخلاق کے اعتبار سے تین درجات کا تذکرہ

اَلَّذِیۡنَ	وہ لوگ جو	یُنۡفِقُوۡنَ	خرچ کرتے ہیں
فِی السَّرَّآءِ	خوشی میں	وَالضَّرَّآءِ	اور سختی (میں)
وَالۡکٰظِمِیۡنَ	اور پی جانے والے ہیں	الۡغَیۡظَ	غصے کو
وَالۡعَافِیۡنَ	اور معاف کردینے والے ہیں	عَنِ النَّاسِ	لوگوں کو
وَاللّٰهُ	اور اللہ	یُحِبُّ	دوست رکھتا ہے
الۡمُحۡسِنِیۡنَ	احسان کرنے والوں کو۔(134)		

اس آیت میں متقین کی بعض صفات بیان فرمائی ہیں۔فرمایا ان کی پہلی صفت یہ ہے الَّذِیۡنَ

يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وہ خرچ کرتے ہیں خوشی کی حالت میں بھی اور تکلیف کی حالت میں بھی یہی چیز ہے۔ جو سود کی جڑ کو کاٹتی ہے۔ ایک طرف سود خور کسی غریب کی غربت سے فائدہ اٹھا کر قرضے پر سود در سود وصول کرتا ہے۔ اور دوسری طرف اہل ایمان ہیں کہ وہ ایسے غربا و مساکین پر ہمیشہ خرچ کرتے ہیں۔ وہ خود خواہ آسائش میں ہوں یا تکلیف میں مبتلا ہوں، ان کی طرف سے انفاق فی سبیل اللہ جاری رہتا ہے اور یہی وہ عالی اخلاق ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بخشش کا سبب ہے۔ متقین کی دوسری صفت ہے وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وہ غصے پر قابو پانے والے ہیں۔ یہ بھی بہت بڑی صفت ہے۔ بعض اوقات انسان غصے کی حالت میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کچھ کر بیٹھتا ہے۔ جس پر بعد میں ندامت اٹھانا پڑتی ہے۔ غصے کی حالت میں جوش انتقام میں مبتلا ہونے کی بجائے، اس پر قابو پالینا ہی اصل مردانگی ہے۔ فرمایا متقین کی تیسری صفت یہ ہے وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، مفسرین کرام نے حضرت علی بن حسین یعنی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے فرزند امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ آپ وضو فرما رہے تھے۔ لونڈی پانی ڈال رہی تھی۔ اتفاق سے لوٹے کا پانی آپ پر گر پڑا۔ آپ کے کپڑے بھیگ گئے۔ لونڈی کی غلطی تھی۔ جب اس نے آپ کو غصے کی حالت میں دیکھا تو اس کی زبان سے نکلا۔ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ یہ سن کر آپ غصے کو پی گئے اور فرمایا میں تم سے کوئی انتقام نہیں لوں گا۔ لونڈی صاحب علم تھی، کہنے لگی وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ یعنی مومنوں کی صفت تو یہ ہے کہ وہ نہ صرف غصے کو دبا دیتے ہیں بلکہ لوگوں کو معاف بھی کر دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا، جاؤ۔ میں نے تجھے معاف کیا۔ لونڈی نے مزید جرات کر کے آیت کا اگلا ٹکڑا پڑھ دیا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۳۴ اللہ اعلیٰ درجے کی نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا جا تو آزاد ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا نیکی ہو سکتی ہے۔ کہ لونڈی نے غلطی کی مگر آپ نے اس کے ساتھ انتہائی درجے کی نیکی کی۔ لہذا مسلمانوں کو چاہئے۔ کہ اپنے اندر ایسی صفات پیدا کریں جن کا تذکرہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف سود کی لعنت کو چھوڑ دینا چاہئے۔ جو انتہائی درجے کی بداخلاقی کا سبب

ہے۔الغرض !اخلاق کے اعتبار سے اس آیت میں تین درجات کا ذکر آیا ہے،اول: ''کاظمین'' جو غصہ پی جائیں،گویا غصہ تو ہو؛لیکن وہ اس کی بردباری پر غالب نہ ہونے پائے،دوسرے: ''عافین''،یعنی درگذر کرنے والے،جو زیادتی کرنے والوں اور غصہ کا سبب بننے والوں کو بالکل ہی معاف کردیں، غصہ نہ ظاہر ہو،نہ دل میں چھپا ہوا ہو،تیسرے: ''محسنین''،یعنی احسان و بھلائی کرنے والے،جو زیادتی کرنے والوں کے ساتھ مزید اچھا سلوک کرنے والے ہوں،گالیاں دینے والوں کو دعائیں دیں اور کانٹے بچھانے والوں پر پھول برسائیں۔

استغفار کی اہمیت وفضیلت

وَالَّذِيْنَ	اور وہ لوگ	اِذَا فَعَلُوْا	جب وہ کریں
فَاحِشَةً	کوئی بے حیائی	اَوْ ظَلَمُوْٓا	یا ظلم کریں
اَنْفُسَهُمْ	اپنے آپ پر	ذَكَرُوا اللّٰهَ	(تو) وہ اللہ کو یاد کریں
فَاسْتَغْفَرُوْا	پھر بخشش مانگیں	لِذُنُوْبِهِمْ	اپنے گناہوں کی
وَمَنْ	اور کون	يَّغْفِرُ	بخشتا ہے
الذُّنُوْبَ	گناہوں کو	اِلَّا اللّٰهُ	اللہ کے سوا
وَلَمْ	اور نہیں	يُصِرُّوْا	وہ اصرار کرتے
عَلٰى مَا	(اس) پر جو	فَعَلُوْا	انہوں نے کیا
وَهُمْ	اور حالانکہ	يَعْلَمُوْنَ	وہ جانتے ہیں۔(135)

ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اور وہ لوگ جو کوئی فحش بات کر گزرتے ہیں۔ اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یا انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔بعض مفسرین نے: فَاحِشَةً سے گناہ کبیرہ اور ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ سے ہر طرح کا گناہ مراد لیا ہے،بعض مفسرین کی رائے اس کے برعکس ہے، تیسری رائے ہے کہ: فَاحِشَةً سے لوگوں کے حقوق میں اور ''ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ'' میں اللہ کے حقوق میں کوتاہی مراد ہے۔(مفاتیح الغیب: ۴/۲۶۰) یعنی جب اپنی غلطی واضح

ہو جاتی ہے، تو ضد نہیں کرتے اور اسی عمل کے جاری رکھنے پر مُصر نہیں ہوتے۔

غرض ارتکاب گناہ کے بعد ذَكَرُوا اللّٰهَ وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ یاد کرنے کا مطلب اللہ کے حکم کی تعمیل کرنا، اس کی وعید سے ڈر جانا، اور اس کے جلال اور عظمت کو یاد کرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے گناہ کے ارتکاب پر سخت وعید فرمائی ہے، اس سے ڈر کر وہ اپنے کئے پر نادم ہو جاتے ہیں۔ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وہ بخشش مانگتے ہیں اپنے گناہوں کے لیے۔ اور یہ اچھی صفت ہے۔ آیت کے الفاظ سے صاف واضح ہے کہ پرہیزگار لوگ دیدہ دانستہ نہ کوئی برا کام کرتے ہیں اور نہ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں بلکہ سہواً بہ تقاضائے بشریت ان سے ایسے کام سرزد ہو جاتے ہیں اور جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے تو فوراً اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور معافی مانگنے لگتے ہیں اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ یقیناً معاف بھی کر دیتا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اگر اس برے کام یا غلطی کا اثر صرف اپنی ذات تک محدود ہو تو پھر اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ وہ یقیناً معاف فرما دے گا لیکن اگر اس کا اثر دوسروں کے حقوق پر پڑتا ہو تو اس کی تلافی کرنا یا اس شخص سے قصور معاف کروانا ضروری ہے اور یہ استغفار کی ایک اہم شرط ہے۔ ایک دوسری روایت میں حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ، وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ (سنن الترمذي، حديث:2499)" آدم کی تمام اولاد خطا کار ہے، اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں۔ سنن ابن ماجہ کی حدیث شریف میں آتا ہے التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ۔ گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ اچھے انسان کی یہی صفت ہے کہ وہ گناہ پر اصرار نہ کرے بلکہ معافی مانگ کر اللہ تعالیٰ کو راضی کر لے اسی میں انسان کی کامیابی ہے وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللّٰهُ اور کون ہے اللہ کے سوا جو گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ وہی مالک و مختار ہے۔ اس کی حکمت و قدرت میں کسی کو دخل نہیں۔ انسان گناہ کرتے ہیں۔ مگر وہ بھی غَفُورٌ الرَّحِيمُ ہے۔ معاف کرنے کے لیے اسے ایک بہانہ چاہئے وہ قادر مطلق ہے اسے کوئی نہیں پوچھ سکتا اتنے بڑے پاپی کو کیوں معاف کر دیا ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ ایسے گناہگاروں کو استغفار کرنے پر اس لیے معاف فرما

دیتا ہے وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا کہ وہ غلطی کر کے اس پر اصرار نہیں کرتے۔گناہ کر کے سچے دل سے معافی مانگ لیتے ہیں، پھر اس گناہ کے قریب نہیں جاتے۔اگر انسان معافی مانگ لے تو پھر کبیرہ گناہ بھی کچھ نہیں۔وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔اور اگر گناہ پر اصرار کرے گا تو پھر صغیرہ گناہ بھی پہاڑ بن جائے گا۔لہذا گناہ پر اصرار نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہمیشہ اصلاح کے لیے آمادہ رہنا چاہئے۔اور ہر وقت استغفار کرتے رہنا چاہئے۔استغفار کی مثال صابن کی ہے جس طرح صابن کپڑوں کی میل کچیل دور کر دیتا ہے، اسی طرح استغفار دلوں کو صاف کر دیتا ہے۔اسی لیے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ استغفار کو لازم پکڑو وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۝١٣٥ اور وہ جانتے بھی ہیں یعنی نیکی اور برائی میں تمیز کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ہر انسان اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔اس کے باوجود اگر غلطی پر اصرار کرتا ہے تو اس کے لیے تباہی ہے۔توبہ استغفار انسان کو نہ صرف اپنے ماضی کے گناہوں کی صفائی کی طرف مائل کرتا ہے بلکہ مستقبل میں بھلائی اور نیکی کے راستے کی رہنمائی بھی کرتا ہے قرآن وسنت میں استغفار کی بار بار تاکید کی گئی ہے تا کہ ہر انسان یہ سمجھے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا جائز نہیں، اور ہمیشہ امید کی روشنی میں اپنے اعمال کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔استغفار کی یہ تعلیمات ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ اللہ کی رحمت لامحدود اور برائیوں کے کفارہ کا بہترین ذریعہ ہے۔چاہے انسان کے گناہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، اللہ کی طرف رجوع، استغفار اور توبہ کی نعمت ہمیشہ موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ انسان استغفار کرے، مایوسی سے بچے اور اللہ کی رحمت اور مغفرت کی طرف دل لگا کر اپنی زندگی کو اللہ کی رضا کے مطابق ڈھالے۔

متقین کی اخروی جزا اور انعامات

اُولٰٓئِكَ	یہ لوگ	جَزَآؤُهُمۡ	ان کا بدلہ
مَّغۡفِرَةٌ	بخشش ہے	مِّنۡ رَّبِّهِمۡ	ان کے رب کی طرف سے
وَجَنّٰتٌ	اور باغات ہیں	تَجۡرِىۡ	بہتی ہیں
مِنۡ تَحۡتِهَا	اُن کے نیچے سے	الۡاَنۡهٰرُ	نہریں

خٰلِدِيْنَ	ہمیشہ رہیں گے	فِيْهَا	اس میں
وَنِعْمَ	اور اچھا	اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ	اجر ہے عمل کرنے والوں کا۔

فرمایا اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ایسے لوگوں کی جزا یہ ہے کہ ان کے لیے ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور بخشش ہے۔انہیں نجات کا پروانہ حاصل ہو جاتا ہے۔اور اس کے علاوہ ان کیلئے وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ باغات رہائش کے لیے قرینے سے سجائے ہوں گے۔ان میں ہر قسم کی آسائش اور پھلوں کی فراوانی ہوگی۔کامیاب لوگوں کا ٹھکانا وہاں عارضی نہیں ہوگا۔بلکہ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے،انہیں وہاں سے نکالا نہیں جائے گا۔اور فرمایا کہ قانون خداوندی یہی ہے وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ نیک اعمال کرنے والوں کے لیے یہ خوب اجر ہے۔عمل بہت بڑی چیز ہے۔ایمان اور عقیدے کی درستگی کے بعد فلاح کا دارومدار عمل پر ہے۔وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ہر ایک کو مرتبہ اس کے عمل کے مطابق ملے گا۔لہذا نیک اعمال کرنے والے عزت کے مقام میں پہنچیں گے،خدا تعالیٰ کی طرف سے بخشش اور معافی ملے گی اور وہ ہمیشہ کے لیے معزز اور پاکیزہ زندگی بسر کریں گے۔ یہ ان کی دائمی زندگی ہوگی اور اس کی نعمتیں بھی دائمی ہوں گی۔قرآن مجید کے مطابق متقین (پرہیزگاروں) کی جزا عظیم کامیابی،مقامِ امن اور جنت کی نعمتیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے متقین کے لیے جو انعامات اور جزا رکھی ہے اخروی جزا اور انعامات بڑی کامیابی (مفازاً) جہنم کی آگ سے نجات اور جنت کا حصول۔مقامِ امن: ایسا پرسکون اور محفوظ مقام جہاں کوئی خوف یا خطرہ نہ ہو۔باغات اور انگور: خوبصورت اور سرسبز باغات اور انگوروں کے نفاست والے درخت۔خالص شراب کے جام: ایسے پاکیزہ اور بھرے ہوئے جام جو سرور بخشیں گے مگر عقل کو نقصان نہیں دیں گے۔بہترین معاشرت: ہم عمر اور پاکیزہ ساتھی۔سکون کا ماحول: جنت میں کوئی بیہودہ،جھوٹی یا غلط بات سننے کو نہیں ملے گی۔رب کی رضا اور فضل: اللہ کا خاص انعام اور ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ۔

فلاح انسانیت کا اسلامی تصور/

وھن کیا ہے؟ اور اس کا علاج کیا ہے؟

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ ○ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ○

قَد خَلَت مِن قَبلِکُم سُنَنٌ فَسِیرُوا فِی الاَرضِ فَانظُرُوا کَیفَ کَانَ عَاقِبَۃُ
المُکَذِّبِینَ ﴿۱۳۷﴾ ھٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَھُدًی وَّمَوعِظَۃٌ لِّلمُتَّقِینَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَا تَھِنُوا وَلَا
تَحزَنُوا وَاَنتُمُ الاَعلَونَ اِن کُنتُم مُّؤمِنِینَ ﴿۱۳۹﴾ اِن یَّمسَسکُم قَرحٌ فَقَد مَسَّ
القَومَ قَرحٌ مِّثلُہٗ ط وَتِلکَ الاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَینَ النَّاسِ ج وَلِیَعلَمَ اللّٰہُ الَّذِینَ
اٰمَنُوا وَیَتَّخِذَ مِنکُم شُھَدَآءَ ط وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِینَ ﴿۱۴۰﴾

حوادثاتِ زمانہ سے عبرت حاصل کرنا مومن کی نشانی

قَد خَلَت	تحقیق گزر چکے	مِن قَبلِکُم	تم سے پہلے
سُنَنٌ	کئی واقعات	فَسِیرُوا	چنانچہ تم سیر کرو
فِی الاَرضِ	زمین میں	فَانظُرُوا	پھر دیکھو
کَیفَ کَانَ	کیسا ہوا	عَاقِبَۃُ	انجام
المُکَذِّبِینَ	جھٹلانے والوں کا۔(137)		

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سابقہ لوگوں کے جستہ جستہ واقعات بیان فرمائے ہیں تاکہ آئندہ

آنے والی نسلوں کو عبرت حاصل ہو۔اسی لیے فرمایاقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ تم سے پہلے بھی واقعات گزر چکے ہیں۔ان میں اہل ایمان اوران کو ملنے والے انعامات کاذکر ہے۔اور نافرمانوں کو ملنے والی سزاؤں کا بھی تذکرہ ہے۔یہاں اطاعت اورتوبہ کی ترغیب کے لیے پہلی امتوں کی تاریخ پرغوروفکر کاحکم دیاہے،تاکہ ان میں سے مطیع اورنافرمان کے احوال پرغورکرکے انسان اپنے لیے سامان عبرت حاصل کرے۔ سُنَنٌ کا مفرد "سُنَّةٌ" ہے اس کے معنی طریق مستقیم اوراس نمونے کے ہیں جس کی اتباع کی جاتی ہے۔یہ"فُعْلَةٌ" بمعنی"مَفْعُوْلَةٌ" ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فعل چونکہ مسلمان کے لیے نمونہ اورطریق مستقیم ہوتاہے،اس لیے اسے سنت کہتے ہیں۔ان واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے لیے فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ زمین میں چلو پھروفَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔قرآن پاک کے بیان کردہ واقعات کے عملی نشانات تمہیں جگہ جگہ ملیں گے۔آپ کو پتہ چلے گا کہ نافرمانوں کا کیا حشر ہوا،کوئی پانی میں غرق ہوئے، کچھ آگ میں جل گئے،بعض کو آندھی نے آ گھیرا اوربعض پر پتھروں کی بارش ہوئی یہ سب نشانات عبرت ہیں جو زمین میں سفر کرنے سے ملیں گے۔ لہذاعبرت کے لیے سفراختیارکرنااچھی بات کی علامت ہے۔

سیاحت کا تصوراورقرآن مجید میں

قرآن مجید ہدایت کاایساسرچشمہ ہے کہ جہاں سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے خالق وقادر ہونے اوراُس کے معبود برحق ہونے کی مختلف انداز میں راہنمائی ملتی ہے کہیں توانسان کواپنے نفس میں ڈوبنے کاحکم ملتاہے کہ: "وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" "اورخودتمہارے نفوس میں (بھی ہیں)،سوکیاتم دیکھتے نہیں ہو" (الذاریات:21) توکہیں انسان کوآفاق میں غوروفکر کرنے کاحکم ملتاہے: "سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ" "ابھی ہم انہیں دکھائیں گے اپنی آیتیں دنیا بھر میں" (حم السجدہ:53) مذکورہ آیات میں جہاں سیروسیاحت کاتصورملتاہے تووہاں سیرفی الارض کی مقصدیت بھی واضح ہورہی ہے کہ سیروسیاحت محض وقت گزارنے کیلئے یاکھیل کودکیلئے نہیں

ہونی چاہیے بلکہ با مقصد ہونی چاہیے یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ''سیرُ وْا فی الاَرضِ'' کا حکم دیا ہے اُس کو مقصد کے ساتھ بیان کیا ہے وہ مقصد عبرت، تدبر اور نصیحت ہے۔ سیر و سیاحت میں تدبر و عبرت مقصود ہونے کے ساتھ ساتھ یقین کی پختگی کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ کائنات بہت خوب صورت اور رنگین ہے اس میں بڑے دلکش نظارے اور مناظر ہیں کہیں صحرا و میدان ہیں تو کہیں دلکش پہاڑ اور وادیاں اور کہیں بہتے دریا و سمندر یہ تمام چیزیں اِس کائنات کے خالق و مالک اور اُس کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں تو جب انسان سیر و سیاحت کے ذریعے ان پُر کیف نظاروں کو دیکھتا ہے اور کائنات کے عجائب و غرائب اور زمین کے نشیب و فراز دیکھتا ہے تو اُس آدمی کا یقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر مزید پختہ ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ اے اللہ تو ہی اس کائنات کا خالق و مالک اور تیری ذات ہی ان دلفریب نظاروں کو پیدا کرنے پر قادر ہے کسی اور کی بس کی بات نہیں، اسی لیے تو اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: ''وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ'' ''زمین میں بھی یقین کرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں'' (الذاریات: 20) اگر ہم غور کریں تو سیر فی الارض میں تدبر اور یقین کی پختگی کے ساتھ اصلاح نفس اور ریاضت نفس کا راز بھی پوشیدہ ہے، سیر و سیاحت میں دینی اور روحانی فوائد کے ساتھ ساتھ جسمانی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں سیر و سیاحت سے انسان اپنے اندر فرحت و خوشی محسوس کرتا ہے بوریت ختم ہو جاتی ہے تو دل بہتر طریقے سے کام کرنے لگ جاتا ہے جسمانی اور دماغی تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں آدمی کو اپنے دینی اور دنیاوی کام بہتر طریقے سے کرنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے سیر و سیاحت آپ کی تخلیقی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے، قدرتی مناظر کی سیاحت آپ کے ذہن کے نئے دریچے کھول دیتی ہے اور آپ کی تخلیقی صلاحیت بہتر ہو جاتی ہے ہر روز نئے لوگوں سے ملنا اُن کی گفتگو اور کلام سننا، اُن کے کلچر کا مشاہدہ کرنا اور اُن کے تجربات سے فائدہ اُٹھانے سے آپ کی ذہنی استعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور دنیا کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ پرانے نشانات کے تحفظ کی آج بھی بعض صورتیں موجود ہیں۔ مگر ان سے مقصود عبرت حاصل کرنا نہیں بلکہ محض استعجاب ہے جو کہ پسندیدہ چیز نہیں۔

انگریزوں نے آثار قدیمہ کی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔ مگر کس مقصد کے لیے؟ محض یہ جاننے کے لیے کہ کس زمانے میں کونسا طرز زندگی پایا جاتا تھا، پرانے زمانے کی عمارات، اوزار، برتن، سکے وغیرہ اس زمانے کی تہذیب وثقافت کی حفاظت کے نام پر محفوظ کیے جاتے ہیں۔ پرانی مورتیوں اور مجسموں کو بحفاظت رکھا گیا ہے۔ اس سے انسانیت کی کیا خدمت ہوتی ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ انسانوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ دی جاتی، ان کے اذہان وقلوب کو زندہ کیا جاتا، مگر ایسا تو مقصود ہی نہیں ہے۔ سائنس کی ترویج وترقی کے لیے بیشمار دولت صرف کی جارہی ہے۔ مگر انسانیت کی حقیقی فلاح کے لیے اس کا عشر عشیر بھی خرچ نہیں جاتا۔ سائنس نے جہاں بہت سی سہولتیں فراہم کی ہیں وہاں بہت سی تباہی کے سامان بھی پیدا کیے ہیں۔ ایک طرف آسمانوں تک پرواز کی جارہی ہے اور دوسری طرف انسانوں کی تباہی کے لیے جدید ترین ہتھیار بھی ایجاد کیے جارہے ہیں۔

اسلام میں خدمت کا نہایت وسیع تصور

اسلام میں فلاح انسانیت کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کی بندگی اور کسی انسان کی مدد کو ایک درجے میں رکھا گیا ہے۔ اسی لیے اگر کوئی بیماری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ پائے تو ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھلانا مقرر کیا گیا ہے۔ گویا بھوکے کو کھانا کھلانا روزے جیسی عبادت میں شامل ہے۔ قرآن نے اس امت کو خیر امت قرار دیا اور اس کا سبب یہی بتایا کہ یہ امت صرف اپنے نفع کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کے نفع کے لیے پیدا کی گئی ہے کہ انھیں اچھے کاموں کی طرف بلائے اور برے کاموں سے بچائے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کا بہترین عمل کھانا کھلانا اور سلام کو رواج دینا ہے۔ جب ہم خدمت خلق کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے صرف مسلمانوں کی یا انسانوں کی خدمت ہی مراد نہیں ہوتی بلکہ پوری خلق خدا کی عبادت اس میں شامل ہے۔ اسلام میں خدمت کا نہایت وسیع تصور ہے۔ بہرحال زمین میں عبرت کے لیے سفر کرنا چاہیئے۔ تاکہ معلوم ہوسکے کہ اللہ کے احکام کو جھٹلانے والوں کا کیا حشر ہوا۔ اور اگر ہم بھی ان کے نقش قدم پر چلیں گے، تو ہمارا حشر بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا۔ عقل مند وہ ہتا ہے جو غیروں کے خطرناک

انجام سے عبرت حاصل کرکے اپنے کردار میں تبدیلی وسدھار لائے اور جو لوگ حوادثات زمانہ سے کچھ نہیں سیکھتے وہ مستقبل میں خود ہی عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔مسلمانوں کے لیے عظیم درس عبرت ہے جس کا بنیادی تقاضہ نہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے کردار کو سنواریں بلکہ خیر خواہانہ انداز میں اغیار کو بھی دعوت فکر وعمل دیں۔

ناصحانہ تنبیہات

هٰذَا بَيَانٌ	یہ بیان (وضاحت ہے)	لِّلنَّاسِ	لوگوں کے لیے
وَهُدًى	اور ہدایت	وَّمَوْعِظَةٌ	اور نصیحت ہے
لِّلۡمُتَّقِيۡنَ	پرہیزگاروں کے لیے۔(138)		

فرمایا هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ یہ عام لوگوں کے لیے بیان، وضاحت یا سٹیٹمنٹ ہے۔ان کو قانون قدرت بتلایا گیا ہے۔کہ فلاح وتقوی کا راستہ یہ ہے۔اور تکذیب کا راستہ وہ ہے وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۳۸﴾ اللہ کی یہ آیات متقین کے لیے ہدایت اور نصیحت کا ذریعہ ہیں۔اور متقین وہ ہیں جو کفر وشرک اور معاصی سے بچتے ہیں۔خدا کی عظمت اور جلال ہمیشہ ان کے سامنے ہوتا ہے۔وہ حدود شرع کی حفاظت کرتے ہیں، قرآن پاک سے یہی لوگ فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔یعنی عام لوگوں کے کان کھولنے کے لئے قرآن میں یہ مضامین بیان کئے جارہے ہیں جن کو سن کر خدا سے ڈرنے والے ہدایت ونصیحت حاصل کرتے ہیں۔وقت کی قدر: زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے، اسے ضائع نہ کریں۔کردار کی درستگی: ہمیشہ سچ بولیں اور اچھے اخلاق اپنائیں۔غفلت سے پرہیز: دنیا کی عارضی زندگی میں مگن ہوکر آخرت کو نہ بھولیں۔باقی جس کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو ناصحانہ تنبیہات سے کیا منتفع ہوسکتا ہے۔ناصحانہ تنبیہات سے مراد ایسی خیر خواہانہ اور اصلاحی باتیں ہیں جو انسان کو غفلت سے بیدار کرنے اور غلطیوں سے بچانے کے لیے کی جائیں۔اس کا مقصد انسان کو اچھے اور برے راستے سے باخبر کرنا ہوتا ہے۔

وہن کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

وَلَا تَهِنُوْا	اور نہ تم ہمت ہارو	وَلَا تَحْزَنُوْا	اور نہ تم غم کھاؤ
وَاَنْتُمُ	اور تم (ہی)	الْاَعْلَوْنَ	غالب رہو گے
اِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم	مُّؤْمِنِيْنَ	ایمان والے۔(139)

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (اے مسلمانو)! نہ تم سستی دکھانا اور نہ ہی غمزدہ ہونا۔ وھن، کے معنی ضعف کے ہیں۔ عام اس سے کہ یہ ضعف عمل کا ہو یا ارادے کا، جسم کا ہو یا کردار و اخلاق کا۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ علیہم الرضوان سے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ تم سیلاب کے خس و خاشاک کے مانند ہو جاؤ گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا۔ یارسول اللہ! ﷺ اس کا کیا سبب ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے اندر 'وہن' پیدا ہو جائے گا۔ لوگوں نے پوچھا۔ یارسول اللہ! ﷺ وہن کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا، حُبُّ الدُّنْيَا وَ كَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ، دنیا کی محبت اور موت کا ڈر، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عزم و حوصلہ اور عمل و ارادہ کی وہ پستی جو دنیا اور دنیا کی زندگی کی محبت اور موت کے خوف سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو راہ حق میں جہاد سے روکتی ہے وہ 'وہن' ہے۔ یعنی وہن کا لغوی معنی کمزوری، سستی اور ناتوانی ہے۔ اسلامی اصطلاح اور حدیثِ نبوی کی روشنی میں اس سے مراد" دنیا کی محبت اور موت کا خوف" ہے، جو انسان کے دل میں پیدا ہو کر اسے عمل اور ارادے کے لحاظ سے کمزور کر دیتا ہے۔ لغوی اور اصطلاحی مفہوم کمزوری: جسمانی یا دلی طور پر ناتواں ہو جانا۔ پستی: عمل، ہمت اور ارادے کا پست ہو جانا۔ دنیوی محبت: مال و دولت اور دنیا کی طرف شدید رغبت جو آخرت سے غافل کر دے۔ موت کا ڈر: موت اور جہاد سے گھبرانا۔ یہ حدیث اس لفظ کی بہترین تشریح ہے۔ یہاں بھی وَلَا تَهِنُوْا سے یہی مراد ہے کہ غزوہ احد میں جو افتاد تمہیں پیش آئی ہے اس سے مرعوب اور خوف زدہ ہو کر ہمت نہ ہار بیٹھو دیکھنا! سختیوں سے گھبرا کر دشمنان خدا کے مقابلہ میں نامردی اور سستی پاس نہ آنے پائے، پیش آمدہ حوادث و مصائب پر غمگین ہو کر بیٹھ رہنا مومن کا شیوہ نہیں۔ وہن سے مراد دنیا کی محبت اور موت سے نفرت ہے، جو مسلمانوں میں کمزوری اور بزدلی کی بنیادی وجہ بنتی ہے.اس کا نبوی علاج حب دنیا کو دل سے کم کرنا،

آخرت کی فکر اپنانا اور موت کو کثرت سے یاد کرنا ہے۔آخرت کی ترجیح: دنیا کو عارضی مسافر خانہ سمجھنا اور ہمیشہ رہنے والی آخرت کی تیاری کرنا۔موت کی یاد: موت کو کثرت سے یاد کرنا تاکہ دنیا کی رنگ رلیاں اور طمع کم ہو۔زہد وقناعت: دل سے مال و دولت کی ہوس کو نکال کر قناعت کا رویہ اختیار کرنا۔جہاد فی سبیل اللہ: اللہ کی راہ میں استقامت اور دین کی سربلندی کے لیے قربانی کا جذبہ پیدا کرنا۔ یاد رکھو آج بھی تم ہی معزز و سربلند ہو کہ حق کی حمایت میں تکلیفیں اٹھا رہے ہو اور جانیں دے رہے ہو اور یقینا آخری فتح بھی تمہاری ہے انجام کار تم ہی غالب ہو کر رہو گے۔بشرطیکہ ایمان و ایقان کے راستہ پر مستقیم رہو۔اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر کامل وثوق رکھتے ہوئے اطاعت رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔اس خدائی آواز نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا اور پژمردہ جسموں میں حیات تازہ پھونک دی۔نتیجہ یہ ہوا کہ کفار جو بظاہر غالب آچکے تھے، زخم خوردہ مجاہدین کے جوابی حملہ کی تاب نہ لاسکے۔اور سر پر پاؤں رکھ کر میدان سے بھاگے۔اس آیت میں یہ پیغام دیا گیا اور مسلمانوں کو حوصلہ دیا گیا ہے کہ عارضی تکلیفوں یا ناکامیوں سے گھبرا کر پست ہمت نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ سچے مومن حالات کی سختی سے کمزور نہیں پڑتے بلکہ عزم و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔

غزوہ میں شکست کی بعض حکمتیں

اِنْ	اگر	یَّمْسَسْکُمْ	تم کو پہنچے	قَرْحٌ	کوئی زخم
فَقَدْ	توتحقیق	مَسَّ	پہنچ چکا ہے	الْقَوْمَ	(اس کافر) قوم کو بھی
قَرْحٌ	زخم	مِّثْلُهٗ	اس جیسا	وَتِلْكَ	اور یہ
الْاَیَّامُ	ایام	نُدَاوِلُهَا	ہم اُن کو باری باری بدلتے رہتے ہیں		
بَیْنَ النَّاسِ	لوگوں کے درمیان	وَلِیَعْلَمَ	اور تاکہ جان لے		
اللّٰهُ	اللہ	الَّذِیْنَ	اُن لوگوں کو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے
وَیَتَّخِذَ	اور (تاکہ) بنائے	مِنْكُمْ	تم (میں) سے		
شُهَدَآءَ	(کچھ کو) شہید	وَاللّٰهُ	اور اللہ		

لَا يُحِبُّ	نہیں پسند کرتا	الظّٰلِمِيْنَ	ظالموں کو۔(140)

اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ۔ اگر تمہیں غزوہ احد میں زخم پہنچا ہے۔ بڑے بڑے عظیم المرتبت ستر صحابہ کرام علیہم الرضوان شہید ہوئے اور بہت سے زخمی بھی ہوئے ہیں۔ تو یہ کوئی ایسی تکلیف نہیں جو صرف تمہیں پہنچی ہے۔ اس قسم کا زخم کافروں کو تو پہلے ہی لگ چکا ہے فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ط جنگ بدر میں ان کے بھی ستر سرکردہ آدمی مارے گئے تھے اور اتنے ہی قیدی بنے۔ پھر ان کو فدیہ دینا پڑا اور بڑی ذلت اٹھانا پڑی۔ یاد رکھو! انسان کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مصلحت کے مطابق حالات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ج اور یہ (فتح و شکست وغیرہ کے) دن تو ہم لوگوں کے درمیان پھراتے رہتے ہیں۔ جنگ احد میں مسلمانوں کو سخت جانی نقصان پہنچا۔ یہود اور منافقین کے طعنے مزید دل دکھانے کا باعث بنے۔ منافق کہتے تھے کہ اگر آپ ﷺ سچے نبی ہوتے تو مسلمان یہ نقصان اور ہزیمت کی ذلت کیوں اٹھاتے وغیرہ۔ ان آیات میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ فتح و شکست تو ادلتی بدلتی چیز ہے، یہ حق اور ناحق کا معیار نہیں، آج اگر تم نے زخم کھایا ہے تو کل وہ جنگ بدر میں تمہارے ہاتھوں اسی قسم کا زخم کھا چکے ہیں اور خود اس جنگ کے شروع میں ان کے بہت سے آدمی مارے جا چکے ہیں، وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور اس لیے بھی کہ اللہ ان لوگوں کو جاننا چاہتا تھا جو سچے دل سے ایمان لائے ہیں، غزوہ احد کی وقتی شکست کی دوسری حکمت یہ ہے۔ وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ اور تاکہ تم میں شہید بنائے جو لوگ بوجہ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ ان کی انتہائی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں راہ حق میں جہاد کی سعادت نصیب کرے اور وہ بھی اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر کے مرتبہ شہادت پر فائز ہوں۔ چنانچہ ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت بھی عطا فرمائی۔ یہ بھی سراسر نفع کا سودا تھا۔ اس آیت میں شکستہ دل مسلمانوں کو ڈھارس بندھائی جا رہی ہے۔ پھر اس شکست کی بعض حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ خوشی اور غمی، فتح و شکست، کامرانی و

ناکامی، خوشحالی وتنگدستی ایسی چیزیں ہیں جولوگوں میں ہرکسی کوپیش آتی رہتی ہیں ۔اس لیے اگر مسلمانوں کو وقتی طور پرشکست ہوبھی گئی تو غمزدہ اور بددل ہونے کی کوئی وجہ نہیں ۔انہیں کافروں کی طرف دیکھنا چاہیئے جومیدان بدر میں بری طرح مار کھانے کے باوجود پھر سے نئے عزم کے ساتھ باطل کی حمایت میں لڑنے آ گئے ہیں ۔دوسری حکمت اس غزوہ میں یہ ہے کہ سچے مومنوں اور منافقوں میں امتیاز ہوجائے، جسے تم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو ۔فرمایا۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔محبوب خدا بننے کے لیے ایمان اور نیکی کی ضرورت ہے ۔ظالم لوگوں سے مراد وہی منافقوں کی جماعت ہے جوعبداللہ بن ابی کے ساتھ واپس چلی گئی تھی اور جس موقعہ پر مسلمانوں کوشکست ہوئی تو یہ لوگ مسلمانوں میں بددلی پھیلانے میں پیش پیش تھے ۔ شرک اورکفر کرنے والے اللہ کی نگاہ میں کبھی محبوب نہیں بن سکتے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے ۔ کہ اگرکسی وقت اہل اسلام کوشکست ہوجائے، ان پر غیرمسلم غالب آجائیں، تواس کا یہ مطلب نہیں ہوگا۔ کہ مسلمان اللہ کی نگاہ میں گر گئے ہیں ۔اور کافرمحبوب بن گئے ہیں ۔ایسا ہرگز نہیں ۔

مومنوں کا تزکیہ نفس/ صدق دل سے شہادت کی تمنا کرنے والے

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤١﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا
الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٢﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ
تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿١٤٣﴾

تزکیہ نفس کا مفہوم

وَلِيُمَحِّصَ	اور تا کہ پاک وصاف کر دے	اللّٰهُ	اللہ
الَّذِيْنَ	اُن لوگوں کو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے
وَيَمْحَقَ	اور مٹا دے	الْكٰفِرِيْنَ	کافروں کو،(141)

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی وقتی آزمائش کی تیسری حکمت یہ بیان فرمائی ہے وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو پاک کردے ان کا تزکیہ نفس کر دے۔تزکیہ نفس سے مراد انسان کا اپنے دل اور روح کو برے اخلاق، گناہوں اور برے خیالات سے پاک کرنا اور اللہ تعالیٰ کی محبت، تقویٰ اور اچھی عادتوں سے سنوارنا ہے۔ یہ مومن کی کامیابی اور باطنی سکون کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اصل پاکی تو روح اور جان کی پاکی ہوتی ہے۔عربی زبان میں تزکیہ کا مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشو ونما دینا اور اُس کو پروان چڑھانا ہے۔نفس کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر جو

غلط افکار ونظریات جڑ پکڑ گئے ہیں، ان کی جڑیں اکھاڑی جائیں، جاہلانہ عادات واخلاق نے اس کے اندر جو کجیاں اور ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں، ان کو درست اور ہموار کیا جائے، رسم ورواج کی پرستش نے اس کو بے حسی اور جمود کے جو روگ لگا رکھے ہیں ان کو دور کیا جائے (بے حسی سے مراد دل ودماغ کا احساس اور جذبات سے خالی ہونا ہے، جبکہ جمود کا مطلب حرکت، عمل اور فکری ارتقاء کا رک جانا یا منجمد ہو جانا ہے) فانی اور نفسانی لذتوں کی چاٹ نے اس پر جو پست ہمتی اور بزدلی طاری کر رکھی ہے، اس کا علاج کیا جائے؛ تاکہ اس کی آنکھیں کھل سکیں، اس کا دماغ سوچ سکے، اس کی ہمت ابھر سکے، اس کی عادتیں سنور سکیں اور وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق اپنی ذہنی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے اس بلند مرتبہ تک پہنچ سکے، جس مرتبہ تک پہنچنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر قابلیت رکھی ہے۔ تزکیہ کا عمل مختلف چیزوں پر مختلف شکلوں میں نمایاں ہوگا، مادی چیزوں پر یہ عمل کسی اور شکل میں نمایاں ہوگا اور معنوی چیزوں پر کسی اور صورت میں، لیکن یہ فرق محض ایک ظاہری فرق ہوگا، حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی فرق نہیں ہوگا، لفظ کے اندر صاف ستھرا بنانے، نشوونما دینے اور پروان چڑھانے کی جو روح ہے، وہ اس کے عمل میں ہر جگہ نمایاں رہے گی۔

نسمہ، حظیرۃ القدس کا بنیادی معنی ومفہوم

بہرحال فرمایا کفر واسلام کے درمیان جنگ وجدال کا ایک مقصد تو مومنوں کا تزکیہ ہے۔ اصل پاکی تو روح اور جان کی پاکی ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ اس کو نسمہ کہتے ہیں۔ نسمہ کا عربی لغت میں بنیادی معنی انسانی جان، روح، اور ہر جاندار مخلوق ہے۔ اس کے علاوہ اس کے دیگر تراجم میں ہلکی ہوا اور جسمانی طاقت بھی شامل ہیں۔ عربی زبان اور لغت کے اعتبار سے یہ لفظ انسان کی ذات یا کسی بھی ذی روح مخلوق کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تصوف یا فلسفہ کی اصطلاح میں اسے لطیف جسم یا" اورا" (Aura) کے معنی میں بھی دیکھا گیا ہے۔ شاہ اسماعیل نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب عبقات میں لکھا ہے کہ انسان کے نسمے کا پاک ہونا ضروری ہے۔ عبادت، ریاضت، ذکر واذکار اسی مقصد کے لیے کیے جاتے۔ خصوصاً عبادات میں نماز، روزہ، زکوۃ اور حج وغیرہ نسمہ کی پاکیزگی کا سبب بنتے ہیں۔

جہاد ایک اتنا بڑا عمل ہے۔جس کے ذریعے انسان اپنے جسم و جان تک کو راہ خدا میں لگا دیتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جہاد میں مومن کو لگنے والی ایک ٹھوکر یا اس کے جسم پر آنیوالی ایک ضرب اس کے نسمہ کو پاک کر کے اسے حظیرۃ القدس کا اہل بنا دیتی ہے (حظیرۃ القدس کا لغوی معنی ''پاکیزہ باڑ''، ''مقدس احاطہ'' اور اصطلاحی مفہوم'' عالم بالا کا مقدس مقام''، جنت یا وہ روحانی احاطہ ہے جہاں مقرب فرشتے اور پاک روحیں قیام کرتی ہیں، یہ عالم بالا (آسمانی دنیا) کا وہ خاص اور پاکیزہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے اور نیک روحیں جمع ہوتی ہیں) دشمن کی تلوار کا ایک وار حقوق العباد کے سوا اس کے تمام گناہوں کی معافی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔مقصد یہ کہ اہل ایمان کو تکلیف پہنچنے میں بھی اس کے لیے بہت سی فائدے کی چیزیں ہیں۔مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔کہ برصغیر میں مسلمانوں پر جب زوال آیا،تو وہ دل برداشتہ نہیں ہوئے،بلکہ انگریز جیسی جابر طاقت کے سامنے ڈٹ گئے،انہوں نے مسلمانوں کو ہر طریقے سے تنگ کیا،وہ طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا ہوئے۔مگر دین کا دامن تھامے رہے اور ایمان کی حقانیت پر حرف نہیں آنے دیا۔یہی وہ صفت ہے جس کے ذریعے انسان کا نسمہ پاک ہوتا ہے۔اور وہ بارگاہ خداوندی میں پہنچ کر اس کے فیضان سے مستفید ہوتا ہے۔

اور دوسرا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اس کے ذریعے وہ کافروں کو مٹاتا ہے۔کفر و اسلام کی بڑی جنگیں ہوئیں۔کبھی مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کبھی کفار کا پلہ بھاری رہا۔مگر حتمی نتیجہ کیا نکلا۔اللہ تعالیٰ نے کفر کو ایسا مٹایا کہ پورے عرب کو کافروں سے پاک کر دیا۔اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ مراکز اسلام بن گئے۔فتح مکہ کے دن حضور ﷺ نے فرمایا کہ آج کے بعد مکہ پر چڑھائی نہیں کی جائیگی۔بلکہ مکہ والے دیگر ممالک پر چڑھائی کریں گے۔چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا۔تھوڑے ہی عرصہ میں آدھی دنیا پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے جہاد کے ذریعے کفر کو ملیا میٹ کر دیا۔

جہاد اور صبر کا بہت گہرا تعلق

اَمْ حَسِبْتُمْ	کیا تم سمجھتے ہو؟	اَنْ تَدْخُلُوا	کہ تم داخل ہو جاؤ گے

الْجَنَّةَ	جنت میں	وَلَمَّا	حالانکہ ابھی نہیں
يَعْلَمِ اللّٰهُ	جانا اللہ نے	الَّذِيْنَ	اُن لوگوں کو جنہوں نے
جٰهَدُوْا	جہاد کیا	مِنْكُمْ	تم (میں) سے
وَيَعْلَمَ	اور (یہ کہ) وہ جان لے	الصّٰبِرِيْنَ	صبر کرنے والوں کو۔

اہل ایمان کی کامیابی کے لیے جہاد اور صبر بہترین ہتھیار ہیں۔جب تک انسان میں جذبہ قربانی پیدا نہ ہو، اس کے ایمان کی تکمیل ممکن نہیں۔اور پھر اگر تکلیف پہنچنے پر صبر کا دامن چھوڑ دے تو یہ بھی اس کے ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔آگے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں کی اہمیت تنبیہ کے انداز میں بیان فرمائی ہے کہ اے اہل اسلام اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کیا تم گمان رکھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ حالانکہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے تم میں سے مجاہدین کو ظاہر نہیں کیا۔جان کی بازی لگانے والوں کو پتہ تو جب چلے گا، جب جہاد کا موقع آئے گا۔جہاد کرنے والے لوگ اس وقت ظاہر ہوں گے، جب وہ دشمن کے مقابلے میں آئیں گے۔محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے سے جنت کا ٹکٹ نہیں مل جائے گا۔بلکہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کا موقع فراہم کر کے تمہیں آزمائیں گے، کہ وہ کون لوگ ہیں، جو جان کی بازی بھی لگا سکتے ہیں۔دوسرے مقام پر فرما وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ۔یعنی ہم تمہیں مختلف الانواع آزمائشوں میں ڈال کر دیکھیں گے کہ تم میں سے کون ہیں جو ان آزمائشوں پر پورا اترتے ہیں۔خوف اور بھوک برداشت کرنا پڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ مال و جان کی قربانی بھی دینا ہوگی۔فرمایا پہلی آزمائش تو یہ ہوگی کہ جہاد کے لیے کون تلوار لے کر میدان میں اترتا ہے۔اور پھر جب میدان جنگ میں تکلیف پہنچتی ہے۔تو یہ بھی دیکھنا ہے وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۴۲ کہ صبر کون کرتا ہے۔تکالیف و مصائب کو برداشت کرنے کی ہمت کس میں ہے۔اسی لیے فرمایا۔کہ تمہیں جنت میں داخلہ یونہی نہیں مل جائے گا۔ابھی تو ہم نے مجاہدین اور صبر کرنے والوں کو ظاہر ہی نہیں کیا۔یعنی

جنت کے جن اعلیٰ مقامات اور بلند درجات پر خدا تم کو پہنچانا چاہتا ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ بس یونہی آرام سے وہاں جا پہنچیں گے اور خدا تمہارا امتحان لیکر یہ نہ دیکھے گا کہ تم میں کتنے خدا کی راہ میں لڑنے والے اور کتنے لڑائی کے وقت ثابت قدم رہنے والے ہیں ایسا خیال نہ کرنا۔ مقامات عالیہ پر وہی لوگ فائز کئے جاتے ہیں جو خدا کے راستہ میں ہر طرح کی سختیاں جھیلنے اور قربانیاں پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔

شہادت کی تمنا

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	كُنْتُمْ	تھے تم
تَمَنَّوْنَ	تمنا کرتے	الْمَوْتَ	موت کی
مِنْ قَبْلِ	اس سے پہلے	اَنْ تَلْقَوْهُ	کہ تم اس سے دو چار ہو
فَقَدْ	پھر تحقیق	رَاَيْتُمُوْهُ	تم نے اُس کا مشاہدہ کیا
وَاَنْتُمْ	حالانکہ تم	تَنْظُرُوْنَ	دیکھ رہے تھے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یاد دلایا وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ تم موت آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے۔ جو لوگ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ ان کے جذبات بڑے تیز تھے۔ وہ دشمن سے دوبارہ ٹکر لینے کے لیے بیتاب رہتے تھے۔ اور خواہش کرتے تھے کہ جہاد کا موقع آئے تو انہیں بھی شہادت جیسا بلند مقام نصیب ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کرتے ہوئے عرض کیا تھا۔ حضور! ہم دین حق کی خدمت کرتے رہیں گے وَلَمْ نَفِرَ اور ہم نہیں بھاگیں گے۔ (یہ صحابہ کے اس قول کا حصہ ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بوقتِ بیعت یا جہاد میں کیا تھا کہ ہم حق کی راہ پر ڈٹے رہیں گے اور میدان سے پیٹھ نہیں پھیریں گے۔) یہاں تک کہ ہمیں موت آجائے۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے اللہ کے رسول سے جو وعدہ کیا تھا، اسے نبھا کر دکھایا۔ انہوں نے جہاد کے میدانوں میں وہ معرکے دکھائے جو ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ان کی فتوحات کا راز اس

بات میں مضمر تھا، کہ انہوں نے موت کا چیلنج قبول کرلیا تھا۔حضرت زبیر رضی اللہ عنہ معرکہ مصر میں شریک تھے۔جب قلعہ کا محاصرہ طول پکڑ گیا۔تو فرمایا اے لوگو! آؤ سب سے پہلے میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہوں۔مجھے ٹوکری میں ڈال کر رسی کے ذریعے قلعہ کے اندر اتار دو۔جب اندر پہنچ کر میں نعرہ تکبیر بلند کروں۔تو تم بھی باہر سے جواب دینا اللہ کو منظور ہوا تو ہم کامیاب ہوں گے۔چناچہ ایسا ہی کیا گیا۔حضرت زبیر کو اندر اتار دیا گیا، کچھ اور لوگ بھی دیوار پر چڑھ گئے۔آپ نے قلعہ میں داخل ہو کر تلوار چلانی شروع کر دی اور اندر سے دروازہ کھول دیا۔اسلامی فوج اندر داخل ہوگئی۔معرکے کا رن پڑا (رن پڑنا: شدید، خوں ریز لڑائی یا جنگ کا شروع ہونا اور گھمسان کا رن مچ جانا) اور قلعہ فتح ہو گیا، یہ ہیں وہ قربانیاں جن کے ذریعے مسلمانوں نے شجر اسلام کی آبیاری کی۔حضرت زبیر رضی اللہ عنہ یرموک کی لڑائی میں دشمن کی دو لاکھ کی تعداد کی فوج میں اکیلے گھس گئے تھے۔صفوں کو چیرتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے گئے۔بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے جسم کا کوئی حصہ زخموں سے خالی نہیں تھا۔کندھے پر اتنا بڑا زخم کا نشان تھا کہ اس کا کڑا بن گیا تھا جس میں بچے ہاتھ ڈال کر کھیلتے رہتے تھے۔غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یاد دلایا۔کہ تم جہاد اور شہادت کی تمنا کرتے تھے۔تو اب یہ موقع تمہیں فراہم کیا جا رہا ہے فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ۔ جسے تم نے دیکھ لیا ہے وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴿۱۴۳﴾ اور تم اسے اپنی آنکھوں کے سامنے تک رہے ہو۔لہذا اب جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔اور ہر قسم کی مشکلات کو سینے سے لگا لو۔آخر کار کامیابی تمہاری ہی ہوگی۔اللہ تعالیٰ ہمارے نیک اعمال میں اخلاص اور تقویٰ پیدا کرے۔نیز حق تعالیٰ ہم تمام کو تزکیۂ نفس، توبہ، استغفار اور کثرت ذکر کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین) اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ، وَكُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ۔

ازلی اور ابدی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مبارکہ

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ ○ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ○
وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ ۚ قَد خَلَت مِن قَبلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِن مَّاتَ اَو قُتِلَ
انقَلَبتُم عَلٰۤى اَعقَابِكُم ؕ وَمَن يَّنقَلِب عَلٰى عَقِبَيهِ فَلَن يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيــًٔا ؕ
وَسَيَجزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِينَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفسٍ اَن تَمُوتَ اِلَّا بِاِذنِ اللّٰهِ كِتٰبًا
مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَن يُّرِد ثَوَابَ الدُّنيَا نُؤتِهٖ مِنهَا ۚ وَمَن يُّرِد ثَوَابَ الاٰخِرَةِ نُؤتِهٖ
مِنهَا ۚ وَسَنَجزِى الشّٰكِرِينَ ﴿۱۴۵﴾

استقامت! راہ دین پر ثابت قدمی

وَمَا مُحَمَّدٌ	اور نہیں ہیں محمد	اِلَّا رَسُولٌ	مگر ایک رسول ہی
قَد خَلَت	تحقیق گزر چکے ہیں	مِن قَبلِهِ	ان سے پہلے (بھی)
الرُّسُلُ	کئی رسول	اَفَا۟ئِن	کیا پھر اگر
مَّاتَ	وہ وفات جائیں	اَو قُتِلَ	یا قتل کر دیئے جائیں
انقَلَبتُم	(تو) تم پھر جاؤ گے	عَلٰۤى اَعقَابِكُم	اپنی ایڑیوں پر
وَمَن يَّنقَلِب	اور جو کوئی پھر جائے	عَلٰى عَقِبَيهِ	اپنی ایڑیوں پر
فَلَن يَّضُرَّ	تو ہر گز نہیں وہ نقصان پہنچا سکے گا	اللّٰهَ	اللہ کو

شَیْـًٔا	کچھ بھی	وَسَیَجْزِی	اور عنقریب جزادے گا
اللّٰہُ	اللہ	الشّٰکِرِیْنَ	شکر کرنے والوں کو۔(144)

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ حضرت محمد ﷺ مگر اللہ کے رسول۔آپ رسول ہیں۔خود خدا تو نہیں جوازلی ابدی ہستی ہے۔بحیثیت رسول آپ کو بھی وہ آزمائشیں آسکتی ہیں جو آپ ﷺ سے پہلے رسولوں پر آئیں قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔اللہ کے بہت سے رسول طبعی موت کے ذریعے اپنے رب کی بارگاہ میں پہنچے اوران میں سے بہت سے کافروں کے ہاتھوں شہید بھی ہوئے۔اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ اگروہ وفات پاجائیں یاشہید ہوجائیں تو کیاتم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟(اسلام چھوڑ دوگے؟)اوراگرکوئی الٹے پاؤں پھر بھی جائے،یعنی رسول کی موت کے بعد مسلمانوں کا دین سے پلٹ جاناہرگز روانہیں۔نبی اور رسول کی زندگی بھی ایک نہ ایک دن ختم ہونے والی ہے۔اوروہ صرف خدا کی ذات ہے جوازلی،ابدی،حی اور قیوم ہے لہذا کسی ایسی متوقع صورت میں اہل ایمان کو بدل نہیں ہوناچاہئے۔فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْـًٔا ؕ وَسَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیْنَ﴿۱۴۴﴾ تواللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔اورشکر گزاروں کو اللہ تعالیٰ جلد ہی اچھا بدلہ عطا کرے گا۔

جنگ اُحد میں جب کافروں نے شور مچایا کہ محمد مصطفٰی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ شہید ہو گئے اور شیطان نے یہ جھوٹی اَفواہ مشہور کردی تو صحابۂ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کو بہت اِضطراب ہوااوران میں سے کچھ لوگ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے لیکن پھر جب ندا کی گئی کہ سرکارِعالی وقار صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ صحیح سلامت تشریف رکھتے ہیں تو صحابۂ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کی ایک جماعت واپس آگئی۔حضورِاقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے انہیں یوں بھاگ جانے پر ملامت کی تو اُنہوں نے عرض کیا: ہمارے ماں،باپ آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پر فدا ہوں ،آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی شہادت کی خبر سن کر ہمارے دِل ٹوٹ گئے اور ہم سے ٹھہرانہ گیا۔اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔(تفسیر کبیر اٰل عمران،تحت الآیۃ: ۱۴۴، ۳/۳۷۶)

جب غزوۂ اُحد میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ آپ ﷺ شہید کر دیئے گئے،اس خبر نے صحابہ علیہم

الرضوان کو بے قرار کر دیا، بعض ہتھیار پھینک کر بیٹھ رہے کہ اب مقابلہ کا کیا فائدہ؟ (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۲۲۱/۴) اللہ تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا کہ محمد رسول اللہ ﷺ بھی دوسرے انبیاء ورسل کی طرح ایک پیغمبر ہی ہیں، جیسے دوسرے انبیاء ورسل نے وفات پائی، آپ ﷺ پر بھی موت طاری ہوگی، جیسے بعض انبیاء علیہم السلام اعداء حق کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے، اسی طرح شہادت آپ کے مقام نبوت کے بھی خلاف نہیں، تو کیا اس کی وجہ سے تم لوگ دین حق کو چھوڑ دو گے اور اسلام کی نصرت وحمایت ترک کر دو گے؟ اگر تم نے ایسا کیا تو اس میں نقصان خود تمہارا ہی ہے، اللہ کا کوئی نقصان نہیں اور اگر استقامت کا ثبوت دو گے تو اس کا اجر وثواب پاؤ گے، یہ گویا اس بات کی تعلیم ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی ایک بشر اور انسان ہی ہیں اور ایک انسان جن حالات سے دو چار ہوتا ہے، آپ ﷺ پر بھی وہ حالات آسکتے ہیں، واضح رہے کہ اس آیت کے نزول کے ساڑھے سات سال بعد جب فی الواقعہ آپ کی وفات ہوگئی تو اس وقت مسلمانوں کو اتنا صدمہ ہوا کہ ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ دوسرے صحابہ علیہم الرضوان کا کیا ذکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے فقیہ اور مدبر صحابی کھڑے ہو کر تقریر کر رہے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ محمد ﷺ فوت ہو گئے ہیں میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اتنے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیٹھ جانے کو کہا۔ لیکن جوش خطابت میں انہوں نے اس بات پر کان ہی نہ دھرا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ الگ کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگے تو لوگ ادھر متوجہ ہو گئے۔ آپ نے اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: تم میں سے جو شخص محمد ﷺ کو پوجتا تھا تو وہ سمجھ لے کہ بلاشبہ محمد ﷺ وفات پا گئے اور جو شخص اللہ کو پوجتا تھا تو اللہ ہمیشہ زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ پھر آپ نے یہی آیت پڑھی (وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا لوگوں کو پتا نہیں تھا کہ اللہ نے یہ آیت بھی نازل فرمائی ہے۔ جب تک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت نہ پڑھی پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے

لوگوں نے یہ آیت سیکھی۔ پھر جسے دیکھو وہ یہی آیت پڑھ رہا تھا اور خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ اللہ کی قسم! مجھے یوں معلوم ہوا کہ میں نے یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تلاوت کرنے سے پہلے سنی ہی نہ تھی اور جب سنی تو سہم گیا۔ دہشت کے مارے میرے پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے میں زمین پر گر گیا اور جب میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ آیت پڑھتے سنا تب معلوم ہوا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی۔ (بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی) پھر اس بات پر بھی غور فرمائیے کہ یہ آیت غزوہ احد کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اور اسی طرح دوسرے صحابہ کرام علیہم الرضوان نے اسے سینکڑوں بار پڑھا بھی ہوگا۔ لیکن اس آیت کی صحیح سمجھ انہیں اس وقت آئی جب فی الواقع رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی۔ اس سے پہلے نہیں آئی اور یہی مفہوم ہے اللہ تعالیٰ کے قول (وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيْلُه کا۔ نیز اس سے لفظ تاویل کا صحیح مفہوم بھی سمجھا سکتا ہے۔ پھر جس وقت میدان احد میں بعض کمزور ایمان والوں نے سوچا کہ اسلام کو چھوڑ کر پہلے دین میں چلے جائیں، اسی طرح آپ کی وفات پر واقعی کئی عرب قبائل مرتد ہوگئے وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ دین اسلام کی ساری سربلندیاں آپ ﷺ کی ذات سے وابستہ ہیں۔ پھر جب آپ نہ رہے تو اسلام از خود مٹ جائے گا۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسے مرتدین سے جہاد کیا اور انہیں شکست فاش دی۔ ان میں سے کچھ مارے گئے اور باقی پھر سے دین اسلام پر قائم ہوگئے۔ گویا ان لوگوں نے اپنا ہی نقصان کیا۔ اسلام اللہ کے فضل سے سربلند رہا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ثابت قدم رہنے والوں کو اچھا بدلہ دے گا۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی حالت میں بھی بددل نہیں ہونا چاہئے۔ کسی بڑی سے بڑی ہستی کے فوت ہونے پر بھی جزع فزع نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ وہ بہرحال خدا کی مخلوق ہے اور اسے ایک نہ ایک وقت پر فوت ہونا ہے۔ دنیا میں کسی ہستی کو دوام نہیں۔ صرف ذات خداوندی ہمیشہ قائم و دائم ہے۔

مقررہ وقت پر انسان کی موت

وَمَا كَانَ	اور نہیں ہے (ممکن)	لِنَفْسٍ	کسی جان کے لیے

اَنْ	یہ کہ	تَمُوْتَ	وہ مرجائے	اِلَّا	مگر
بِاِذْنِ اللّٰهِ	اللہ ہی کے حکم کے ساتھ	كِتٰبًا	لکھا ہوا		
مُّؤَجَّلًا	ایک وقتِ مقررہ	وَمَنْ يُّرِدْ	اور جوکوئی چاہتا ہے		
ثَوَابَ	بدلہ	الدُّنْيَا	دنیا کا	نُؤْتِهٖ	(تو) ہم اسے دے دیتے ہیں
مِنْهَا	اس (میں) سے (کچھ)	وَمَنْ	اور جوکوئی		
يُّرِدْ	چاہتا ہے	ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ	ثواب آخرت کا		
نُؤْتِهٖ	(تو) ہم دے دیں گے اسے	مِنْهَا	اس میں سے		
وَسَنَجْزِي	اور عنقریب ہم جزادیں گے	الشّٰكِرِيْنَ	شکر گزاروں کو۔		

فرمایا وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کسی نفس کے لیے یہ بات نہیں ہے۔ کہ وہ مرے مگر اللہ کے حکم سے۔ ہر شخص کی موت اللہ کے حکم سے ہی واقع ہوگی۔ اور موت کیا ہے۔ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ ایک مقرر نوشتہ ہے۔ موت اپنے مقررہ وقت سے ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے نہیں آسکتی۔ اللہ تعالیٰ کے علم اور لوح محفوظ میں یہ چیز لکھی ہوئی ہے کہ فلاں شخص اتنی عمر پائیگا اور فلاں وقت میں فلاں بیماری یا فلاں حادثہ میں اس کی موت واقع ہوگی دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا (سورۃ المنافقون، آیت 11) اور جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اللہ اسے ہرگز مؤخر نہیں کرتا، اور اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔

اجل کا وقت مقرر ہے: اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان کی زندگی کے لیے ایک مقررہ وقت (اجل) اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر کوئی طاقت، مال، سفارش یا تدبیر اس کو ایک لمحہ بھی مؤخر نہیں کر سکتی۔ اللہ کی حکمت اور علم کامل اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے، انسان کے ہر عمل، نیت اور وقت کا بھی۔ اس لیے وہ جب کسی جان کو موت دیتا ہے، تو وہ نہ ناحق ہوتا ہے اور نہ قبل از وقت۔ مقصد یہ کہ جس طرح ایک عام امتی کی موت کا وقت مقرر ہے اسی طرح اللہ کے برگزیدہ انبیاء علیہم السلام بھی اپنے اپنے وقت پر داعی اجل کو لبیک کہتے رہے ہیں۔

مگر ان کا لایا ہوا دین قائم رہا ہے۔لہذا نبی کے بعد بھی اس کے دین پر ثابت قدم رہنا ضروری ہے۔اہل اسلام کو سمجھایا جا رہا ہے۔کہ دین کا دامن کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑنا۔

طلب دنیا یا طلب آخرت

فرمایا ہر شخص کے لیے اجر وثواب اس کی نیت اور ارادے کے مطابق ملتا ہے وَمَنۡ یُّرِدۡ ثَوَابَ الدُّنۡیَا جو شخص دنیا کا ارادہ کرتا ہے نُؤۡتِہٖ مِنۡہَا ۚ ہم اس کو دنیا میں سے ہی بدلہ دیتے ہیں۔ہاں یہ بات ہے کہ ہر مطلوبہ چیز مہیا نہیں کرتے بلکہ جتنا چاہتے ہیں اتنا دیتے ہیں۔سورہ بنی اسرائیل میں آتا ہے عَجَّلۡنَا لَہٗ فِیۡہَا مَا نَشَآءُ۔دنیا کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی منشاء ہے۔جتنا چاہے عطا کر دے۔برخلاف اس کے وَمَنۡ یُّرِدۡ ثَوَابَ الۡاٰخِرَۃِ جو کوئی آخرت کے ثواب کا طلبگار رہے نُؤۡتِہٖ مِنۡہَا ہم اسے آخرت میں سے بدلہ دیں گے۔ظاہر ہے کہ کوئی شخص دنیا کی خواہش کرتا ہے وہ غرض فانی کے لیے کرتا ہے، جو چند روز بعد ختم ہو جانے والی ہے اور جو کوئی آخرت کی خواہش کرتا ہے۔تو اس سے مراد خدا تعالیٰ کی رضا ہے، جو دائمی ہے آخرت کی خواہش کے ذریعہ سے ہی انسان اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔جس سے دین قائم ہوتا ہے۔اسلام کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔یہی چیز روحانی ترقی کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت و کامیابی کی دلیل ہے۔اس خواہش کا مقصد وحید یہ ہے کہ انسان حظیرۃ القدس کا ممبر بن جائے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جائے۔(مقصدِ وحید کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ" اصل مقصد، حقیقی مدعا، یا واحد نصب العین" ہے۔مقصدِ وحید" ایسے بنیادی اور حتمی ہدف کو کہا جاتا ہے جو انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہو، جس کے حصول کو وہ اپنی تمام تر تگ و دو کا مرکز بناتا ہو اور جس کے مقابلے میں باقی تمام مقاصد ثانوی حیثیت اختیار کر جائیں۔) فرمایا وَسَنَجۡزِی الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۴۵﴾۔ہم شکر ادا کرنے والوں کو پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔اور شکر گزاری یہ ہے۔کہ انسان ایمان، توحید، اطاعت اور فرمانبرداری کے کاموں پر ثابت قدم رہے۔یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔سب سے پہلی ثابت قدمی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام علیہم الرضوان کو حاصل ہوئی، جو براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض

یافتہ تھے۔ جوتھوڑی بہت کمزوریاں رہ گئی تھیں۔وہ بھی رفع ہوگئیں۔ان کی غلطیاں معاف ہوگئیں اور وہ لوگ مجموعی طور پر شکر گزار بن گئے۔یہی لوگ ایمان کی دولت کے محافظ تھے ایمان ہی ان کی سب سے قیمتی متاع تھی جسے انہوں نے آئندہ نسلوں کو منتقل کیا۔ایمان کے علاوہ باقی سب چیزیں فانی اور بے حقیقت ہیں۔

جہاد کی ترغیب

اس آیت میں جہاد کی ترغیب ہے اور مسلمانوں کو دشمن کے مقابلہ پر جری بنایا جارہا ہے کہ کوئی شخص بغیر حکمِ الٰہی کے مر نہیں سکتا، چاہے وہ کتنی ہی ہلاکت خیز لڑائی میں شرکت کرے اور کتنے ہی تباہ کن میدانِ جنگ میں داخل ہوجائے، جبکہ اس کے برعکس جب موت کا وقت آتا ہے تو کوئی تدبیر نہیں بچا سکتی خواہ وہ ہزاروں پہرے دار اور محافظ مقرر کرلے اور قلعوں میں جا چھپے کیونکہ ہر ایک کی موت کا وقت لکھا ہوا ہے، وہ وقت آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔تو پھر موت سے گھبرانے اور جہاد سے دل چرانے کے کیا معنیٰ؟ یہ کمزوری اور بزدلی کا مظاہرہ کرنے والوں کے حوصلوں میں اضافہ کرنے کے لئے کہا جارہا ہے کہ موت تو اپنے وقت پر آ کر رہے گی، پھر بھاگنے یا بزدلی دکھانے کا کیا فائدہ؟ اسی طرح محض دنیا طلب کرنے سے کچھ دنیا تو مل جاتی ہے لیکن آخرت میں کچھ نہیں ملے گا، اس کے برعکس آخرت کے طالبوں کو آخرت میں اخروی نعمتیں تو ملیں گی ہی، دنیا بھی اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرماتا ہے۔

جہاد کا تصور اسلام میں/ آزمائش کی گھڑی میں مسلمان ثابت قدم رہیں

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ
اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

جہاد انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت

وَكَاَيِّنْ	اور بہت سے	مِّنْ نَّبِيٍّ	نبی تھے	قٰتَلَ	لڑے
مَعَهٗ	ان کے ساتھ (مل کر)	رِبِّيُّوْنَ	اللہ والے	كَثِيْرٌ	بہت سے
فَمَا	پس نہ	وَهَنُوْا	وہ سست ہوئے	لِمَآ	اس وجہ سے
اَصَابَهُمْ	انہیں پہنچا	فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کے راستے میں		
وَمَا	اور نہ	ضَعُفُوْا	وہ کمزور ہی پڑے		

وَمَا اسْتَكَانُوْا	اور نہ وہ دبے	وَاللّٰهُ	اور اللہ
يُحِبُّ	پسند کرتا ہے	الصّٰبِرِيْنَ	صبر کرنے والوں کو۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ اور اللہ کے کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں۔جنہوں نے جنگ کی، اس حالت میں۔مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ کہ ان کے ساتھ کثیر تعداد میں رب والے یا اللہ والے بھی شامل تھے۔رِبِّيُّوْنَ یہ "رِبِّيٌّ" کی جمع ہے، جو رَبَّانِيٌّ کا ہم معنی ہے۔ (کشاف) ایک معنی اور بھی اہل علم نے کیا ہے کہ یہ "رِبَّةٌ کی طرف منسوب ہے، جس کا معنی کثیر جماعت ہے، یعنی ان کے ہمراہ بہت سی جماعتیں تھیں۔(قرطبی) اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے سابقہ انبیاء اور مجاہدین کی مثال دے کر اہل احد کو ہدایت فرمائی ہے کہ اگر تمہیں وقتی طور پر شکست کا حادثہ پیش آ بھی گیا تھا تو اس وقت بے صبری یا بے دلی کا مظاہرہ کرنا ایمان والوں کا شیوہ نہیں۔تم سے پہلے لوگوں پر اس سے زیادہ سختیاں آئیں۔لیکن انہوں نے بے صبری اور بے دلی کا قطعاً مظاہرہ نہیں کیا نہ ہی باطل کے آگے سرنگوں ہوئے۔مسلمانوں کو بتلانا یہ مقصود ہے۔کہ جہاد کا حکم صرف آخری امت کے لیے ہی مخصوص نہیں۔بلکہ سابقہ انبیاء کے لیے بھی جہاد کا حکم اسی طرح تھا، جس طرح نبی آخر الزماں ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام علیہم الرضوان کے لیے ہے۔حق اور باطل کی کشمکش ہمیشہ سے ہے۔لہٰذا ہر امت کے لیے جہاد کرنا ضروری رہا ہے۔اے مسلمانو تسلی رکھو کہ جہاد ہی میں تمہاری اور تمہارے دین کی بقا ہے۔جو قوم جہاد ترک کر دیتی ہے وہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جہاد صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمت ہی پر فرض نہیں ہے بلکہ پچھلی اُمتوں پر بھی فرض تھا اور انھوں نے اپنے اپنے عہد میں حق وسچائی کے دشمنوں کے ساتھ جہاد فرمایا ہے، بائبل تو جنگ کے واقعات سے پُر ہے ہی، دوسری مذہبی کتابوں میں بھی جنگ کے واقعات بہ کثرت موجود ہیں، ہندو خود کو 'اہنسا' اور 'عدم تشدد' کا علمبردار قرار دیتے ہیں؛ لیکن رامائن اور مہابھارت جنگی قصوں اور داستانوں کے سوا اور کیا ہے؟ دراصل حق کی حمایت اور ناحق کی مخالفت میں اٹھ کھڑا ہونا اور اس کے لئے ضرورت کے مطابق طاقت کا استعمال کرنا ایک پسندیدہ امر ہے نہ کہ

مذموم و ناپسندیدہ، ظلم سے پنجہ آزمانہ ہونا اور ظالم و مظلوم کے ساتھ ایک ہی سلوک روا رکھنا یقیناً مظلوم کے ساتھ زیادتی اور انصاف کا خون کرنے کے مترادف ہے، اس لئے جہاد اگر صحیح جذبہ سے ہو اور قانونِ شریعت کے دائرہ میں ہو تو ایک منصفانہ عمل ہے۔

"وَهْنٌ، ضُعْفٌ اور اِسْتِكَانَةٌ" کا مفہوم

فرمایا جن اللہ والوں نے نبیوں کے ساتھ مل کر جہاد کیا فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اللہ کے راستے میں انہیں جو بھی تکلیف پہنچی اس پر انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ ان لوگوں پر بڑی بڑی آزمائشیں آئیں، مال ضائع ہوا، گھر بار چھوڑنا پڑا، آدمی شہید ہوئے مگر ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آئی۔ دوسرے پارے میں ذکر آچکا ہے۔ کہ انہوں نے یوں کہا قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ ہم اللہ کے راستے میں کیوں جہاد نہ کریں جب کہ ہمیں ملک بدر کیا گیا۔ اور ہماری اولاد ہم سے چھین لی گئی۔ ہمارے بچوں کو غلام بنایا گیا اور ہماری بچیوں کو لونڈیاں بنالیا گیا۔ لہذا ہم ضرور دشمن کے ساتھ جہاد کریں گے جب اس عزم بالجزم کے ساتھ میدان جہاد میں اترے تو پھر کسی مشکل سے مشکل وقت میں بھی انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی وَمَا ضَعُفُوْا اور نہ وہ ضعیف یا سست ہوئے وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ اور نہ وہ دشمن کے سامنے مغلوب ہوئے۔ استکانت کا معنی پست ہوجانا، دب جانا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ استکانت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ انہوں زبان سے بھی کوئی ایسی بابت نہیں کی جس سے ان کی کمزوری یا پستی ظاہر ہوتی ہے۔ "وَهْنٌ، ضُعْفٌ اور اِسْتِكَانَةٌ" یہ تینوں لفظ قریب المعنی ہیں، کمزوری کے معنی میں یہ بالترتیب واقع ہوتے ہیں۔ "وَهْنٌ" دل سے ہمت ہارنا، "ضُعْفٌ" عام کمزوری اور "اِسْتِكَانَةٌ" دشمن کے سامنے عاجزی کا اظہار۔ ان تینوں آیتوں سے مقصود ان لوگوں پر عتاب اور تنبیہ ہے جو احد کے دن شکست کے آثار دیکھ کر ہمت ہار بیٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ سن کر بالکل ہی پست ہوگئے، پس فرمایا کہ تم سے پہلے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے متبعین گزر چکے ہیں، ان کی اتباع کرو اور اس قسم کی کمزوری

نہ دکھاؤ۔ (قرطبی۔ابن کثیر) یعنی یہ لوگ اپنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مل کر جہاد کرتے رہے، لیکن انھوں نے اپنی تعداد کی قلت اور بے سروسامانی کے باوجود کبھی ہمت نہیں ہاری اور نہ کبھی اپنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وفات پا جانے یا شہید ہو جانے کی صورت میں وسوسوں میں مبتلا ہوئے، بلکہ ہمیشہ اور ہر حال میں صبر واستقلال سے کام لیتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں پر عفو ودرگزر کی درخواست کرتے رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا وآخرت دونوں کے ثواب سے نواز دیا، بلکہ آخرت کے حسن ثواب سے اور احسان کا مرتبہ پالینے کی وجہ سے اپنی محبت بھی عطا فرمائی۔فرمایا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اہل اسلام کو سمجھایا جا رہا ہے کہ جس طرح ان لوگوں نے صبر کیا۔اسی طرح تم بھی مشکلات پر صبر کے ذریعے قابو پاؤ۔حضور ﷺ کی شہادت کی خبر پر دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے تھا بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنا چاہئے تھا۔ملت ابراہیمی میں صبر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔عبادات کی ادائیگی، اور مصائب ومشکلات اور نفسانی خواہشات کے مقابلہ کے لیے صبر ہی بہترین ذریعہ ہے۔الغرض! اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے سابقہ لوگوں کی مشکلات کا ذکر فرما کر اہل ایمان کو ثابت قدمی کی ترغیب دلائی۔اور نصیحت کی کہ ایسے اوقات میں کمزوری اور سستی دکھانے کی بجائے تعلق باللہ کو مضبوط بنانا چاہئے۔

مجاہدین کی جامع ترین دعائیں

وَمَا كَانَ	اور نہیں تھا	قَوْلَهُمْ	ان کا قول	اِلَّآ	مگر
اَنْ	یہی کہ	قَالُوْا	انہوں نے کہا	رَبَّنَا	اے ہمارے رب
اغْفِرْ لَنَا	بخش دے ہمیں	ذُنُوْبَنَا	ہمارے گناہ		
وَاِسْرَافَنَا	اور ہماری زیادتی	فِيْٓ اَمْرِنَا	ہمارے کام میں		
وَثَبِّتْ	اور ثابت رکھ	اَقْدَامَنَا	ہمارے قدموں کو		
وَانْصُرْنَا	اور ہماری مدد فرما	عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ	کافر قوم پر۔		

فرمایا صبر کے علاوہ مجاہدین کا دوسرا عمل ان کی دعا ہے۔ جب وہ میدان جہاد میں اترتے ہیں وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہوتی۔ وہ یوں کہتے ہیں رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ معاف فرما دے اللہ والوں کا ہمیشہ سے یہ شیوہ رہا ہے کہ جب میدان جنگ میں دشمن سے مقابلہ ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے پروردگار سے دعائیں کرتے ہیں۔ دعا اللہ سے تعلق کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کو مومن اور مجاہد کسی وقت ترک نہیں کرسکتا۔ دعا عبادت کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ خود حضور ﷺ انیس غزوات میں بنفس نفیس شریک ہوئے جن میں سے آٹھ غزوات میں بالفعل لڑائی ہوئی۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو یہی دعا سکھائی۔ اللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ سَرِيعَ الْحِسَابِ، اللّٰهُمَّ اهْزِمِ الأَحْزَابَ، اللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ "اے اللہ! کتاب کے نازل کرنے والے (قیامت کے دن) حساب بڑی سرعت سے لینے والے، اے اللہ! مشرکوں اور کفار کی جماعتوں کو (جو مسلمانوں کا استیصال کرنے آئی ہیں) شکست دے۔ اے اللہ! انہیں شکست دے اور انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دے۔" [صحيح البخاري/كتاب الجهاد والسير/ حديث:2933] فتح مکہ کے دن آپ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر فرمایا تھا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي صَدَقَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ اس خداوند قدوس کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اپنے بندے کی مدد فرمائی اور دشمنوں کو شکست دی، وہی اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ اس کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ آپ نے مجاہدین کو سکھایا کہ میدان جنگ میں جا کر یوں دعا کیا کرو۔ اللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا، وَآمِنْ رَوْعَاتِنَا۔ اے اللہ! خوف کی حالت میں ہمیں امن نصیب فرما۔ اور ہماری کمزوریوں کی پردہ پوشی فرما۔ جنگ کے موقع پر حضور نبی کریم ﷺ نے مختلف دعائیں صحابہ علیہم الرضوان کو سکھائیں تاہم جو دعا یہاں قرآن پاک نے بیان کی ہے، وہ بڑی اہم دعا ہے۔ فرمایا کہ مجاہدین کی زبان پر یہ دعا ہوتی ہے رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے۔ ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، جنگ احد میں تھوڑی سی کوتاہی ہوگئی تھی، اسی

لغزش کی معافی مانگی جا رہی ہے وَاِسۡرَافَنَا فِیۡۤ اَمۡرِنَا ہمارے معاملات میں جو زیادتیاں ہوئی ہیں۔ حدود اعتدال سے جو تجاوز ہوا ہے، ہم ان کی بھی معافی مانگتے ہیں وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا اور ہمارے قدموں کو مضبوط فرما۔ ان میں لغزش نہ آنے پائے۔ اور ہم تیرے دین کی سر بلندی کے لیے ڈٹے رہیں۔ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے جس طرح اہل ایمان کے قدموں کو مضبوط کیا اس کا ذکر سورہ انفال میں آتا ہے۔ وَیُثَبِّتَ بِهِ الۡاَقۡدَامَ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ وہ وقت یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان کی کیفیت طاری کر دی۔ تمہارے لیے آسمان کی طرف سے پانی اتارا تا کہ تمہیں پاک کرے، تم سے شیطان کی نجاست (شیطان کی وسوسہ اندازی) کو دور کرے۔ تمہاری ہمت بندھائے۔ اور اس کے ذریعے تمہارے قدم جمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر فرشتوں سے بھی کہا اَنِّیۡ مَعَکُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا میں تمہارے ساتھ ہوں، پس تم اہل ایمان کے قدم مضبوط کرو۔ مقصد یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے قدم مضبوط کر دے تو پھر کامیابی یقینی ہے۔ اور اگر خدا کسی قوم کے قدم اکھاڑ دے۔ تو کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ مجاہدین کی دعا کا چوتھا جزو ہے وَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۴۷﴾ اے اللہ! کافروں کی قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ کیونکہ ہم تو تیرے دین کی خاطر جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور کافر تیرے دین کی نافرمانی کا پیغام دنیا میں پہنچا رہے ہیں۔ ہم تیری اطاعت اور فرمانبرداری کو دنیا میں غالب کرنا چاہتے ہیں، ہم مدد کے مستحق ہیں، لہٰذا ہماری مدد فرما۔ مجاہدین کی اس دعا میں ہمارے لیے بھی تعلیم ہے کہ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور ایسی ہی دعا کرنی چاہیئے۔ جب بھی میدان جہاد میں اتریں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی دعائیں کریں۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے سابقہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے مجاہدین کا تذکرہ کر کے ہمارے لیے مشعل راہ قائم کر دی۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کرنے سے پہلے توبہ و استغفار کرنا آدابِ دعا میں سے ہے۔

دنیاو آخرت میں اجروثواب

فَاٰتٰىهُمُ	چنانچہ انہیں دیا	اللّٰهُ	اللہ نے
ثَوَابَ الدُّنْيَا	دنیا کا ثواب	وَحُسْنَ	اور اچھا
ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ	ثواب آخرت کا	وَاللّٰهُ	اور اللہ
يُحِبُّ	پسند کرتا ہے	الْمُحْسِنِيْنَ	احسان کرنے والوں کو۔

فرمایا جولوگ اپنے انبیاء علیہم السلام کی معیت میں جہاد کرنے والے تھے۔اور اس کے حضور دعائیں مانگنے والے تھے فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا انکو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا ثواب عطا کیا۔ یعنی انہیں دنیا میں فتح عطا کی، بلکہ وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ یعنی آخرت کا بہتر اجر بھی دیا اور یہ بہتر اجر اخروی کامیابی، نجات اور جنت میں داخلہ ہے۔وہ مجاہدین جو دین کی اشاعت اور کفر کو مغلوب کرنے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جہاد کی طرف چلتے ہیں۔یہ کوئی معمولی عمل نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ آخرت کا ثواب دنیا کے انعام سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ آخرت کے ثواب پر لفظ ''حُسْنَ'' زیادہ فرمایا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کی خدمت کرنے والے کو دنیا بھی ملتی ہے۔ یادرکھو وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ان سے محبت رکھتا ہے۔نیکی کے کاموں میں جہاد، دین کی اقامت، صبر، خدا کی فرمانبرداری، اطاعت رسول۔دنیا میں حدود اللہ کا اجرا، مصائب پر صبر، بلند ہمتی، اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہر وقت تیاری یہ سب باتیں شامل ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر و استقلال کے عوض اور ان کی دعاء وزاری کی بنا پر ان کو دنیا کی جزاء یعنی فتح ونصرت اور مال غنیمت بھی دی اور آخرت میں بھی ان کو اجر جزیل ثواب جمیل اور جنات نعیم عطا کرنے کا فیصلہ فرمایا اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے اخلاص نیت اور احسان عمل کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ مخلص اور محسن لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔

منافقین اور کفار کے ہتھکنڈے/مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ وارد الفاظ کا تاریخی پس منظر

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَرُدُّوْکُمْ عَلٰۤی اَعْقَابِکُمْ
فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰہُ مَوْلٰىکُمْ ج وَھُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِیْ فِیْ
قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَکُوْا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا ج
وَمَاْوٰىھُمُ النَّارُ ط وَبِئْسَ مَثْوَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۱﴾

مسلمانوں کے تنزل کی وجہ

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو		اٰمَنُوْۤا	ایمان لائے ہو!
اِنْ تُطِیْعُوا	اگر تم اطاعت کرو گے		الَّذِیْنَ	ان کی جنہوں نے
کَفَرُوْا	کفر کیا		یَرُدُّوْکُمْ	(تو) وہ پھیر دیں گے تم کو
عَلٰۤی اَعْقَابِکُمْ	اوپر تمہاری ایڑیوں کے (شرک کی طرف		فَتَنْقَلِبُوْا	پھر تم پلٹو گے
خٰسِرِیْنَ	خسارہ پانے والے ہو کر۔(149)			

ارشاد ہوتا ہے یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اے ایمان والو! اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اگر تم کافروں کی بات مانو گے اور منافق بھی کافروں میں شامل ہیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا یَرُدُّوْکُمْ عَلٰۤی

اَعۡقَابِكُمۡ کہ وہ تمہیں پلٹا دیں گے تمہاری ایڑیوں پر۔ مراد یہ کہ ان کی کوشش یہ ہوگی۔کہ وہ تمہیں دین حق سے دوبارہ جاہلیت کی طرف لے جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ﴿۱۴۹﴾ کہ تم سخت نقصان اٹھانے والے بن کر پلٹ جاؤ گے۔ مقصد یہ اپنے دین پر قائم رہو۔ ہر حالت میں دین کی حفاظت کرو۔ تمہیں وقتی طور پر فتح ہو یا شکست اپنے دین پر ہر صورت میں قائم رہو۔ اگر تم نے دین کے پاکیزہ نظریات کو ترک کر دیا، تو پھر کفر اور جہالت کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ اور یہ سب سے بڑا نقصان ہوگا۔ غزوہ احد کی عارضی سی شکست کے بعد کفار نے جن میں منافقین، یہود و نصاریٰ اور مشرکین سبھی شامل تھے، مسلمانوں کے دلوں میں مختلف قسم کے شکوک وشبہات پیدا کر کے انھیں اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی، اس پر حق تعالیٰ جل شانہ مسلمانوں کو خبردار کر رہا ہے کہ دشمن کا فریب مت کھاؤ اگر چکموں میں آؤ گے تو جس ظلمت سے خدا نے نکالا ہے پھر الٹے پاؤں اسی میں جا گرو گے اور رفتہ رفتہ دین حق کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ جس کا نتیجہ دنیا و آخرت کے خسارے کے سوا کچھ نہیں۔ پہلے اللہ والوں کی راہ پر چلنے کی ترغیب دی تھی۔ یہاں بد باطن شریروں کا کہا ماننے سے منع کیا تا کہ مسلمان ہوشیار رہیں، اور اپنا نفع نقصان سمجھ سکیں۔

اس وقت دنیا میں مسلمان جس تنزل کا شکار ہیں اس کی اسی فیصد وجہ کفار کی مداخلت ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے قوانین، سیاست، تجارت، تعلیم، ٹیکس وغیرہ میں دخیل ہیں۔ غیر مسلم کافر ہوں یا مشرک، یہودی ہوں یا نصرانی، کمیونسٹ ہوں یا دہریے وہ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدابیر کرتے ہیں۔ اپنے ملکوں میں تعلیم کے نام پر ایسے شاگرد بنا کر بھیجتے ہیں جو مسلمانوں کے نظریات کو جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیں۔ مقصد یہ کہ غیر مسلم لوگ مسلمانوں کو اپنے ہاں تعلیم دے کر ان کے بنیادی نظریات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور پھر انہی کے ہاتھوں ان کی قوم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ غیر مسلم طاقتیں اسلامی ممالک میں اپنے نظریات پھیلا رہی ہیں مگر مسلمانوں کی آج زبوں حالی یہ ہے کہ ان کی مرکزیت ختم ہو چکی ہے۔ رسوخ عقیدہ مفقود ہے۔ قرآن پر غور و تدبر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ قرآن پر غور و تدبر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ حضور ﷺ کی تعلیمات سے دلچسپی نہیں رہی۔ یہی

وجہ ہے کہ ہمارا دین اور اخلاق دونوں بگڑ چکے ہیں۔کفار ہمارے تمام معاملات میں دخیل ہیں۔ ترکی کے معاملات میں امریکہ دخل اندازی کر رہا ہے۔عرب اس کے مشورہ کے بغیر کوئی بات نہیں کر سکتے، ایڈوائزر وہاں سے آتے ہیں۔لہذا مسلمان ترقی کی بجائے تنزل کی طرف جارہے ہیں۔اللہ نے اس لیے خبردار کیا ہے کہ اگر ان کی بات مانو گے تو وہ تمہیں دوبارہ کفر کی طرف لے جائیں گے۔مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان خطرات کو محسوس کریں۔اپنے کام خود انجام دیں۔اور غیر مسلم اقوام کی مداخلت بند کریں ورنہ وہ کفار کے چنگل سے کبھی آزاد نہ ہو سکیں گے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو بہت واضح الفاظ میں سمجھایا گیا ہے کہ اگر تم کافروں کے کہنے پر چلو گے یا ان کے پیچھے چلو گے خواہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی یا منافق یا مشرک، جس کے کہنے پر بھی چلو گے وہ تمہیں کفر، بے دینی، بدعملی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف ہی لے کر جائیں گے اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم آخرت کے ساتھ ساتھ اپنی دنیا بھی تباہ کر بیٹھو گے۔کتنے واضح اور کھلے الفاظ میں فرمادیا کہ کافروں سے ہدایات لے کر چلو گے تو وہ تمہاری دنیا و آخرت تباہ کر دیں گے اور آج تک کا ساری دنیا میں مشاہدہ بھی یہی ہے لیکن حیرت ہے کہ ہم پھر بھی اپنا نظام چلانے میں، اپنے کردار میں، اپنے کلچر میں، اپنے گھریلو معاملات میں، اپنے کاروبار میں ہر جگہ کافروں کے کہنے پر اور ان کے طریقے پر ہی چل رہے ہیں، جس سے ہمارا ربّ کریم عَزَّ وَجَلَّ ہمیں بار بار منع فرمارہا ہے۔

لفظ مولیٰ کا قرآن و حدیث میں استعمال

بَلِ اللّٰهُ	بلکہ اللہ	مَوْلٰىكُمْ	تمہارا مددگار ہے	وَهُوَ	اور وہ
خَيْرُ	سب سے بہتر	النّٰصِرِيْنَ	مددگار ہے۔(150)		

فرمایا اغیار سے منہ موڑ کر صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ بلکہ اللہ ہی تمہارا مولا ہے۔لفظ مولیٰ عربی زبان کا ایک کلمہ ہے جو اپنے سیاق و سباق اور موقع محل کے اعتبار سے متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔لغت اور کلامِ عرب میں اس کے بنیادی اور اہم ترین معانی آقا، مالک، سردار، مددگار اور دوست ہیں۔اللہ تعالیٰ کے لیے: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کو بندوں کا

مولیٰ کہا گیا ہے جس کا مفہوم حقیقی کارساز، محافظ اور مددگار کا ہے۔ جیسے: نِعۡمَ الۡمَوۡلَی وَنِعۡمَ النَّصِیۡرُ۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کے لیے: یہ لفظ رسول اللہ ﷺ، فرشتوں اور مومنین کے لیے بھی بطورِ دوستی، محبت اور سرپرستی کے استعمال ہوا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے: حدیثِ غدیر مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوۡلَاہُ میں اس لفظ کا اطلاق حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی ہوا ہے، جہاں اہل تشیع کے نزدیک اس کا مفہوم صاحبِ اختیار و اولوہیت ہے جبکہ اہل سنت کے نزدیک اس سے مراد دوست، مددگار اور محبوب ہے۔ اس روایت کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ حجۃ الوداع سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف والی/ عامل بنا کر بھیجا۔ وہاں انہوں نے محصولات وصول کیے، ان کی تقسیم کی اور بیت المال کا حصہ ادا کرنے کے بعد حج کی ادائیگی کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے۔ اس موقع پر محصولات کی تقسیم کے حوالے سے بعض حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا اور یہ اعتراض براہِ راست نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ ﷺ نے ان حضرات کو انفرادی طور پر سمجھایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عمل کی تصویب فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ علی کا اس سے بھی زیادہ حق تھا۔ مزید برآں آپ ﷺ نے انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنے کا حکم دیا اور ان کے بارے میں دل میں کدورت یا میل رکھنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ ان حضرات کے دل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے صاف ہو گئے اور وہ خود بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے بعد ہمارے دلوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ محبوب ہو گئے۔ البتہ اسی حوالے سے کچھ باتیں سفرِ حج سے واپسی تک قافلے میں گردش کرتی رہیں۔ آپ ﷺ نے محسوس فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت اور ان کا حق مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ سفرِ حج سے واپسی پر مقام غدیرِ خم میں نبی کریم ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں بلیغ اور حکیمانہ اسلوب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق واضح فرمایا اور جن لوگوں کے دل میں کوئی شکوہ یا شبہ تھا اسے یوں دور فرمایا: اَللّٰھُمَّ مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوۡلَاہُ، اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنۡ وَالَاہُ، وَعَادِ مَنۡ عَادَاہُ حضراتِ شیخین سمیت تمام صحابہ کرام رضی اللہ

عنہم کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت پہلے سے موجود تھی، اور جن چند لوگوں کے دل میں کچھ شبہات تھے وہ بھی اس ارشاد کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت سے سرشار ہو گئے۔ اس خطبہ سے رسول اللہ ﷺ کا مقصود یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کے محبوب اور مقرب بندے ہیں۔ ان سے اور اہلِ بیت سے تعلق رکھنا ایمان کا تقاضا ہے، اور ان سے بغض، عداوت یا کدورت رکھنا ایمان کے منافی ہے۔ لغت اور شریعت میں "مولیٰ" کو امام یا خلیفہ کے معنی میں لینا ثابت نہیں نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موالات پر زور اس لیے دیا تاکہ لوگ ان سے بغض نہ رکھیں اور ان کی قدر و منزلت کو پہچانیں۔ یہ تاکید حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شرف اور مقام کو مزید واضح کرنے کے لیے تھی، نہ کہ خلافت کے اعلان کے لیے۔

بہر حال اس آیت میں مولیٰسے مراد مددگار ہے۔ خود اللہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا۔ اَنۡتَ مَوۡلٰىنَا۔ یہ لفظ حضور ﷺ کی ذات اقدس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ سیدنا اور مولانا۔ یعنی حضور ہمارے آقا، سردار اور راہنما ہیں تاہم اس مقام پر اہل اسلام کو تسلی دی کہ اغیار کی تمام تر سازشوں کے خلاف تمہارا مددگار اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ یقیناً تمہاری مدد کرے گا۔ وَهُوَ خَيۡرُ النّٰصِرِيۡنَ ﴿۱۵۰﴾ وہ بہتر مدد کرنے والا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اس کی وحدانیت پر صدق دل سے ایمان لاؤ۔ اس نے ہمیشہ اہل ایمان کی مدد فرمائی ہے۔ یعنی تم کفار کی اطاعت تو اس لیے کرو گے کہ وہ تمہاری کچھ مدد کریں، مگر یہ سراسر جہالت ہے، تمہارا مالک، حامی و ناصر تو اللہ تعالیٰ ہے، اس پر بھروسا رکھو گے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے "خَيۡرُ النّٰصِرِيۡنَ" محاورۂ کلام کے اعتبار سے ہے، ورنہ یہ معنی نہیں ہیں کہ کچھ اور ناصرین بھی ہیں جن میں سے اللہ تعالیٰ سب سے بہتر ہے۔ (کبیر) لہٰذا اسی کا کہنا ماننا چاہیے اور اسی کی مدد پر بھروسہ رکھنا چاہیے جس کی مدد پر خدا ہو اس کو کیا حاجت ہے کہ دشمنان خدا کی مدد کا منتظر رہے یا ان کے سامنے گردن اطاعت خم کرے۔

جب مسلمان، مسلمان رہے، ہمیشہ کفار ان سے خائف و مرعوب رہے

سَنُلۡقِىۡ	عنقریب ہم ڈالدیں گے	فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ	اُن لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے

كَفَرُوا	کفرکیا	الرُّعْبَ	رعب (یعنی ہیبت)
بِمَآ اَشْرَكُوْا	بسبب اُن کے شریک ٹھرانے کے	بِاللّٰهِ	اللہ کے ساتھ
مَا لَمْ	ان چیزوں کو کہ نہیں	يُنَزِّلْ	اتاری اُس نے	بِهٖ	اس کی
سُلْطٰنًا	کوئی دلیل	وَمَاْوٰىهُمُ	اوران کاٹھکانہ
النَّارُ	آگ ہے	وَبِئْسَ	اور (وہ) برا
مَثْوَى	ٹھکانہ ہے	الظّٰلِمِيْنَ	ظالموں کا۔(151)

اہل اسلام کی مزید تسلی کے لیے فرمایا: سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ہم کافروں کے دلوں میں عنقریب رعب ڈال دیں گے۔ جنگ احد کے موقع پر ایسا ہی ہوا۔ بظاہر کافروں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ بہت سے اکابر مسلمان شہید ہوئے۔ مگر پھر کافر وہاں ٹھہر نہ سکے۔ انہیں واپس ہی جانا پڑا۔ ایک موقع پر ابوسفیان کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ مسلمان تعداد میں تھوڑے سے تو تھے۔ ان میں سے شہید اور زخمی بھی ہوئے۔ مگر ہم پھر بھی واپس پلٹ رہے ہیں۔ واپس جا کر ان کا کام تمام کر دینا چاہئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ انہیں دوبارہ حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور واپس مکہ لوٹ گئے۔ البتہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے زخمی صحابہ علیہم الرضوان نے آٹھ میل تک کفار کا تعاقب کیا۔ فرمایا ان پر رعب اس لیے مسلط کر دیا۔ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ شریک بنائے ہیں۔ اور شرک سے ضعف پیدا ہوتا ہے۔ اور حمیت بھی ہو تو وہ حمیت جاہلیہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ تعصب اور عناد کی وجہ سے بہادری کا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں مگر عقل اور بصیرت سے خالی ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر مومن کو وقتی طور پر تکلیف بھی پہنچے تو وہ بصیرت اور سمجھ پر ہوتا ہے۔ کافر اندھے ہوتے ہیں۔ ان میں وہن اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ توہمات کے پرستار ہوتے ہیں۔ مشرکین کا حال دیکھ لیں۔ ذرا ذرا سی بات پر شگون لیتے ہیں۔ وہ خود اعتمادی سے عاری ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ ضعف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ فرمایا یہ لوگ جس شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ ایسا ہے مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ

سُلۡطٰنًا ۚ جس کی اللہ نے کوئی سند یا دلیل نہیں اتاری، سلطان کا معنی غلبہ برہان، دلیل وغیرہ ہے۔صاحب اقتدار کو بھی سلطان کہتے ہیں یعنی طاقت اور قوت والا۔ بہرحال یہاں سلطان کا معنی دلیل ہے کہ مشرکین کے پاس شرک کی کوئی دلیل نہیں بلکہ محض اپنے دادا یا باپ یا قوم کی اندھی تقلید ہے جس پر یہ لوگ مصر ہیں اسکے برخلاف کفر کی تردید میں ہزاروں دلائل موجود ہیں۔ان میں عقلی، نقلی، کتابی، سمعی، بصری ہر قسم کے دلائل موجود ہیں۔انسان ذرا سا غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ایک پتہ ہی لے لیں یا گھاس کے ایک تنکے کی تخلیق پر غور کریں تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سمجھ میں آجائیگی اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر قطعی طور پر فرمادیا۔ وَمَاۡوٰىهُمُ النَّارُ ؕ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ کی آگ ہے۔اور یاد رکھو! وَبِئۡسَ مَثۡوَى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۵۱﴾ ظالموں کا ٹھکانا بہت برا ہے۔کفر شرک کرنے والے سب سے بڑھ کر ظالم ہیں اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۳﴾ شرک ظلم عظیم ہے۔ یہ اول درجے کا ظلم ہے۔اس کے بعد حقوق ضائع کرنے والے۔اور لوگوں کی جان و مال کے تلف کنندہ دوسرے درجے کے مجرم ہوں گے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے سب سے بڑے مجرم ہیں۔ان کا اعتقاد فاسد ہے۔اسی لئے جب تک مسلمان، مسلمان رہے، ہمیشہ کفار ان سے خائف و مرعوب رہے۔بلکہ ہم آج تک مشاہدہ کرتے ہیں کہ باوجود مسلمانوں کے سخت انتشار و تشتّت اور ضعف و تنزل کے۔دنیا کی تمام کافر طاقتیں اس سوئے ہوئے زخمی شیر سے ڈرتی رہتی ہیں۔اور ہمیشہ فکر رکھتی ہیں کہ یہ قوم بیدار ہونے نہ پائے۔علمی اور مذہبی مناظروں میں بھی اسلام کا یہی رعب مشاہدہ کیا جاتا ہے۔حدیث میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میرا رعب ایک مہینہ کی مسافت سے دشمنوں کے دل میں ڈال دیا جاتا ہے بیشک اسی کا اثر ہے جو امت مسلمہ کو ملا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گستاخی سنگین گناہ اور عظیم جرم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ
فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا
وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا
عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي اَحَدٍ
وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا
فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عقیدت ومحبت

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	صَدَقَكُمُ	سچا کر دکھایا تمہیں
اللّٰهُ	اللہ نے	وَعْدَهٗٓ	اپنا وعدہ
اِذْ	جب	تَحُسُّوْنَهُمْ	تم قتل کرنے لگے انہیں
بِاِذْنِهٖ	اس کے حکم سے	حَتّٰٓى	یہاں تک کہ
اِذَا	جب	فَشِلْتُمْ	تم پست ہمت ہو گئے
وَتَنَازَعْتُمْ	اور تم نے باہم جھگڑا کیا	فِي الْاَمْرِ	حکمِ (رسول) میں

وَعَصَيْتُمْ	اور تم نے نافرمانی کی	مِّنْ بَعْدِ	بعد اس کے کہ
مَآ اَرٰىكُمْ	اُس نے تم کو دکھلایا	مَّا تُحِبُّوْنَ	(وہ) جو تم پسند کرتے تھے
مِنْكُمْ	تم میں سے (بعض)	مَّنْ	(وہ ہیں) جو
يُّرِيْدُ	ارادہ کرتے تھے	الدُّنْيَا	دنیا کا
وَمِنْكُمْ	اور تم میں سے (بعض)	مَّنْ	(وہ ہیں) جو
يُّرِيْدُ	ارادہ کرتے تھے	الْاٰخِرَةَ	آخرت کا
ثُمَّ	پھر	صَرَفَكُمْ	اُس (اللہ نے) تمہیں پھیر دیا
عَنْهُمْ	ان (کافروں) سے	لِيَبْتَلِيَكُمْ	تا کہ وہ تمہیں آزمائے
وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	عَفَا	اُس نے معاف کر دیا
عَنْكُمْ	تم کو	وَاللّٰهُ	اور اللہ
ذُوْ فَضْلٍ	فضل کرنے والا ہے	عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ	مومنوں پر۔

فرمایا: وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ اور البتہ تحقیق اللہ نے تمہارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا۔ جب کہ تم ان (دشمنوں) کو کاٹ رہے تھے اللہ کے حکم سے۔اس سے مراد فتح ونصرت کا وہ عام وعدہ ہے جو اہل اسلام کے لئے اور اس کے رسول کی طرف سے بہت پہلے سے کیا جا چکا تھا۔ حتیٰ کہ بعض آیتیں مکہ میں نازل ہو چکی تھیں۔اور اس کے مطابق ابتدائے جنگ میں مسلمان غالب وفاتح رہے جس کی طرف اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ سے اشارہ کیا گیا ہے حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ یہاں تک کہ جب تم نے پست ہمتی اختیار کی اور کام میں جھگڑنے لگے اور نافرمانی کی۔اس تنازع اور عصیان سے مراد تیر اندازوں کا وہ اختلاف ہے جو فتح وغلبہ دیکھ کر ان کے اندر واقع ہوا اور جس کی وجہ سے کافروں کو پلٹ کر دوبارہ حملہ آور ہونے کا موقع ملا مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی، جسے تم پسند کرتے ہو۔اس سے مراد وہ فتح ہے جو ابتدا میں مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔ یہ

آیت بھی غزوۂ احد ہی سے متعلق ہے کہ اللہ نے اپنی فتح ونصرت کا وعدہ اس غزوہ میں بھی پورا کردیا تھا اور ابتدائی مرحلہ میں مسلمان ہی فتح مند ہوئے تھے؛لیکن رسول اللہ ﷺ نے تیر اندازوں کو اپنی جگہ جمے رہنے کا جو حکم فرمایا تھا، تیر انداز دستہ کے لوگ اختلاف کرنے لگے،بعض کا خیال تھا کہ ابھی یہ حکم باقی ہے اور بعض حضرات کی رائے تھی کہ جہاد ختم ہو چکا اور مسلمان فتح مند ہو چکے؛اس لئے اب یہ حکم باقی نہیں رہا،(قرطبی:۴/۲۳۳) اس اجتہادی غلطی اور نادانستہ لغزش پر اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو آزمائش میں مبتلا کیا گیا،یہ ایک طرف مسلمانوں کی سرزنش تھی اور دوسری طرف اس میں یہ مصلحت تھی کہ مخلص اور منافق کی اچھی طرح پہچان ہو جائے''مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ تمہاری پسند کی چیز سے وہی ابتدائی فتح مراد ہے مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا تم میں سے بعض وہ ہیں جو دنیا کا ارادہ کرتے ہیں ۔یعنی مال غنیمت ،جس کے لئے انہوں نے وہ پہاڑی چھوڑ دی جس کے نہ چھوڑنے کی انہیں تاکید کی گئی تھی ۔وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ اور بعض وہ ہیں جو آخرت کا ارادہ کرتے ہیں ۔وہ لوگ ہیں جنہوں نے مورچہ چھوڑنے سے منع کیا اور نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق اسی جگہ ڈٹے رہنے کا عزم ظاہر کیا ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ پھر پھیر دیا تم کو ان سے تا کہ تم کو آزمائش میں ڈالے ۔یعنی غلبہ عطا کرنے کے بعد پھر تمہیں شکست دے کر ان کافروں سے پھیر دیا تا کہ تمہیں آزمائے وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ اور البتہ تحقیق اللہ نے تم کو معاف کردیا ہے ۔یعنی گو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اور جنگ سے فرار کی راہ اختیار کر کے نہایت سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا ،جس کی تمہیں سخت سزا دی جا سکتی تھی ،لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارا سارا قصور معاف فرما دیا۔اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس شرف کا اظہار ہے جو ان کی کوتاہیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان پر فرمایا،یعنی ان کی غلطیوں کی وضاحت کر کے،تا کہ آئندہ ان کا اعادہ نہ کریں ۔جب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے معافی کا عام اعلان فرما دیا تو اب کسی کے لیے ان پر طعن و تشنیع کی کیا گنجائش رہ گئی ۔صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک حج کے موقعے پر ایک شخص نے حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) پر بعض اعتراضات کئے کہ وہ جنگ بدر میں ،بیعت رضوان میں

شریک نہیں ہوئے، نیز یوم احد میں فرار ہو گئے تھے۔ حضرت ابن عمر (رضي الله عنہ) نے فرمایا کہ جنگ بدر میں تو ان کی اہلیہ (بنت رسول) بیمار تھیں، بیعت رضوان کے موقع پر آپ رسول (ﷺ) کے سفیر بن کر مکہ گئے ہوئے تھے اور یوم احد کے فرار کو اللہ نے معاف فرما دیا ہے۔ (ملخصاً۔ صحیح بخاری، غزوہ احد) قرآن میں جا بجا ایسی آیات آئی ہیں جن میں حضرات صحابہ علیہم الرضوان کی پکڑ فرمائی گئی ہے اور ان کی کسی لغزش کا ذکر آیا ہے، قرآن مجید میں ان آیات کا باقی رہنا صحابہ علیہم الرضوان کی عدالت اور ان کے سچے ہونے کی بھی دلیل ہے اور قرآن کے محفوظ اور تحریف سے پاک ہونے کی بھی، صحابہ علیہم الرضوان اگر معتبر اور صادق القول نہ ہوتے تو ایسی آیات کو حذف کر دیئے ہوتے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ علیہم الرضوان سے جو لغزشیں ہوئی ہیں، اللہ نے ان کو معاف کر دیا ہے اور خدا کے دامن عفو میں وہ جگہ پا چکے ہیں، اب ہمارے لئے نہ درست ہے اور نہ زیبا؛ کہ ہم ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو موضوع بحث بنائیں، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

تعظیمِ صحابہ علیہم الرضوان کے بارے میں امت کا اتفاق

اِذۡ	جب	تُصۡعِدُوۡنَ	تم چڑھے چلے جا رہے تھے
وَلَا تَلۡوٗنَ	اور مڑ کر نہ دیکھتے تھے	عَلٰٓى اَحَدٍ	کسی کو
وَّالرَّسُوۡلُ	اور رسول	یَدۡعُوۡكُمۡ	تم کو پکار رہے تھے
فِیۡۤ اُخۡرٰىكُمۡ		تمہاری پچھلی جماعت میں (کھڑے ہوئے)	
فَاَثَابَكُمۡ	پھر اُس نے تم کو بدلے میں دیا	غَمًّۢا بِغَمٍّ	غم پر غم
لِّكَیۡلَا	تا کہ نہ	تَحۡزَنُوۡا	تم غم کرو
عَلٰى مَا	اس پر جو	فَاتَكُمۡ	تم سے فوت ہو گیا
وَلَا	اور نہ	مَآ	(اُس تکلیف پر) جو
اَصَابَكُمۡ	تمہیں پہنچی	وَاللّٰهُ	اور اللہ
خَبِیۡرٌۢ	خوب خبردار ہے	بِمَا	اس پر جو

تَعۡمَلُوۡنَ	تم عمل کرتے ہو۔(153)

ارشاد ہے اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ جب تم اوپر جارہے تھے۔صعود کا معنی اوپر چڑھنا بھی ہے اور دور چلے جانا بھی۔مقصد یہ ہے کہ جب کفار نے تم پر دو طرف سے حملہ کر دیا، تو تم دباؤ میں آگئے اور ان کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔تم دور تک چلے گئے حتیٰ کہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے تھے وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ کسی کی طرف توجہ نہیں کر رہے تھے۔حالانکہ وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡٓ اُخۡرٰٮكُمۡ ۔اللہ کا رسول تمہیں پیچھے سے پکار رہا تھا۔آپ فرما رہے تھے۔اِلَیَّ عِبَادَ اللهِ! اِلَیَّ عِبَادَ اللهِ! "اللہ کے بندو! میری طرف لوٹ کر آؤ، اللہ کے بندو! میری طرف لوٹ کر آؤ"۔لیکن سراسیمگی کے عالم میں یہ پکار کون سنتا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی افواہ نے لوگوں میں سخت بد دلی پیدا کر دی تھی۔کافروں کا دباؤ پڑا۔تو مسلمان بھاگ نکلے لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کو معاف کر دیا۔اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا فَاَثَابَكُمۡ غَمًّاۢ بِغَمٍّ تمہیں غم پر غم دیا۔ایک شکست کا غم، دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کا غم تھا فرمایا یہ آزمائش اس لیے ڈالی گئی تھی لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ تاکہ تم اس چیز پر غم نہ کرو، جو تم سے فوت ہو گئی ہے۔یہ تو ابتلا تھی۔یہ اسی طرح ہے جس طرح کوئی استاذ اپنے شاگرد کی اصلاح کے لیے اسے سزا دیتا ہے مقصد تمہاری اصلاح تھا تاکہ آئندہ اس قسم کی غلطی سے بچ جاؤ۔نیز فرمایا ایسی چیز پر بھی غمگین نہ ہو وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمۡ ؕ جو تم کو پہنچی ہے۔یعنی جو تکلیف اور پریشانیاں تمہیں آئی ہیں۔نہ ان پر زیادہ فکر مند ہو اور نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔یعنی اگر فتح حاصل نہیں ہوسکی۔تو کوئی بات نہیں۔فکر مت کرو۔اللہ تعالیٰ آئندہ بہتر فتوحات عطا کرے گا وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے تمام کاموں سے باخبر ہے۔اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات موجود ہے۔کہ تمہاری غلطی محض اجتہادی غلطی تھی، لہٰذا اللہ نے اس غلطی کو معاف کر دیا آئندہ محتاط رہو۔یعنی قرآن پوری انسانیت کے لئے حق وسچائی کا بیان ہے؛ لیکن اس سے ہدایت اور نصیحت وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو خدا کا خوف بھی رکھتے ہوں؛ ورنہ جیسے نابینا کے لئے سورج کی روشنی بھی بے فائدہ ہے، اسی طرح خدا نا ترسوں کو کلام ربانی سے بھی نفع نہیں ہوسکتا۔اس آیت مبارکہ سے معلوم

ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی رضا اور خوشی کس قدر عزیز ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہُ تَعَالٰی عَنْھُم کی وجہ سے حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو صدمہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی صدمے میں مبتلا کیا اور پھر صحابہ کرام رضی اللہُ تَعَالٰی عَنْھُم کی جاں نثاری اور اخلاص کی بھی کتنی قدر فرمائی کہ چونکہ ان کی خطا بری نیت سے نہ تھی بلکہ اجتہادی طور پر وہاں خطا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دلجوئی کیلئے ان کی معافی کا اعلان بھی فرما دیا، جب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے معافی کا عام اعلان فرما دیا تو اب کسی کے لیے ان پر طعن و تشنیع کی کیا گنجائش رہ گئی۔

حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان سے عقیدت و محبت اور ان کا ادب و احترام ایک مسلمان کے لیے لازم اور ضروری ہے، اس روئے زمین پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد مقدس ترین جماعت صحابۂ کرام علیہم الرضوان ہی کی ہے، جن کی عظمت و فضیلت میں قرآن کی آیتیں نازل ہوئیں اور جن کے مقامِ بلند کو بتانے اور ان کے حقوق سے امت کو آگاہ کرنے کے لیے امام الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گراں قدر ارشادات سے نوازا۔ صحابۂ کرام علیہم الرضوان وہ مقدس ترین طبقہ ہے جس نے براہِ راست شمعِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روشنی پائی اور منبع علم وعرفاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیض یاب ہوئے، اپنی آنکھوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیدار سے مشرف کیا، اپنے کانوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ارشادات کو سماعت کیا، جن کی زندگی کا بڑا مقصد نبی کے اشارہ پر جان وتن کو لٹانا اور خود کو نبی کے قدموں پر نثار کرنا تھا، کٹھن منزلیں، سخت مرحلے اور مسلسل آزمائشوں نے بھی ان کے جذبۂ اطاعت و فرماں برداری میں کمی آنے نہیں دی، نہ ہی پائے استقامت میں جنبش آنے دی، وہ دیوانہ وار اپنے نبی سے محبت کرتے تھے، فدائیت و فنائیت کا حیرت انگیز نمونہ پیش کیا، اور رہتی دنیا تک کے انسانوں کو بتا دیا کہ نبی کے عاشق، دینِ حق کے متوالے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپاہی کیسے ہوتے ہیں! جن کی وفاداری، خلوص و جاں نثاری کے واقعات آج بھی ہمارے اور قیامت تک آنے والے انسانوں کے ایمان کو تازہ کرنے اور جذبۂ وفا کو برانگیختہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارۂ آبرو پر مال و دولت

کو نچھاور کیا، اسلام کی اشاعت اور دین کی تبلیغ کے لیے ناقابل فراموش قربانیاں دیں اور ہر طرح کی مشقت کو برداشت کیا۔ امت اور نبی کے درمیان کا مضبوط واسطہ اور اہم ذریعہ یہی صحابہ کرام علیہم الرضوان ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ادب واحترام ہر ایک کے لیے ضروری ہے، جو کوئی ان کی بے ادبی یا گستاخی کرے گا وہ دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوگا اور آخرت میں رسوا و نامراد ہوگا۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان کی سیرت واخلاق، کردار و اوصاف کو اپنانا اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر منزلِ مقصود کو پانے کی فکر و کوشش کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ یقیناً جسے اپنے نبی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہوگی تو صحابہ رضی اللہ عنہ سے بھی ضرور محبت کرے گا، دین کو ہم تک پہنچانے اور انسانوں تک نبی کے پیغام کو عام کرنے کے لیے صحابہ کرام علیہم الرضوان نے جو قربانیاں دی ہیں ان کا تصور بھی ہمارے دلوں میں عقیدت ومحبت کے جذبات کو موجزن کر دیتا ہے۔ ہمارے گھرانوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت وواقعات کے تذکرے ہونے چاہئیں، ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے حالاتِ زندگی سے سبق لیں اور ایک بامقصد زندگی گزارنے والے بنیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعظیم امت پر لازم ہے اور امت کا یہ اتفاقی فیصلہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کسی بھی طرح کی بے ادبی اور گستاخی جائز نہیں ہے۔ اہل السنۃ والجماعت کا اس پر اجماع ہے کہ ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ تمام صحابہ علیہم الرضوان کو پاک صاف سمجھے، ان کے لیے عدالت ثابت کرے، ان پر اعتراضات کرنے سے بچے اور ان کی مدح وتوصیف کرے، اس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کی متعدد آیات میں ان کی مدح کی ہے۔ عقائد کی مشہور درسی کتاب ''عقائد نسفیہ'' میں لکھا ہے کہ یعنی اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا ذکر بجز خیر اور بھلائی کے نہ کرے۔ (تلخیص از: مقامِ صحابہ رضی اللہ عنہم)

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن وسنت کی نظر میں

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا یَّغْشٰی طَآئِفَۃً مِّنْکُمْ لا وَطَآئِفَۃٌ
قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ یَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّۃِ ط یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا
مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ط قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهٗ لِلّٰہِ ط یُخْفُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ
لَکَ ط یَقُوْلُوْنَ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ط قُلْ لَّوْ کُنْتُمْ فِیْ
بُیُوْتِکُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ ج وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰہُ مَا
فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ ط وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ
الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ لا اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا
کَسَبُوْا ج وَلَقَدْ عَفَا اللّٰہُ عَنْهُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۵۵﴾

دورانِ جنگ نیند کا طاری ہونا

ثُمَّ اَنْزَلَ	پھر اس نے نازل کیا	عَلَیْکُمْ	تم پر
مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ	غم کے بعد	اَمَنَۃً	امن
نُّعَاسًا	(یعنی) ایسی اونگھ (کہ)	یَّغْشٰی	وہ ڈھانپتی تھی
طَآئِفَۃً	ایک جماعت کو	مِّنْکُمْ	تم میں سے

وَطَآئِفَةٌ	اور ایک جماعت	قَدْ	تحقیق
اَهَمَّتْهُمْ	انہیں فکر میں ڈھال دیا تھا	اَنْفُسُهُمْ	اُن کی جانوں نے
يَظُنُّوْنَ	وہ گمان کرتے تھے	بِاللّٰهِ	اللہ کے بارے میں
غَيْرَ الْحَقِّ	بے حقیقت	ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ	جاہلیت کا گمان
يَقُوْلُوْنَ	وہ کہتے تھے	هَلْ	کیا (ہے)
لَّنَا	ہمارے لیے	مِنَ الْاَمْرِ	معاملے سے
مِنْ شَيْءٍ	کوئی چیز (کچھ)	قُلْ	آپ کہ دیں
اِنَّ الْاَمْرَ	بیشک معاملہ	كُلَّهٗ	سب کا سب
لِلّٰهِ	اللہ ہی کے لئے ہے	يُخْفُوْنَ	وہ چھپاتے ہیں
فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ	اپنے دلوں میں	مَّا	وہ (بات) جو
لَا يُبْدُوْنَ	نہیں وہ ظاہر کرتے	لَكَ	آپ کے سامنے
يَقُوْلُوْنَ	وہ کہتے ہیں	لَوْ كَانَ لَنَا	اگر ہوتا ہمارے لیے
مِنَ الْاَمْرِ	(اس) معاملے سے	شَيْءٌ	کچھ
مَّا قُتِلْنَا	(تو) نہ ہم قتل کئے جاتے	هٰهُنَا	یہاں
قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ	کہ دیجیئے اگر تم ہوتے	فِيْ بُيُوْتِكُمْ	اپنے گھروں میں (بھی)
لَبَرَزَ	تو ضرور باہر نکلتے	الَّذِيْنَ	وہ لوگ کہ
كُتِبَ	لکھ دیا گیا تھا	عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ	ان پر قتل ہونا
اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ	اپنی قتل گاہوں کی طرف	وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ	اور تا کہ آزمائے اللہ
مَا	(اس میں) جو	فِيْ صُدُوْرِكُمْ	تمہارے سینوں میں ہے
وَلِيُمَحِّصَ	اور تا کہ صاف کر دے	مَا	(اُن وسوسوں کو) جو
فِيْ قُلُوْبِكُمْ	تمہارے دلوں میں ہیں	وَاللّٰهُ	اور اللہ

عَلِيمٌ	خوب جانتا ہے	بِذَاتِ الصُّدُوْرِ	سینوں کے راز۔

ارشاد ہوتا ہے ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً پھر اللہ تعالیٰ نے غم کے بعد تم پر امن کی حالت نازل فرمائی۔ اور وہ امن کیا تھا نُّعَاسًا اونگھ تھی، جو تم پر طاری ہوگئی۔ امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ دوران جنگ نیند یا اونگھ کا وارد ہو جانا حضور ﷺ کی نبوت وصداقت کی عظیم دلیل اور معجزہ ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ بہت سے مجاہدین شہید ہو چکے تھے۔ بہت سے زخمی حالت میں تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ خود زخمی تھے۔ یہ تو سخت پریشانی کا عالم تھا۔ انسان کو نیند تو کجا ذرا سا چین بھی نصیب نہیں ہوسکتا، ایسی حالت میں نیند کا آجانا اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی۔ اور عام قانون بھی یہی ہے۔ کہ اگر لڑائی کی حالت میں نیند طاری ہو جائے تو فتح و کامیابی کی علامت ہوتی ہے۔ یہ ایک نیک فال ہوتا ہے۔ کیونکہ تھکے ک ماندے پریشان حال شخص کو کچھ دیر کے لیے نیند آجائے، تو اسے سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ پریشانی دور ہو جاتی ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ نیند کی حالت صرف خالص ایمان والوں پر طاری ہوئی تھی۔ منافق اس نعمت سے محروم رہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ نیند یا اونگھ بھی ایسی طاری ہوئی کہ ہاتھ سے تلوار گر پڑتی تھی جسے پھر اٹھانا پڑتا تھا، غرض اللہ تعالیٰ نے نیند کے ذریعے اہل ایمان کا غم دور کر دیا، ان کا بوجھ ہلکا کر دیا اور وہ پھر سے تازہ دم ہو گئے۔ سورہ نبا میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹ اور ہم نے تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا ہے۔ اور یہ سکون اہل ایمان کو عین جنگ کی حالت میں حاصل ہوا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ یہ اونگھ ڈھانپ رہی تھی تم میں سے ایک گروہ کو جو پکے سچے مسلمان تھے۔ منافقوں کو یہ چیز نصیب نہیں ہوئی۔ فرمایا منافقوں کی حالت اس وقت یہ تھی وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ کہ اس گروہ کو ان کی جانیں فکر مند کر رہی تھیں ان کو چین نصیب نہیں ہوا۔ بلکہ وہ تو خوفزدہ ہو رہے تھے۔ کہ اب پتہ نہیں کیا ہوگا۔ ہم اس مشکل سے نکل سکیں گے یا نہیں۔ ان کے دلوں میں طرح طرح کے باطل خیالات آرہے تھے يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ناحق گمان کرتے تھے۔ غلط خیال قائم کرتے تھے۔ کہ شاید اللہ ان

کی مدد نہیں کرے گا۔اور انہیں فتح حاصل نہیں ہوگی۔ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ط جاہلیت والے گمان ہیں۔ اور ساتھ ساتھ عقیدہ تقدیر کی تکذیب بھی کرتے ہیں۔کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے وہ مشیت الٰہی کے مطابق ہے جو کچھ اللہ کی تقدیر میں موجود ہے، وہ ہو کر رہے گا۔تقدیر ٹل نہیں سکتی۔ مومن تو اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو بھی خیر و شر آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت، ارادے اور مشیت سے آتا ہے۔مگر منافقین زمانہ جاہلیت کے گندے عقائد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ط کیا اس معاملے میں ہمارے لیے بھی کچھ ہے؟ یعنی ہمیں تو غم پر غم پڑ رہا ہے کیا ہمارے لیے اچھائی میں بھی کچھ حصہ ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ط اے نبی (علیہ السلام) آپ کہہ دیجئے کہ سارے کا سارا معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اس کے ارادے اور مشیت میں کسی کو مجاز دخل نہیں وہ جو چاہے کرتا ہے اللہ تعالیٰ بتلا رہے ہیں کہ ان منافقوں کی حالت یہ ہے کہ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ط یہ لوگ اپنے نفسوں میں منافقانہ سازشوں اور گندے خیالات کو چھپاتے ہیں، جو آپ پر ظاہر نہیں کرتے۔اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں۔کہ یہ بد بخت اپنی منافقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ط کہتے ہیں کہ اگر معاملے میں ہمارے لیے بھی کچھ ہوتا، تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے۔یعنی اگر اللہ تعالیٰ کو ہماری بھلائی منظور ہوتی تو ہمارے اتنے آدمی شہید نہ ہوتے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔کہ ان کا یہ خیال باطل محض ہے۔کہ اگر جنگ میں شریک نہ ہوتے تو بچ جاتے۔بلکہ فرمایا قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ اگر تم اپنے گھروں میں بھی پڑے ہوتے لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ج تو جن لوگوں کی تقدیر میں موت لکھی جا چکی ہے وہ اپنے قتل گاہ کی طرف ضرور نکل آتے۔یہ تو خدا تعالیٰ کے علم میں ہے کہ فلاں شخص کی موت کس مقام اور کس وقت پر واقع ہوگی۔لہٰذا یہ ان کی خام خیالی ہے کہ اگر گھروں میں بیٹھ رہتے تو قتل نہ ہوتے جس خداوند کریم نے ان کے قتل کا مقام مقرر فرما دیا وہ ان کے اس مقام پر پہنچ جانے کا انتظام بھی فرما دیتا۔لہٰذا اس قسم کے باطل خیالات دل میں نہیں لانے چاہئیں بلکہ تقدیر خداوندی پر

راضی ہو جانا چاہیئے۔تقدیر پر ایمان لانا ایک مومن کا جزو ایمان ہے۔اللہ تعالیٰ کی منشاء کے بغیر کوئی چیز واقع نہیں ہوتی۔جو انسان پیدا کیے گئے ہیں۔ان کے حوادثات بھی ان کے ساتھ مقدر ہیں۔ غزوہ احد میں جو تکلیف پہنچی وہ مسلمانوں کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کی حکمت یوں بیان فرمائی وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ تاکہ اللہ تعالیٰ آزمائے اس چیز کو جو تمہارے دلوں میں ہے ایسی ہی مشکل صورت حال میں کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہوتی ہے۔مقصد یہ تھا کہ آزما کر دیکھا جائے کہ ان میں سے کون سچے مومن ہیں اور کن کے دلوں میں کھوٹ موجود ہے۔ چنانچہ منافقین کا ایک گروہ تو احد کی طرف آتے ہوئے راستے سے ہی واپس ہو گیا۔اور جو میدان جنگ میں پہنچ گئے۔ان میں سے بعض کے دلوں میں مختلف وسوسے پیدا ہونے لگے۔کہ ہمیں فتح کیوں نہیں حاصل ہو رہی ہے اور یہ کہ اگر ہم اس جنگ کے لیے باہر نہ نکلتے تو شاید قتل ہونے سے بچ جاتے وغیرہ وغیرہ،اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے کھرے اور کھوٹے کی آزمائش فرمائی۔کیونکہ جو راسخ العقیدہ مسلمان تھے وہ ہر حالت میں ثابت قدم رہے۔اس آزمائش کی دوسری حکمت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ اور تاکہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو صاف کردے جو تمہارے دلوں میں ہے۔مطلب یہ کہ دلوں میں جو مختلف وسوسے اور شبہات پیدا ہو رہے تھے،اللہ تعالیٰ نے ان کو دور کر کے اہل ایمان کے دلوں کو ایسی اشیا سے پاک صاف کر دیا۔اسی طرح اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے نسموں کو پاک کر دیا۔ان کے دلوں کی کجیاں دور ہو گئیں وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۱۵۴ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے رازوں کو جاننے والا ہے۔اس سے تمہاری کوئی چیز پوشیدہ نہیں،خواہ وہ زبان پر ہو یا سینے میں ہو۔لہذا اپنے نسمہ کو پاک صاف رکھو (لفظ نسمہ کا لغوی معنی سانس،روح،جان،اور انسان یا فردِ بشر ہے،روحانی اصطلاح روحانیت اور تصوف میں جسم کے گرد موجود روشنیوں کے اس لطیف نظام یا مقناطیسی ہالے کو بھی نسمہ کہا جاتا ہے جس پر مادی جسم قائم ہے) یعنی اس میں برے خیالات کو جگہ نہ دو۔ہر اچھائی اور تکلیف اللہ کی مقرر کردہ تقدیر کے مطابق واقع ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ اس کے مطابق وقتاً فوقتاً تمہارا امتحان لیتا رہتا ہے۔اور

مبارک باد کے مستحق ہیں وہ لوگ جو اس امتحان میں پورا اترتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نکتہ چینی دینی اور دنیوی نقصانات کا باعث

اِنَّ الَّذِيْنَ	بلا شبہ وہ لوگ جو	تَوَلَّوْا	پھر گئے تھے
مِنْكُمْ	تم میں سے	يَوْمَ	(جس) دن
الْتَقَى الْجَمْعٰنِ	آمنے سامنے ہوئیں دو جماعتیں	اِنَّمَا	درحقیقت
اسْتَزَلَّهُمُ	ان کو پھسلا دیا تھا	الشَّيْطٰنُ	شیطان نے
بِبَعْضِ	بہ سبب بعض	مَا	(اُن کوتاہیوں کے) جو
كَسَبُوْا	انہوں نے کیں	وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق
عَفَا اللّٰهُ	اللہ نے معاف کر دیا	عَنْهُمْ	ان سے
اِنَّ اللّٰهَ	بلا شبہ اللہ	غَفُوْرٌ	بہت بخشنے والا
حَلِيْمٌ	بڑا بردبار ہے۔(155)		

ارشاد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے پشت پھیری اس دن، جس روز دو جماعتوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔اور یہ جنگ اہل اسلام اور کفار کے درمیان تھی۔اس جنگ میں مسلمان سخت افراتفری کے عالم میں مبتلا ہو گئے اور ان کی اکثریت میدان جنگ سے بھاگ نکلی۔صرف قلیل تعداد میں مخلص لوگ ثابت قدم رہے۔اللہ نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ تھی اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ ان کے بعض اعمال یعنی کوتاہیوں کے سبب شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔تمام مسلمان بددل ہوئے تھے بلکہ ان میں سے بعض نے کمزوری دکھائی حالانکہ اس سے پہلے اسلام کے لیے ان کی بڑی بڑی قربانیاں موجود تھیں۔بہرحال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ لغزش تھی کہ وہ ثابت قدم نہ رہ سکے، اللہ کا نبی زخمی حالت میں موجود ہے، وہ پکار رہا ہے إِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ! إِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ! ”اللہ کے بندو! میری طرف لوٹ کر آؤ،

اللہ کے بندو! میری طرف لوٹ کر آؤ" کہ اللہ کے بندو! کدھر جا رہے ہو، اس طرف آؤ، یہ یقیناً غلطی تھی، جو بعض کوتاہیوں کی وجہ سے واقع ہوئی وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ط اب پھر دہرایا جا رہا ہے کہ اللہ نے ان غلطیوں سے درگزر فرمایا لَقَدْ تاکید کے لیے ہوتا ہے۔ البتہ تحقیق اللہ ان کو معاف فرما چکا ہے۔ صحابہ علیہم الرضوان کی اس عام معافی کے بعد اب کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان پر نکتہ چینی کرے۔ صحابہ علیہم الرضوان کی ان لغزشوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی کا اعلان فرما دیا۔ لہٰذا جو شخص اس کے بعد بھی صحابہ کبار پر طعن تشنیع کا مرتکب ہوگا، اس کے اپنے ایمان میں فتور ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق خود کائنات کا پالن ہار ان کی تعریف وتوصیف بیان کرتا ہے، دنیاوی زندگی اور حیاتِ فانی ہی میں اپنی رضامندی اور ان کی مغفرت کا اعلان کرتا ہے۔ اپنے خاص مقامِ رحمت جنت کی بشارت وخوش خبری سُناتا ہے، رشاد باری ہے: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (1) اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوگیا اور وہ اللہ سے، دوسرے مقام پر ان کے ہدایت یافتہ اور بامراد ہونے کو یوں بیان فرماتا ہے، اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (2) ایک موقع پر حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کی قبولیت کو اور پھر ان کے ایمان کو معیار اور کسوٹی کا درجہ دیتے ہوئے ارشاد ہے: اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاس (3) ایمان قبول کرو جیسا کہ لوگوں نے ایمان قبول کیا، اور کبھی حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے باہمی ربط وتعلق اور محبت والفت کا نقشہ کھینچتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (4) وہ باہم نہایت مہربان اور شفقت کرنے والے ہیں۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رضا الٰہی کی ڈگری حاصل ہو چکی ہے۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۱۵۵ بیشک اللہ بخشش کرنے والا اور بردبار ہے۔ وہ فوراً گرفت نہیں کرتا۔ بلکہ اہل ایمان کو موقع دیتا ہے۔ کہ اس قسم کی لغزشوں سے پرہیز کریں۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان پر نکتہ چینی یا عیب جوئی کرنا دین میں گمراہی، ایمان کی کمزوری اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے۔ اس کا سب

سے بڑا وبال یہ ہے کہ یہ دراصل براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی ذات پر طعن کے مترادف ہے، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہ ہی دین کے راوی اور امین ہیں۔ صحابہ علیہم الرضوان کے باہمی اختلافات اور اجتہادی غلطیوں پر بحث کرنے اور زبان کھولنے سے اجتناب کرنا اہلِ سنت کا بنیادی عقیدہ ہے تمام صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ساتھ عقیدت اور ادب کا تعلق رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

موت اور زندگی کا نظامِ قدرت

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي
الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ
حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۵۶ وَلَئِنْ
قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۱۵۷
وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۱۵۸

موت کی حقیقت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو!
لَا تَكُوْنُوْا	نہ ہو جاؤ تم	كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اُن لوگوں کی طرح جنہوں نے کفر کیا
وَقَالُوْا	اور انہوں نے کہا	لِاِخْوَانِهِمْ	اپنے بھائیوں کو
اِذَا	جب	ضَرَبُوْا	انہوں نے سفر کیا
فِي الْاَرْضِ	زمین میں	اَوْ كَانُوْا	یا تھے وہ
غُزًّى	جہاد میں	لَّوْ كَانُوْا	اگر وہ ہوتے
عِنْدَنَا	ہمارے پاس	مَا مَاتُوْا	(تو) نہ وہ مرتے

وَمَا قُتِلُوْا	اور نہ وہ قتل کئے جاتے	لِيَجْعَلَ اللّٰهُ	تا کہ بنادے اللہ
ذٰلِكَ	اس (فاسد خیال) کو	حَسْرَةً	پچھتاوا
فِيْ قُلُوْبِهِمْ	ان کے دلوں میں	وَاللّٰهُ	اور اللہ
يُحْيٖ	زندہ کرتا ہے	وَيُمِيْتُ	اور مارتا ہے
وَاللّٰهُ	اور اللہ	بِمَا تَعْمَلُوْنَ	ساتھ اس کے جو تم کرتے ہو
بَصِيْرٌ	خوب دیکھنے والا ہے۔(156)		

ارشاد ہوتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ان کفار میں منافقین کا گروہ بھی شامل ہے۔ خاص طور پر اعتقادی منافق اس جماعت کے بدترین لوگ ہوتے ہیں، جن کے متعلق خود قرآن پاک کا فیصلہ ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ یعنی ایسے منافقین کا ٹھکانا جہنم کے سب سے نیچے والے خطرناک گڑھے میں ہوگا۔ان کی سازش اب یہ ہے وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ کہ انہوں نے اپنے بھائی بندوں کے بارے میں کہا تھا۔اور بھائی بندوں سے مراد مسلمان ہیں۔اور یہ بات انہوں نے اس وقت کہی اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ جب انہوں نے یعنی مسلمانوں نے زمین میں سفر کیا۔ اَوْ كَانُوْا غُزًّى یا جب وہ جہاد میں شریک ہوئے۔غُزًّى: یہ "غَازٍ" کی جمع ہے، جو "غَزَا يَغْزُ" سے اسم فاعل ہے، بمعنی لڑنے والے، جیسے "رَاكِعٌ" کی جمع "رُكَّعٌ" آتی ہے۔مسلمانوں کو تاکید فرمائی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے نفاق کی وجہ سے کافر ہیں اور یہ گندہ عقیدہ صرف دل ہی میں نہیں رکھتے بلکہ برملا اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ہمارے جو بھائی جہاد کے سفر میں فوت ہو گئے یا لڑتے ہوئے مارے گئے، اگر ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے، نہ قتل ہوتے ایسا عقیدہ رکھنا یا ایسی بات زبان سے نکالنا عقیدہ تقدیر کے خلاف ہے جو ایمان بالغیب کا چھٹا جزو ہے۔اس لحاظ سے بھی یہ لوگ کافر ہوئے۔کیونکہ موت کا وقت بھی معین ہے اور جگہ بھی۔کچھ بھی ہو موت اپنے وقت پر آئے گی اور آ کے رہے گی۔اس کے وقت میں تقدیم و

تاخیر ناممکن ہے اسی طرح جہاں مرنا مقدر ہے وہاں خود ہی انسان کسی حیلے بہانے جا پہنچتا ہے اور جب موت کا وقت نہ آیا ہو، تو انسان خواہ غزوات میں پوری زندگی گزار دے۔ اسے موت نہیں آتی۔

مطلب یہ کہ جب کبھی مسلمان تجارتی یا دیگر سفر پر گئے اور وہاں موت آگئی۔ یا پھر کسی جہاد میں شریک ہوئے تو شہادت نصیب ہوگئی۔ ایسی صورت حال میں منافقین کہنے لگے لَّوۡ كَانُوۡا عِنۡدَنَا اگر یہ مسلمان ہمارے پاس ہوتے یعنی مذکورہ سفر پر نہ جاتے یا جنگ میں شریک نہ ہوتے تو کیا ہوتا مَا مَاتُوۡا وَمَا قُتِلُوۡا ۚ نہ وہ مرتے اور نہ مارے جاتے یعنی ان کی جان بچ جاتی۔ دراصل منافق مسلمانوں کو سفر اور جہاد سے بدظن کرنا چاہتے تھے۔ کہ یہی چیزیں ان کی موت کا سبب بن رہی ہیں۔ لہذا ان کو نہ کسی سفر پر جانا چاہئے۔ اور نہ کسی جہاد میں شریک ہونا چاہئے۔

اس آیت کریمہ میں اِخۡوَانِهِمۡ کا لفظ توجہ طلب ہے۔ منافقین اور مسلمانوں کو بھائی بند کہا گیا ہے۔ اور یہ اس اعتبار سے کہ مدینے میں رہنے والے سارے قومی بھائی تھے۔ مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود بحیثیت قوم یہ لوگ بھائی بھائی تھے۔ ایسا بھی تھا کہ ایک ہی خاندان کے افراد ہونے کے باوجود بعض لوگ مسلمان ہوگئے، بعض منافق اور کافر رہے اور ان میں سے بعض یہودی تھے۔ لہذا یہ سب لوگ آپس میں ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اور پھر ان میں رشتہ داری اور قرابت بھی تھی، اس واسطے اخوان کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ منافق کافروں نے اپنے مسلمان بھائی بندوں سے کہا کہ تم خواہ مخواہ دور دراز کا سفر اختیار کرتے ہو اور جہاد میں شریک ہو کر اپنی موت کو دعوت دیتے ہو۔ ہماری طرح گھر میں بیٹھے رہتے تو تمہاری جان بچ جاتی۔

ایسی بات کرنے سے منافقین کا مقصود یہ ہے لِيَجۡعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسۡرَةً فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ تاکہ اللہ تعالیٰ ان (مسلمانوں) کے دلوں میں حسرت پیدا کردے۔ ان کے دل میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ منافقین بات تو صحیح کہتے ہیں۔ واقعی اگر جہاد میں شریک نہ ہوتے تو ہمارے آدمیوں کی جان بچ جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ منافقین کی ایسی مایوس کن باتوں میں نہ آئیں۔ بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق جہاد میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوں کیونکہ دین اسلام اور مسلمانوں

کی بقا اسی میں راز میں مضمر ہے حَسۡرَةً فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے دلوں میں حسرت پیدا کردے۔ اگر مسلمان کفار و منافقین کی اس چال میں نہ آئیں اور وہ سفر اور جہاد میں برابر شریک ہوتے رہیں تو یہ چیز خود منافقین کے لیے باعث حسرت ہوگی کہ ان کی تمام تر سعی کے باوجود مسلمان ان کے بہکاوے میں نہیں آئے۔ لہٰذا ان کے دلوں میں حسرت و یاس پیدا ہوگی اور وہ خود اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلتے رہیں گے۔ یعنی موت تو اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے وقت ہی پر آئے گی؛ لیکن دل میں یہ حسرت قدرت خداوندی پر بے اعتباری کہ اگر فلاں شخص نہ نکلا ہوتا تو بچ گیا ہوتا، یہ خود ایک نفسیاتی عذاب ہے، اس سے دل کی کسک اور کڑھن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ کیفیت ان کے دل میں ان کی ضعیف الاعتقادی کی سزا کے طور پر رکھ دی ہے۔

لہٰذا کفار و منافقین کا یہ کہنا کہ مسلمان جہاد میں شریک ہو کر خود موت کے منہ میں جاتے ہیں۔ ناقابل فہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بات سمجھا دی کہ اگر اس قسم کا عقیدہ مسلمانوں میں بھی پیدا ہو جائے تو یہ بہت بری بات ہے۔ انہیں اپنے عقیدہ موت و حیات پر ثابت رہنا چاہئے وَاللّٰهُ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ؕ کیونکہ زندہ کرنا اور موت دینا تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ موت و حیات کا مالک تو وہ ہے جب تک چاہے کسی کو زندہ رکھے اور جب چاہے اسے اپنے پاس بلا لے۔ اس کی حکمت کو وہی مالک الملک جانتا ہے۔ محض جہاد میں شرکت موت کو دعوت دینے والی بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جنہوں نے زندگی بھر جنگیں لڑیں اور جن کے جسم کا کوئی حصہ بھی تلوار یا تیر کے نشان سے بچا ہوا نہ تھا۔ انہیں موت آئی تو گھر پر آئی۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنی وفات کے وقت یہ الفاظ کہے تھے کہ میرے بدن پر ایک بالشت بھی ایسی جگہ نہیں جو تلوار یا نیزہ کے زخم سے خالی ہو مگر میں آج اونٹ کی طرح (گھر پر) مر رہا ہوں۔ لہٰذا جہاد سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔ موت کا خوف دلانا منافقین کی چال ہے اس سے خبردار رہنا چاہئے وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۱۵۶﴾ اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ تم کام کرتے ہو۔ ایسے خیالات کہ اگر وہ فلاں سفر یا جہاد پر نہ جاتا تو شاید

بچ رہتا۔ محض حسرت ہی حسرت ہے۔ ورنہ جو اللہ گھر میں زندہ رکھتا ہے جہاد میں بھی رکھ سکتا ہے اور جو جہاد میں مار سکتا ہے وہ گھر میں بھی مار سکتا ہے۔ زندہ رکھنا اور مارنا سب اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس کے علم میں ہے۔

اس آیت کریمہ میں اہل ایمان کو اس فساد عقیدہ سے روکا جا رہا ہے جس کے حامل کفار اور منافقین تھے کیونکہ یہ عقیدہ بزدلی کی بنیاد ہے اس کے برعکس جب یہ عقیدہ ہو کہ موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے، نیز یہ کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے تو اس سے انسان کے اندر عزم وحوصلہ اور اللہ کی راہ میں لڑنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی عقیدہ مسلمان کی قوت کا باعث ہے، اس لیے حکم دیا کہ دل مضبوط رکھو، موت اپنے وقت سے ایک لمحہ بھی پہلے نہیں آ سکتی۔ اگر مگر کے الفاظ شیطان کو دخل اندازی کا موقع دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قوی مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضعیف سے بہتر اور زیادہ محبوب ہے اور ہر ایک میں کوئی نہ کوئی بھلائی ہے، اس چیز کی حرص کرو جو تمہیں نفع دے اور اللہ سے مدد مانگو اور عاجز مت ہو جاؤ اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو یہ مت کہو، اگر میں ایسا اور ایسا کرتا (تو مجھے یہ مصیبت نہ پہنچتی) بلکہ یوں کہو کہ اللہ نے جو مقدر کیا اور جو چاہا کر دیا، اس لیے کہ "لَوْ" (اگر کا لفظ) شیطان کے کام (کا راستہ) کھول دیتا ہے۔" [مسلم، القدر، باب ال إیمان بالقدر والاذعان لہ: 2664، عن أبی ہریرۃ ؓ]

موت وحیات کا فلسفہ

وَلَئِنْ	اور البتہ اگر	قُتِلْتُمْ	تم قتل کر دیئے گئے
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کی راہ میں	اَوْ مُتُّمْ	یا تم مر گئے
لَمَغْفِرَةٌ	(تو) البتہ بخشش	مِّنَ اللّٰهِ	اللہ کی
وَرَحْمَةٌ	اور رحمت	خَيْرٌ	بہت بہتر ہے
مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ	اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔(157)		

ارشاد ہوتا ہے وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اگر تم اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے اَوْ مُتُّمْ یا

طبعی موت مرے تو اس کا ماحصل یہ ہوگا لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری بخشش کا اعلان ہوجائے گا۔تمام گناہ معاف ہوجائیں گے۔غلطیاں قلم زد کردی جائیں گی۔اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اور رحمت اس سے کہیں بہتر ہے جو لوگ جمع کرتے ہیں۔یعنی اگر تمہارا مرنا یا قتل ہونا اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہے تو یہ یقیناً تمہارے لیے مغفرت اور رحمت کا سبب بنے گا اور یہ مغفرت ورحمت اس مال ومتاع سے بہتر ہے جس کے جمع کرنے کی فکر میں یہ کفار اور منافقین ہر آن لگے رہتے ہیں،یہ ان کے شبہ کا دوسرا جواب ہے۔اسلامی تعلیمات کے مطابق کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک مخصوص حکمت کے تحت،ایک متعین مدّت تک کے لیے اپنا کام کررہی ہے۔موت وحیات کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے قرآن واضح کرتا ہے: وہ (ذات) جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا،تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے بہتر جدوجہد کون کرتا ہے اور وہی عزت والا بخشنے والا ہے۔

موت نام ہے روح کا بدن سے تعلق ختم ہونے کا

وَلَئِنْ	اور البتہ اگر	مُّتُّمْ	تم مرگئے
اَوْ	یا	قُتِلْتُمْ	تم ماردیے گئے
لَاِالَى اللّٰهِ	(تو) یقیناً اللہ ہی کی طرف	تُحْشَرُوْنَ	تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔

رشاد ہوتا ہے وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ اگر تم طبعی موت مرو یا شہید ہوجاؤ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ تو لامحالہ تم سب خدا تعالیٰ کی طرف ہی اکٹھے کیے جاؤ گے۔مومن کا یہ ایمان ہے کہ مرنے کے بعد اسے براہ راست خدا تعالیٰ کے حضور پیش ہونا بعث بعد الموت پر اس کا یقین ہے۔یہ نہ سمجھو کہ زندہ رہنے میں ہی تمہارا فائدہ ہے،مرنے کے بعد محروم ہوجاؤ گے۔بلکہ یاد رکھو! تمہیں بہرحال اللہ کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔اور وہ باز پرس بھی کرسکتا ہے۔لہٰذا موت کے ڈر سے جہاد سے اجتناب نہ کرو۔مجرم اور گنہگار بن کر رب العزت کے حضور پیش نہ ہونا بلکہ ایسے اعمال لے کر حاضر ہونا جن کی وجہ سے تمہیں اللہ کی مغفرت اور مہربانی حاصل ہوجائے۔اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو منع فرما

دیا کہ کافروں اور منافقوں کی مشابہت اختیار نہ کریں۔ان کی سازش کا شکار نہ ہوں اور اپنے دین پر قائم رہیں۔یعنی موت تو آنی ہی آنی ہے؛لیکن اگر ایک نیک مقصد کے لئے اور خدا کی خوشنودی کی حالت میں موت آئے تو یہ سانحہ بھی ایک خوشگوار واقعہ ہے اور یہ موت زندگی سے بہتر اور زندگی کی ان آسائشوں سے بھی زیادہ قابل رشک ہے،جن کے لئے انسان دن رات سرگرداں رہتا ہے،کہ مومن کی کامیابی یہی ہے کہ زندگی کی طرح اس کی موت بھی اللہ ہی کے لئے ہو،اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہم ہر روز،ہر گھنٹہ،بلکہ ہر لمحہ اپنی موت کے قریب ہوتے جارہے ہیں۔سال،مہینے اور دن گزرنے پر ہم کہتے ہیں کہ ہماری عمر اتنی ہوگئی،لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایام ہماری زندگی سے کم ہوگئے۔موت نام ہے روح کا بدن سے تعلق ختم ہونے کا اور انسان کا دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کرنے کا۔ترقی یافتہ سائنس بھی روح کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ضروری ہے کہ ہم افسوس کرنے یا آنسو بہانے سے قبل،اس دنیاوی فانی زندگی میں ہی اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش کریں،تاکہ ہماری روح ہمارے بدن سے اس حال میں جُدا ہو کہ ہمارا خالق و مالک و رازق ہم سے راضی ہو۔اس آیت کا حاصل مطلب یہ بندے کے اپنے رب کے ساتھ مکمل اخلاص،توحید اور سپردگی کا اعلان ہے،جس میں زندگی کا ہر لمحہ اور موت بھی اللہ کی رضا کے لیے وقف کرنے کا درس دیا گیا ہے یہ دنیاوی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ بھی نہیں،حقیقت یہ ہے کہ دار آخرت ہی اصل زندگی ہے۔

مشورہ اسلامی شعار ہے/لفظی اور شرعی اصطلاح میں توکل کا مطلب

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ
حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ
لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

بخشش، معافی اور مشورہ خوبصورت اور اہم اقدار

فَبِمَا	پھر بسبب	رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ	اللہ کی رحمت کے
لِنْتَ	آپ نرم ہو گئے	لَهُمْ	ان کے لیے
وَلَوْ	اور اگر	كُنْتَ	ہوتے آپ
فَظًّا	تُند خو	غَلِيْظَ الْقَلْبِ	سخت دل
لَانْفَضُّوْا	تو وہ ضرور منتشر ہو جاتے	مِنْ حَوْلِكَ	آپ کے پاس سے
فَاعْفُ	پس آپ معاف کر دیں	عَنْهُمْ	انہیں
وَاسْتَغْفِرْ	اور بخشش مانگیں	لَهُمْ	ان کے لیے

وَشَاوِرْهُمْ	اور مشورہ کریں ان سے	فِي الْأَمْرِ	(اہم) معاملے میں
فَإِذَا عَزَمْتَ	پھر جب آپ پختہ ارادہ کرلیں	فَتَوَكَّلْ	تو بھروسہ کریں
عَلَى اللّٰهِ	اللہ پر	إِنَّ اللّٰهَ	بلاشبہ اللہ
يُحِبُّ	پسند کرتا ہے	الْمُتَوَكِّلِينَ	بھروسہ کرنے والوں کو۔

ارشاد ہے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ پس اللہ کی رحمت کے سبب لِنْتَ لَهُمْ ۚ آپ ان کے لیے نرم ہیں۔گویا اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے۔کہ آپ ﷺ کو اپنے صحابہ علیہم الرضوان کے لیے نرم بنایا۔ یہاں پر فَبِمَا میں مَا زاید ہے۔عربی زبان میں یہ تاکید کے لیے آتا ہے اور اس کی مثالیں قرآن پاک میں مختلف مقامات پر موجود ہیں وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا اور اگر آپ تندخو ہوتے یا سخت مزاج ہوتے، یا پھر غَلِيظَ الْقَلْبِ تنگ دل ہوتے لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ص تو یہ لوگ آپ ﷺ کے یقیناً یعنی تیرے ارد گرد سے منتشر ہو جاتے، یہ اللہ کا فضل عظیم ہے کہ آپ عالی اخلاق اور نرم مزاج ہیں۔غزوہ احد کے دن مسلمانوں نے خوف ناک غلطی کی اور میدان چھوڑ کر فرار اختیار کیا، پھر جب رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے دوبارہ جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو کسی قسم کی سرزنش نہیں کی، بلکہ حسن اخلاق سے پیش آئے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ" آپ ﷺ کا یہ حسن خلق اور طبیعت کی نرمی اللہ تعالیٰ کے خاص فضل واحسان اور رحمت کا نتیجہ ہے، ورنہ مسلمانوں کا جمع ہونا ممکن نہ تھا۔ (قرطبی) اس بات کا امکان تھا کہ حضور ﷺ کے دل میں کچھ رنجش باقی رہتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خلاف توقع عمل کیوں کیا ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے سفارش کردی فَاعْفُ عَنْهُمْ اے نبی کریم! اپنے صحابہ کی یہ لغزش معاف کردیں دل میں ان کے متعلق کسی قسم کا رنج نہ رکھیں بلکہ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کریں۔ظاہر ہے کہ جس شخص کے لیے اللہ کا رسول بخشش طلب کرے گا۔وہ ضرور فائز المرام ہوگا۔یعنی جنگ میں ان سے جو غلطیاں ہوئیں وہ انھیں معاف کردیں، اللہ سے بھی ان کے لیے استغفار کریں اور مشورے سے محروم نہ کریں بلکہ برابر مشورہ کرتے رہیں۔امیر مشورہ لینے کا پابند ہے، مگر صرف ان امور میں جو قرآن وسنت میں مذکور نہ

ہوں، بلکہ تدبیری اور انتظامی قسم کے ہوں۔ امیر مشورہ ان لوگوں سے لے گا جو اس معاملے میں رائے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں بھی صاف فرمادیا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ اور معاملات میں ان سے مشورہ فرمالیا کریں۔ حضور ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ جنگ یا دیگر معاملات میں صحابہ سے مشورہ کرلیا کرتے تھے۔ لفظ شوریٰ قرآن مجید میں تین مقامات پر وارد ہوا ہے اور ان تینوں مقامات پر انسانی زندگی کے نہایت اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے جس سے اسلام میں مشورے کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں کمی اور کوتاہی فطری ہے کیونکہ انسان نہ عقل میں کامل ہے اور نہ ہی پوری بصیرت کا حامل ہے۔ اس لئے اسلام نے انسان کی ان بنیادی کمزوریوں کو دور کرنے، انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر انداز سے گزارنے، صحیح سمت پر قائم رہنے اور بڑے نقصانات سے بچنے کے لئے جو ہدایات اور احکام دیئے ہیں ان میں ایک اہم ہدایت اپنے معاملات میں باہم مشورہ کرنا ہے۔

ہاں مشورہ کی ضرورت ان امور میں پیش آتی تھی جن میں وحی الٰہی کے ذریعے واضح حکم موجود نہیں ہوتا ہے کیونکہ جہاں اللہ کا حکم موجود ہو۔ وہاں اس کا اتباع لازم ہے، جیسا کہ نماز، روزہ، زکوۃ وغیرہ جیسے فرائض میں احکام الٰہی کا اتباع ضروری ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا واضح حکم بذریعہ وحی نہیں ملتا تھا تو آپ ﷺ مشورہ بھی کرتے تھے اور اجتہاد بھی فرماتے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مشورہ کا قانون بھی سمجھا دیا۔ آج کے مسلمان امرا، ملوک اور سلاطین صحیح لوگوں سے مشورہ کرنا ترک کر چکے ہیں۔ برخلاف اس کے من مانی کارروائیاں کر رہے ہیں جس کی وجہ سے قوم وملت کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ جب خود پیغمبر ﷺ مشورہ کرنے کا حکم تھا۔ تو کسی حاکم کو یہ حق نہیں پہنچتا وہ اصحاب حل وعقد سے مشورہ کیے بغیر اپنی خواہشات نفسانیہ کے پیچھے چلتا رہے۔ ہماری تاریخ میں بنو عباس کے زمانے سے یہ مصیبت چلی آرہی ہے۔ کہ ملوک مشورہ سے معاملہ سلجھانے کی بجائے من مانی کرتے ہیں۔ اور اگر مشیر رکھے ہوئے ہیں تو ایسے جو محض ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہوں، جو کچھ صاحب اقتدار نے کہہ دیا انہوں نے اس پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ یہی چیز

قوم کو تباہی کی طرف لے جانے والی ہے۔

توکل، انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا خصوصی شعار

فَاِذَا عَزَمۡتَ پھر جب آپ ﷺ پختہ ارادہ کرلیں۔آپ معاملہ کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں مشورہ کے ذریعے کوئی بات طے ہوجائے فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ تو اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس معاملہ میں عمل پیرا ہوجائیں اور کوئی حکم ہو تو اس کو جاری کردیں۔اس سے مفسرین کرام نے قانون اخذ کیا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں آراء مختلف ہوں تو پھر امیر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلہ کو قبول کرے یا اقلیت کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے اپنا آخری فیصلہ جاری کردے۔عام دنیوی امور میں کثرت رائے کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے۔مگر اسلام کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی معاملہ اتفاق رائے سے طے ہوتا ہے تو اسے بعینہٖ تسلیم کرلیا جائے اور اگر اس میں اختلاف رائے واقع ہوجائے تو پھر امیر اپنی صوابدید سے اکثریت یا اقلیت میں سے کوئی بھی رائے تسلیم کرکے فیصلہ دے سکتا ہے وہ کثرت رائے کو تسلیم کرنے کا پابند نہیں ہے۔اسی لیے فرمایا کہ اے نبی کریم! جب آپ کسی کام کا پختہ ارادہ کرلیں، تو پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے۔اس کو پایہ تکمیل پر پہنچا دیں۔کیونکہ معاملہ جنگ کا ہو یا کوئی اور ہو اس کا بناؤ یا بگاڑ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔وہ مسبب الاسباب ہے۔آپ اس کے بھروسہ پر کام شروع کردیں کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ ﴿۱۵۹﴾ بیشک اللہ تعالیٰ انہی کو پسند فرماتا ہے جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ متوکل علی اللہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے معبود حقیقی کو پہچانتے ہیں۔اللہ تعالیٰ پر توکل یعنی بھروسہ کرنا انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقہ اور اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے۔قرآن وحدیث میں توکل علی اللہ کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔ صرف قرآن کریم میں سات مرتبہ ”وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ“ فرما کر مومنوں کو صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کی تاکید کی گئی ہے، یعنی حکم خداوندی ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو صرف اللہ ہی کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہیے۔آئیے! سب سے قبل توکل کے معنی سمجھیں: توکل کا لفظی معنی ”کسی معاملہ میں کسی ذات پر اعتماد کرنا“ ہے، یعنی اپنی عاجزی کا اظہار اور دوسرے پر اعتماد

اور بھروسہ کرنا توکل کہلاتا ہے۔

اس یقین کے ساتھ اسباب اختیار کرنا کہ دنیوی واُخروی تمام معاملات میں نفع ونقصان کی مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کے حکم کے بغیر کوئی پتا درخت سے نہیں گرسکتا، ہر چھوٹی بڑی چیز اپنے وجود اور بقا کے لیے اللہ کی محتاج ہے، غرض یہ کہ خالق کائنات کی ذاتِ باری پر مکمل اعتماد کر کے دنیاوی اسباب اختیار کرنا توکل علیٰ اللہ ہے۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اُسے مرض سے شفایابی کے لیے دوا کا استعمال تو کرنا ہے، لیکن اس یقین کے ساتھ کہ جب تک اللہ تعالیٰ شفا نہیں دے گا، دَوا اَثر نہیں کرسکتی۔ یعنی دنیاوی اسباب کو اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا نظام یہی ہے کہ بندہ دنیاوی اسباب اختیار کر کے کام کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسا کرے، یعنی یہ یقین رکھے کہ جب تک حکم خداوندی نہیں ہوگا، اسباب اختیار کرنے کے باوجود شفا نہیں مل سکتی۔

الغرض! پیغمبر اسلام ﷺ میں نرم خوئی، نرم گفتاری اور نرم روی کا جو خاص وصف ہے اور جس کا یہ اثر ہے کہ آپ ﷺ نہ صرف دشمنوں؛ بلکہ ناتربیت یافتہ رفقاء کی غلطیوں کو بھی برداشت کر جاتے ہیں اور اپنے ذاتی معاملہ میں کتنی ہی ناگوار خاطر بات ہو جائے نہ پیشانی پر شکن آتی ہے اور نہ دل پر کوئی میل آتا ہے، یہ بھی خدا کی ایک بہت بڑی رحمت ہے؛ کیوں کہ پیغمبر کا کسی سے رنجیدہ خاطر ہو جانا دنیا ہی کا نہیں، آخرت کا بھی نقصان ہے اور تمام نیکیوں کو ضائع کرنے کے لئے کافی ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ داعی کے لئے نرم گفتار اور نرم خو ہونا ضروری ہے، ورنہ بجائے اس کے کہ لوگوں میں اُس کی دعوت کے تئیں محبت پیدا ہو نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اور اس آیت میں صحابہ علیہم الرضوان کی دل جوئی فرمائی گئی کہ رسول اللہ ﷺ ان سے درگذر بھی کریں، ان کے حق میں دعاءِ مغفرت بھی کریں اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ بھی نبی کو وحی کے ذریعہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے علم حاصل ہوتا ہے، اس کے باوجود آپ ﷺ کو بھی مشورہ کا حکم دیا گیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں مشورہ کی کیا کچھ اہمیت ہے؟ اور مشورہ کے آداب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ مشورہ اہم اُمور میں ہے

یعنی جو باتیں نہ واجب ہوں نہ صراحتاً ان سے منع کیا گیا ہو، دونوں پہلوؤں کی گنجائش ہو، ان کے بارے میں ان لوگوں سے مشورہ کرنا چاہئے، جو اس مسئلہ میں مشورہ دینے کے اہل ہوں؛ تاہم امیر اس کا پابند نہیں کہ وہ اپنے رفقاء کے مشورہ ہی پر عمل کرے؛ بلکہ اس کی نگاہ اللہ پر ہو، رفقاء کے مشورہ کی روشنی میں اللہ تعالیٰ جو بات اس کے دل میں ڈالیں، اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہو جائے، گویا لوگوں کا اعتماد امیر پر ہو اور امیر کی نظر اللہ پر ہو۔

اسباب اختیار کرنے حکم، لیکن بھروسا اللہ کی ذات پر

اِنۡ	اگر	یَّنۡصُرۡ کُمُ اللّٰهُ	مدد کرے تمہاری اللہ		
فَلَا غَالِبَ	تو نہیں کوئی غالب آنے والا	لَـکُمۡ	تم پر		
وَاِنۡ	اور اگر	یَّخۡذُلۡکُمۡ	وہ تمہیں (بے مدد) چھوڑ دے		
فَمَنۡ	تو کون ہے	ذَا الَّذِیۡ	وہ جو		
یَنۡصُرُ کُمۡ	تمہاری مدد کرے گا	مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ	اس کے بعد		
وَ عَلَی اللّٰهِ	اور اللہ ہی پر	فَلۡیَتَوَ كَّلِ	پس چاہیے کہ بھروسہ کریں		
الۡمُؤۡمِنُوۡنَ	ایمان والے۔(160)				

اللہ تعالیٰ نے دوسرا قانون یہ بیان فرمایا اِنۡ یَّنۡصُرۡ كُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَـكُمۡ ۚ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا تو کوئی دوسرا تم پر غالب نہیں آسکتا۔ اللہ تعالیٰ نیکی کے کاموں میں مدد کرے گا۔ فسق و فجور، عیاشی، فحاشی اور فیشن کے کاموں میں مدد نہیں کرے گا اور نہ وہ ایسے لوگوں کو غالب کرے گا۔ اور دوسری بات یہ۔ وَاِنۡ یَّخۡذُلۡكُمۡ اور اگر وہ تم کو رسوا کردے۔ اور وہ برائی، بے حیائی، ظلم اور کفر کرنے والوں کو ذلیل وخوار بھی کر دیتا ہے۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو فرمایا یاد رکھو! فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُ كُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ پھر اس کے سوا تمہاری کون مدد کرے گا۔ کوئی بڑے سے بڑا حاکم بادشاہ یا ڈکٹیٹر کوئی بھی ہو تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکتا کیونکہ احکم الحاکمین نے تمہاری مدد روک لی ہے اور اس سے بڑی سپر پاور اور کوئی نہیں جو اس کے حکم اور ارادے کو بھی

چیلنج کر سکے، لہٰذا تمہیں اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوگا، اس کی مشیت کے خلاف کوئی بھی تمہاری مدد کو نہیں پہنچے گا۔ فرمایا جب یہ اصول اٹل ہے تو پھر یہ بھی حقیقت ہے **وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴿۱۶۰﴾** کہ جن لوگوں کے دل نور ایمان سے منور ہیں وہ اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ ادھر ادھر اندھیرے میں ٹکریں نہیں مارتے۔ غیر اللہ کے دروازوں پر نہیں جاتے بلکہ فقط اسی ذات وحدہ لاشریک پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے معاملات اسی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اسباب تو ہمیں اختیار کرنے چاہئیں، لیکن ہمارا بھروسا اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے کہ وہ اسباب کے بغیر بھی چیز کو وجود میں لا سکتا ہے اور اسباب کی موجودگی کے باوجود اس کے حکم کے بغیر کوئی بھی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلتی ہوئی آگ میں ڈالا گیا، جلانے کے سارے اسباب موجود تھے، مگر حکم خداوندی ہوا کہ آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے سلامتی بن جائے تو آگ نے اُنہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچایا، بلکہ وہ آگ جو دوسروں کو جلا دیتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی کا سبب بن گئی۔ اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر طاقت کے ساتھ تیز چھری چلائی گئی، مگر چھری بھی کاٹنے میں اللہ کے حکم کی محتاج ہوتی ہے، اللہ نے اُس چھری کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن کو نہ کاٹنے کا حکم دے دیا تھا، لہٰذا کاٹنے کے اسباب کی موجودگی کے باوجود چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن نہیں کاٹ سکی۔ اسباب و ذرائع و وسائل کا استعمال کرنا منشائے شریعت اور حکم الٰہی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اسباب و وسائل کو اختیار بھی فرمایا اور اس کا حکم بھی دیا، خواہ لڑائی ہو یا کاروبار، ہر کام میں حسبِ استطاعت اسباب کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس آیت کریمہ میں فرمایا کہ بھروسہ کے لائق ایسی ہی ذات ہو سکتی ہے جو سب سے زبردست اور غالب ہو سب مسلمانوں کو اس کی امداد پر توکل کرنا چاہئے۔

مقصدِ حیات رضائے الٰہی کی تلاش

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

شانِ نبوت کے منافی

وَمَا كَانَ	اور نہیں ہے	لِنَبِيٍّ	لائق کسی نبی کے
اَنْ يَّغُلَّ	کہ چھپائے	وَمَنْ يَّغْلُلْ	اور جو چھپائے گا
يَاْتِ	(تو) لائے گا وہ	بِمَا غَلَّ	جو اس نے چھپایا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن	ثُمَّ تُوَفّٰى	پھر پورا (بدلہ) پائے گا
كُلُّ نَفْسٍ	ہر شخص	مَّا كَسَبَتْ	جو اس نے کمایا
وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ		اور وہ نہیں ظلم کیے جائیں گے۔(161)	

ارشاد ہوتا ہے وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ یہ بات کسی نبی کے لائق نہیں کہ وہ خیانت کرے یا کسی چیز کو چھپائے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق غزوہ بدر سے متعلق ایک واقعہ

کے ساتھ ہے۔ جنگ بدر میں جو مال غنیمت مسلمانوں کو حاصل ہوا، اس میں سے ایک کمبل یا چادر گم پائی گئی۔ اس کے متعلق لوگوں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا۔ بعض نے کہا کہ شاید یہ چادر حضور ﷺ نے خود لے لی ہو۔ اس قسم کی بات اگر منافق کرے تو اس سے کچھ بعید کیونکہ انہیں تو بات کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ چاہئے۔ البتہ اگر کسی مسلمان نے یہ بات کی ہوگی تو یہ سمجھ کر کہ حضور نبی کریم ﷺ کو کوئی بھی چیز حاصل کرنے کا مکمل حق حاصل ہے۔ لہذا اسی حق کی بناء پر آپ نے یہ چادر لے لی ہوگی۔ بایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے نبی کی طرف سے ایسے فعل کے ارتکاب کی سختی سے تردید فرمائی۔ اور لوگوں کو خبردار کیا کہ تمہارا نبی اخلاق کے عالی مرتبے پر فائز ہے۔ لہذا یہ گمان بھی نہ کرنا کہ مسلمانوں کی اطلاع کے بغیر خود بخود بھی کوئی چیز اپنے لیے رکھ لے گا۔ اس آیت میں اس بات کی سختی سے نفی کی گئی ہے کہ کوئی بھی نبی خیانت (مال غنیمت، احکام الٰہی یا تبلیغِ دین میں کمی بیشی) کا ارتکاب کرسکتا ہے۔ مفسرین کے مطابق یہ آیت جنگِ بدر یا احد کے موقع پر مالِ غنیمت کی تقسیم سے متعلق بعض صحابہ کے غلط فہمی یا منافقین کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کے پس منظر میں نازل ہوئی تھی، جس پر اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ انبیاء اس عیب سے بالکل پاک ہوتے ہیں۔ اس آیت کریمہ سے کئی مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ غنیمت کی تقسیم کے بغیر ناجائز طریقہ پر کچھ لینا سخت حرام ہے۔ دوسرا یہ کہ نبی عَلَیْہِ السَّلَام گناہوں سے معصوم ہیں۔ گناہ اور نبوت میں وہی نسبت ہے جو اندھیرے اور اجالے میں ہے۔ تیسرا یہ کہ نبی عَلَیْہِ السَّلَام پر بدگمانی منافقوں کا کام ہے اور کفر ہے۔ چوتھا یہ کہ نبی ربُّ العالمین عَزَّ وَجَلَّ کے ایسے پیارے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر سے لوگوں کی تہمتیں دور فرماتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں خیانت کی مذمت بھی بیان فرمائی کہ جو کوئی خیانت کرے گا وہ کل قیامت میں اس خیانت والی چیز کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ احادیث میں بھی خیانت کی بہت مذمت بیان کی گئی ہے، چنانچہ سرورِ کائنات صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے جہنمیوں میں ایسے شخص کو بھی شمار فرمایا جس کی خواہش اور طمع اگرچہ کم ہی ہو مگر وہ اسے خیانت کا مرتکب کردے۔ (مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا واہلہا، باب الصفات التی یعرف بہا فی الدنیا اہل الجنۃ واہل النار، ص ۱۵۳۲، الحدیث:

۶۳((۲۸۶۵)) حضرت انس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنہُ سے روایت ہے، سرکارِ عالی وقار صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''جو امانت دار نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔ (مسند امام احمد، مسند المکثرین من الصحابۃ، مسند انس بن مالک بن النضر، ۴ / ۲۷۱، الحدیث: ۱۲۳۸۶) حضرت ابو امامہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنہُ سے روایت ہے، رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''مومن ہر عادت اپنا سکتا ہے مگر جھوٹا اور خیانت کرنے والا نہیں ہوسکتا۔ (مسند امام احمد، مسند الانصار، حدیث ابی امامۃ الباہلی، ۸ / ۲۷۶، الحدیث: ۲۲۲۳۲)

الغرض! فرمایا کسی نبی کے یہ لائق نہیں کہ وہ خیانت کرے۔ وَمَنۡ یَّغۡلُلۡ اور جو کوئی خیانت کا ارتکاب کرے گا یَاۡتِ بِمَا غَلَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚ تو وہ خیانت شدہ چیز کو قیامت کے دن اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ اور پھر اس کی رسوائی ہوگی۔ غل کا معنی دراصل ایسے خزانہ سے چوری کرنا ہے جو سب کی مشترکہ ملکیت ہو۔ لہذا اس کا معنی چوری بھی ہوسکتا ہے اور خیانت بھی۔ پھر غل کا لفظ دل میں کدورت، بغض وعناد کو چھپائے رکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے بعض علماء نے یہ معنی بھی کیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اپنی نافرمانی کرنے والوں کو معاف کر دینے کے بعد اس کے دل میں کچھ کدورت باقی رہ جائے۔ گویا اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر رسول اللہ غنائم اور صدقات کو تقسیم کرنے کی کوئی مصلحت ملحوظ رکھیں یا قوم یا رفاہ عامہ کے لیے کچھ حصہ بیت المال میں جمع کریں یا کسی وجہ سے تقسیم غنائم میں دیر ہو تو نبی کے متعلق انہیں ہرگز کسی قسم کی بدگمانی نہ ہونا چاہئے۔ نبی سے متعلق ایسی بدگمانی کرنا نفاق کی علامت ہے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ایسے ہی مواقع پر مسلمانوں کے دلوں میں بدگمانی ڈالا کرتے تھے، ایسی بدگمانیوں سے قوم میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ ملت کا شیرازہ بکھرتا ہے اور اس کا انجام بغاوت ہوتا ہے۔ لہذا مسلمانوں کو اس معاملہ میں بالخصوص اور عام حالات میں بھی بدظنی سے اجتناب کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔

خیانت کا تدارک

رہا یہ مسئلہ کہ یہ اندرونی بیماری کیسے دور ہوگی؟ اس باطنی مرض سے نجات وحفاظت کے لیے ہمارے لیے کون سا نسخہ مفید یا کارگر ثابت ہوگا؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ خیانت کا تعلق، جیسا کہ واضح ہوگیا، انسان کے اندرون سے ہے، یعنی یہ ایک چھپی ہوئی بیماری ہے۔ اس لیے اللہ رب العزت کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے میں یقین کو تازہ بتازہ رکھنا اور اسے مستحکم بنانا اور ہمیشہ اس حقیقت کا استحضار بہت مفید ومؤثر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ظاہر وباطن ہر بات، کھلے وچھپے ہر قول وفعل سے باخبر رہتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا تجویز کردہ ہے، انھی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں: ''خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک ایک عضو سے ہوسکتی ہے، یہاں تک کہ چشم وابرو کے اشاروں سے ہوسکتی ہے، لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو۔ اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے، فرمایا: يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ ٱلۡأَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِي ٱلصُّدُورُ ١٩ (المومن ۴۰:۱۹) ''اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہوا سینوں میں ہے'' (سیرۃ النبیؐ، ج۶ ص ۳۹۸)۔ اللہ رب العزت سے یہی دعا ہے کہ وہ خیانت جیسی مہلک بیماری سے ہم سب کو محفوظ رکھے اور ہمیں نیکیوں کی راہ پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ فرمایا قیامت کے دن تمام پوشیدہ اعمال ظاہر کردینے کے بعد ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ ہر نفس کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُونَ ١٦١ اور کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کہ یہ تمہارے خود کردہ اعمال ہیں، میں نے ان کو شمار کر رکھا ہے اب اس کا بھگتان کرو۔ ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہوگا۔ کسی کا عمل کسی دوسرے کے ذمے نہیں لگایا جائیگا۔ اور ہر جرم کی سزا جرم کی سنگینی کے مطابق دی جائے گی۔ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں بیحد وبیشمار ہوں گی اس کی رحمت کے دروازے کھلے ہوں گے۔ نیکی کا اجر کم از کم دس گنا ہوگا جو بڑھ کر سات سو تک یا لاکھوں گنا تک بھی ہوسکتا ہے۔

رضائے الٰہی کا حصول کیوں ضروری ہے؟

اَفَمَنِ	کیا پھر جس نے	اتَّبَعَ	پیروی کی
رِضْوَانَ اللّٰهِ	رضائے الٰہی کا	كَمَنْ	اُس شخص کے مانند ہوگا جو
بَآءَ	لوٹا	بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ	اللہ کی ناراضی کے ساتھ
وَمَاْوٰىهُ	اور اس کا ٹھکانہ	جَهَنَّمُ	جہنم ہے
وَبِئْسَ	اور بری ہے (وہ)	الْمَصِيْرُ	لوٹنے کی جگہ۔(162)

آگے ارشاد ہوتا ہے اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ کیا وہ شخص جو اللہ کی رضا چاہتا ہے اس شخص کی مانند ہے جو اللہ کی ناراضگی لے کر لوٹا ہے۔کفر، شرک، نافرمانی، حق تلفی، چوری، خیانت وغیرہ خدا کی ناراضگی کے کام ہیں۔جو شخص عمر بھر ان کاموں میں لگا رہا وہ اس شخص کی طرح کیسے ہوسکتا ہے۔جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرتا ہے، اس کے احکام پر عمل کرتا ہے۔اور مخلوق خدا کی خدمت کرتا ہے۔اللہ کی ناراضگی مول لینے والے کے متعلق فرمایا وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ ایسے شخص کا ٹھکانا دوزخ ہے وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ اور یہ لوٹ کر جانے کی نہایت ہی بری جگہ ہے۔اعمال کی قبولیت کے لیے رضائے الٰہی اور اخلاصِ نیت نہایت ضروری ہے۔اگر انسان کے پیشِ نظر اللہ کی خوشنودی نہیں ہے اور وہ محض اپنی ذات کو شہرت کی بلندی تک پہنچانے کے لئے اور مقبولیت کا مقام حاصل کرنے کیلئے ہر جائز و ناجائز طریقے اپناتا ہے تو اللہ رب العزت کی نگاہ میں وہ مردود ہوجاتا ہے۔جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی نہ امید رکھتا ہے نہ شوق۔عمل کی قبولیت حسن نیت پر ہے اور حسن نیت کا نکھار اور کمال اللہ کی رضا سے ہے۔اللہ تعالیٰ کا کسی بندے سے راضی ہوجانا دراصل دنیا و آخرت کی سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑا انعام ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔(الفتح،29:48)''اے دیکھنے والے تو دیکھتا ہے کہ وہ کبھی رکوع کبھی سجود میں ہیں (غرض ہر طرح) اللہ سے اس کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہیں۔''یعنی رضائے الٰہی کے طلبگاروں کو کسی چیز کی پروا نہیں وہ صرف

اور صرف اپنے رب کی رضا کے طالب ہیں ۔ارشاد ہوتا ہے: وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (التوبہ،9: 72)''اور اللہ کی رضا سب سے بڑھ کر ہے ۔''

اللہ تعالیٰ کائنات کا خالق و مالک ہے، ہر کوئی اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے مگر اللہ کسی کا محتاج نہیں ۔ شان صمدیت کا مالک اور منتہائے رضا کا حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے مخلوق کے لئے اپنے خالق و مالک کی رضا حاصل کرنا بہت ضروری ہے ۔اگر بندہ خود کو غلام اور اللہ تعالیٰ کو اپنا رب، خالق اور مالک حقیقی سمجھتا ہے تو پھر کونسا غلام ہوگا جسے اپنے مالک کی خوشنودی مطلوب نہ ہو اور پھر نیک اعمال کی انجام دہی یہی جذبہ رضائے الٰہی کے لئے ایک محرک کا کام دیتا ہے ۔ یہ ایسا بہترین محرک ہے کہ اگر بندے کے دل کا مرکز ومحور صرف اور صرف اللہ کی رضا ہو تو دلوں کو ہر طرح کی آلائشوں سے نجات مل جاتی ہے ۔ ہر طرح کے خوف، لالچ، حرص و ہوس، غرور و تکبر اور حسد و منافقت وغیرہ حرف غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں اور دل پاک صاف ہو کر اللہ کی محبت کا ٹھکانہ بن جاتے ہیں اس حالت میں جو بھی عمل کرے گا وہ خواہ ادنیٰ سا ہی کیوں نہ ہو اللہ کی بارگاہ میں قبولیت کا شرف پا کر حسین ہو جائے گا۔اس پر اللہ کی رضا و خوشنودی کی چھاپ لگ جائے گی اور یوں بندہ درجہ احسان پر فائز ہو جائے گا۔اس لیے رضائے الٰہی کا حصول ضروری ہے ۔

ایمان باللہ کی بنیاد

بطور مسلمان ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہماری زندگی کا مقصد اور ہمارا حتمی ہدف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے ۔اعمال اور عبادات پر کامل توجہ دینی ہے، اور اللہ سے یہ امید رکھنا چاہیے کہ اللہ مجھ سے راضی ہے، کیوں کہ اللہ کے بارے میں حسنِ ظن ایمان باللہ کی بنیاد ہے اس کی رحمت، جود وسخا، اس کی ہیبت اس کے قادر مطلق ہونے پر یقین ہمارے عقیدے کا لازمی جز ہے، لہذا عبد کو معبود کے بارے میں ہمیشہ بہترین گمان رکھنا چاہیے، کیوں کہ اللہ کے بارے میں حسنِ ظن رکھنے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا، جب بندہ اللہ کو دل کے یقین کے ساتھ پکارتا ہے تو اس کا رب اس کی پکار کو خالی ہاتھ نہیں

لوٹاتا، یہ اس ذاتِ باری تعالیٰ کی شان کے برعکس ہے کہ اس کا بندہ بہت مان سے دستِ سوال دراز کرے اور وہ عطا کرنے میں بخل کرے، اس کا بندہ جب بھول چوک کر گزرے اور نفس لوامہ کی تنبیہ پہ پلٹ کر اس غفور الرحیم کی جانب توبۃ النصوح کی نیت سے رجوع کرے تو اس کی شانِ کریمی جوش میں کیوں نہ آئے؟ اس کا بندہ اس کی رضا پانے کی طلب میں اعمالِ صالح کے لیے حریص ہو تو وہ اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے، کیوں اس کے اجر میں کمی کرے کیوں اس سے محبت نہیں رکھے گا، بات صرف اس سے آس لگانے کی ہے کہ اس کے خزینے تو بھرے پڑے ہیں، البتہ عمل کئے بغیر حسنِ ظن رکھنا تو یہ اللہ سے بے جا تمنائیں لگانے کے قبیل سے ہے، نیز یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت صرف نیک لوگوں کے ساتھ خاص نہیں ہے، جو عبادات اور اعمال میں ہمہ تن مصروف رہے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بھی محبت کرتا ہے اور تعلق رکھتا ہے جن سے گناہ سرزد ہوتے ہیں، لیکن اپنے گناہوں پر پشیمانی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتے ہیں۔

نیکی اور بدی کے درجات

هُمۡ دَرَجٰتٌ	وہ۔(الگ الگ) درجوں میں ہوں گے		عِنۡدَ اللّٰهِ		اللہ کے ہاں
وَاللّٰهُ	اور اللہ		بَصِيۡرٌ		خوب دیکھنے والا ہے
بِمَا	اس کو جو		يَعۡمَلُوۡنَ		وہ کرتے ہیں۔(163)

ہر نیک و بد کے متعلق فرمایا هُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ اللّٰهِ ط اللہ کے ہاں ان سب کے درجات ہیں۔ نیکی کے بھی درجات ہیں اور برائی کے بھی درجات ہیں۔ جس قسم کا عمل ہوگا، اسی قسم کی جزا ہوگی۔ مجرمین میں سے چور، ڈاکو اور خائن وغیرہ کا درجہ الگ ہوگا۔ کافر الگ ہوں گے۔ مشرک اور بدعتی اپنے درجے میں ہوں گے عیاشی، فحاشی اور شراب نوشی کرنے والے اس درجہ میں ہوں گے۔ عیاشی، فحاشی اور شراب نوشی کرنے والے اس درجہ میں ہوں گے۔ اور ان سے ایک ایک

جرم کا مواخذہ کیا جائے گا۔اور درجہ بدرجہ سزا دی جائیگی۔اسی طرح نیکی کے بھی درجات ہوں گے۔ اللہ نے فرمایا وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ہر شخص کے درجات اس کے عمل کے مطابق ہوں گے۔جس طرح دنیا میں اونچ نیچ ہے اسی طرح آخرت میں بھی تفاوت ہوگا۔بعض لوگ نہایت بلند درجوں میں ہوں گے اور بعض نہایت ہی پستی میں ہوں گے۔فرمایا: وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔لہذا وہ اعمال کے مطابق ہی جزا اور سزا کا فیصلہ کرے گا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقاصدِ بعثت اور ہماری ذمہ داری

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

قرآن میں مقاصدِ بعثت کا تذکرہ

لَقَدْ	البتہ تحقیق	مَنَّ اللّٰهُ	اللہ نے احسان کیا
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ	مومنوں پر	اِذْ بَعَثَ	جب اس نے بھیجا
فِيْهِمْ	ان میں	رَسُوْلًا	ایک رسول
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ	انہی میں سے	يَتْلُوْا	وہ تلاوت کرتا ہے
عَلَيْهِمْ	ان پر	اٰيٰتِهٖ	اس کی آیتیں
وَيُزَكِّيْهِمْ	اور انہیں پاک کرتا ہے	وَيُعَلِّمُهُمُ	اور انہیں سکھلاتا ہے
الْكِتٰبَ	کتاب	وَالْحِكْمَةَ	اور حکمت
وَاِنْ	اور بلاشبہ	كَانُوْا	تھے وہ
مِنْ قَبْلُ	اس سے پہلے	لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ	البتہ کھلی گمراہی میں۔

ارشاد ہوتا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ من کا عام فہم معنی احسان کرنا ہے۔ جب کہ اس کا اصل معنی قطع کرنا ہے۔ عربی محاورے کے مطابق جس شخص کو نعمت حاصل ہو جائے اس کی تکلیف قطع ہو جاتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہوتا ہے۔ من کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے (1) احسان کرنا، (2) احسان جتلانا، (3) کاٹنا اور کٹنا اور جب یہ لفظ احسان کرنے کے معنی میں آئے تو اس سے مراد کوئی بہت بڑا احسان ہوتا ہے۔ اور وہ بہت بڑا احسان وحی الٰہی اور اس کی روشنی ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا زیادہ احسان بھی انہی پر ہے اور وہ احسان یہ ہے اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا کہ ان میں ایک رسول بھیجا اور رسول بھی وہ جو عظیم الشان، عالی مرتبت اور کمال عظمت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دو عظیم نعمتوں میں سے پہلی نعمت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مبارک ہے۔ جو تمام انسانیت کے لیے بالعموم اور اہل ایمان کے لیے بالخصوص بہت بڑی نعمت ہے۔ کسی انسان کو جس قدر کمالات حاصل ہو سکتے ہیں، وہ صرف پیغمبر (علیہ السلام) کے واسطے سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر کی ذات ایک مومن کے لیے حصول کمال کا ذریعہ بھی ہے اور تقرب الی اللہ کا بھی اور پھر بالآخر نجات کا ذریعہ بھی یہی ہے۔ لہٰذا عظیم ترین نعمت یہی ہے مِّنْ اَنْفُسِهِمْ انہی میں سے یعنی انسانوں میں سے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملائکہ یا جنات میں سے نہیں بنایا بلکہ اہل ایمان کی جنس انسانی میں سے اٹھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بشر ہونے اور انسانوں ہی میں سے ہونے کو ایک احسان کے طور پر بیان کر رہا ہے اور فی الواقع یہ احسان عظیم ہے کہ اس طرح ایک تو وہ اپنی قوم کی زبان اور لہجے ہی میں اللہ کا پیغام پہنچائے گا، جسے سمجھنا ہر شخص کے لیے آسان ہو گا، دوسرے لوگ ہم جنس ہونے کی وجہ سے اس سے مانوس اور اس سے قریب ہوں گے اور تیسرے انسان کے لیے انسان، یعنی بشر کی پیروی تو ممکن ہے، لیکن فرشتوں کی پیروی اس کے بس کی بات نہیں، نہ فرشتوں میں وہ کمزوریاں اور ضرورتیں پائی جاتی ہیں جو انسان میں ہیں اور نہ فرشتہ انسان کے وجدان وشعور کی گہرائیوں اور باریکیوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس لیے اگر پیغمبر فرشتوں میں سے ہوتے تو وہ ان ساری ضروریات سے محروم ہوتے جو تبلیغ و دعوت

کے لیے لازمی ہیں، اس لیے جتنے انبیاء علیہم السلام بھی آئے سب کے سب بشر ہی تھے۔ قرآن مجید نے ان کی بشریت کو خوب کھول کر بیان کیا ہے۔

یوں تو آپ ﷺ کی بعثت پوری انسانیت کے لئے اللہ تعالیٰ کی نعمت عظمیٰ ہے؛ لیکن مسلمانوں کے لئے یہ دوہری نعمت ہے؛ کیوں کہ کوئی بھی شئ اصل میں نعمت اسی شخص کے حق میں ہوتی ہے، جس کو اس سے نفع اُٹھانے کی توفیق میسر آتی ہو اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مسلمانوں کو حاصل ہوئی نبی کے بشر اور انسانوں میں سے ہی ہونے کو اللہ تعالیٰ ایک احسان کے طور پر بیان کر رہا ہے اور فی الواقع یہ احسان عظیم ہے کہ اس طرح ایک تو وہ اپنی قوم کی زبان اور لہجے میں ہی اللہ کا پیغام پہنچائے گا جسے سمجھنا ہر شخص کے لئے آسان ہو گا۔ دوسرے، لوگ ہم جنس ہونے کی وجہ سے اس سے مانوس اور اس کے قریب ہوں گے۔ تیسرے انسان کے لئے انسان، یعنی بشر کی پیروی تو ممکن ہے لیکن فرشتوں کی پیروی اس کے بس کی بات نہیں اور نہ فرشتہ انسان کے وجدان و شعور کی گہرائیوں اور باریکیوں کا ادراک کرسکتا ہے۔ اس لئے اگر پیغمبر فرشتوں میں سے ہوتے تو وہ ان ساری خوبیوں سے محروم ہوتے جو تبلیغ و دعوت کے لئے نہایت ضرورت ہے۔ اس لئے جتنے بھی انبیاء علیہم السلام آئے ہیں سب کے سب بشر ہی تھے۔ قرآن نے ان کی بشریت کو خوب کھول کر بیان کیا ہے۔ مثلاً فرمایا وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ (یوسف:109) "ہم نے آپ (ﷺ) سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے وہ مرد تھے جن پر ہم وحی کرتے تھے"، وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ (سورۃ الفرقان:20) "ہم نے آپ (ﷺ) سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے، سب کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے تھے"۔ اور خود نبی ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (سورہ حم السجدہ:6) "آپ (ﷺ) کہہ دیجئے میں بھی تو تمہاری طرح صرف بشر ہی ہوں البتہ مجھ پر وحی کا نزول ہوتا ہے"۔ آج بہت سے افراد اس چیز کو نہیں سمجھتے اور انحراف کا شکار ہیں۔ بہر حال مِّنْ أَنفُسِهِمْ (ان ہی میں سے) کہہ کر یہ بتا دیا گیا

کہ رسول بھی انسان ہی ہوتے ہیں، فرشتہ یا کوئی اور مخلوق نہیں ہوتے، کیوں کہ انسان کے لئے انسانی نمونہ ہی موزوں ہوسکتا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ نور ہدایت یقیناً ہیں۔آپ کے نور ہدایت کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیلی۔مگر آپ انسان اور بشر ہیں اور بڑے بڑے عالی مرتبے والے ہیں۔حضور ﷺ کی بشریت کا اقرار قطعاً باعث توہین نہیں بلکہ اشرف المخلوقات میں سے ہونے کی بناء پر آپ کی عظمت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ابوالبشر حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق پر اللہ نے بطور انعام اس بات کا اعلان فرمایا کہ دیکھو میں نے مٹی سے کس قدر با کمال ہستی کو پیدا کیا ہے۔لہذا بشر ہونا کمال کی علامت ہے نہ کہ توہین کی۔صحابہ کرام بھی حضور ﷺ کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ان کے زمانہ میں نور من نور اللہ کا کوئی عقیدہ موجود نہیں تھا۔آپ نور ہدایت ہیں مگر انسان ہیں۔مسلم کی روایت میں موجود ہے کہ نبی (علیہ السلام) نے خود فرمایا میں بھی انسان ہوں۔میں بھی کبھی کبھی بھول جاتا ہوں۔اگر نماز میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلادیا کرو۔

پہلا مقصد تلاوتِ قرآن

آیت کے اگلے حصے میں اللہ نے اپنے نبی کے وہ کام بیان فرمائے ہیں جو وہ انجام دیتا ہے۔پیغمبر خدا (علیہ السلام) کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ، وہ لوگوں کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔وہ لوگوں کو اللہ کے کلام اور اس کے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔یہ تلاوت پاک ہے اور اس لحاظ سے حضور ﷺ اولین مبلغ اسلام ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے امت میں تلاوتِ قرآن کی عظمت واہمیت کو عام فرمایا اور اس کے فوائد و برکات سے آگاہ کیا اور انسانوں کے ہاتھ میں خدا کا یہ عظیم کلام سونپا جس کی وجہ سے انسانیت قعرِ مذلت سے نکلی اور تلاوتِ قرآن کا ایسا ذوق ان کو عطا کیا کہ اس سے کسی لمحہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو سیری حاصل نہیں ہوتی تھی اور خود آپ ﷺ جب قرآن کریم کی تلاوت فرماتے کتنے ہی پتھر دل موم ہوجاتے اور کیسے کیسے سخت مزاج انسان نرم پڑجاتے اور قرآن کی حقانیت وعظمت کا اقرار کیے بغیر نہیں رہتے اور بہت سے لوگ اسی قرآن کی سماعت سے

دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ دنیا میں جو کچھ انقلاب نظر آ رہا ہے۔ بلاشبہ یہ اس عظیم کتاب کی بدولت ہے جو صاحب کتاب سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے بطور امانت انسانوں تک پہنچایا اور اس کے تقاضوں کو عملی طور پر پورا کر کے دکھایا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں انقلابی اثرات اسی کلام نے پیدا کیے اور وہ انسانوں کو رہبر اور رہنما بنے بھی تو اسی قرآن کی تعلیمات پر عمل کر کے بنے۔ قرآن نے ہر شعبۂ زندگی میں مثالی انقلاب برپا کیا۔ تلاوتِ قرآن کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: جو قرآن کریم پڑھنے میں اس قدر مستغرق ہو کہ اس سے دعا مانگنے کا موقع ملے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مانگنے والوں سے زیادہ ایسے بندے کو عطا کروں گا۔ (ترمذی: ۲۸۶۹) حضرت انس سے رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے اس میں فرشتے آتے اور شیاطین دور ہو جاتے ہیں، وہ اپنے صاحب خانہ کے لیے کشادہ ہو جاتا ہے اور اس میں بھلائی کی بہتات اور شر کی قلت ہو جاتی ہے، اور جس گھر میں قرآن کی تلاوت نہ ہو اس میں شیاطین آجاتے ہیں، فرشتے نکل جاتے ہیں اور وہ گھر اپنے باسیوں پر تنگ ہو جاتا ہے، خیر کم اور شر بہت بڑھ جاتا ہے۔ (فضائل حفظ القرآن: ۱۳۱)

دوسرا مقصد تزکیۂ نفس

فرمایا حضور اکرم ﷺ کا دوسرا فریضہ مقصد وَيُزَكِّيهِمْ۔ اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔ حضور ﷺ اس لحاظ سے امت کے لیے مرشد ہیں کیونکہ تزکیہ نفس کرنا مرشد کا کام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا تیسرا مقصد دنیا میں بھیجے جانے کا یہ ہے کہ آپ ﷺ انسانوں کے دلوں کو پاک صاف کریں، ان کے دلوں میں کفر و شرک کی جو گندگیاں اور اخلاق و اعمال کی خرابیاں ہیں ان کو نکال باہر کریں اور دلوں کو اس قابل بنائیں کہ وہ یادِ الٰہی کا مسکن اور محبتِ رسول ﷺ کا مرکز بن سکے؛ چناں چہ آپ ﷺ نے جہاں معاشرہ کی اجتماعی اصلاحی کوششیں کی، وہیں انفرادی طور پر بھی دلوں کی اصلاح کا اہتمام فرمایا۔ خدا کی حضوری کا احساس پیدا کیا، روزِ قیامت کی باز پرس کی فکر پیدا کی، اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا خیال دلوں میں راسخ کروایا۔ یہی نتیجہ تھا کہ معمولی درجہ کا گناہ بھی

سرزد ہو جاتا یا تنہائیوں میں کسی جرم کا ارتکاب کر لیتے تو فوری رسالت مابﷺ کے حضور حاضر ہو کر اس کی تلافی کروا لیتے، تاکہ آخرت کے سخت ترین عذاب سے حفاظت ہو جائے۔ انسانی معاشرہ کو آلائشوں اور گندگیوں سے عمومی طور پر بچانا ہو تو فرداً فرداً انسانوں کی اصلاح ضروری ہے۔

تیسرا مقصد قرآنی تعلیمات

فرمایا اللہ کا نبی تیسرا کام یہ کرتا ہے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وہ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیتا ہے۔ کتاب سے مراد قرآن پاک ہے قرآن پاک اگرچہ عربی زبان میں نازل ہوا اور اس کے اولین مخاطبین بھی عرب ہی تھے۔ اس کے باوجود اس کے رموز و نکات کی وضاحت کی ضرورت پیش آتی تھی۔ بعض اوقات بعض امور کو سمجھنے میں اہل زبان بھی دقت محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی نبی کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ امت کو منزل من اللہ کتاب کی تعلیم دے۔ قرآن پاک کی یہ آیت جب نازل ہوئی حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ یعنی جب سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے ظاہر ہو جائے تو سحری کھانا بند کر دو۔ تو بعض اہل زبان نے بھی سفید اور سیاہ دھاگے پاس رکھ لیے، تاکہ اختتام سحری کا تعین کر سکیں۔ جب یہ بات حضورﷺ کے پاس بیان کی گئی تو آپﷺ مسکرائے اور فرمایا تمہارا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے جس میں تم نے رات اور دن کو لپیٹ کر رکھ لیا۔ فرمایا سیاہ اور سفید دھاگے سے مراد رات اور دن ہیں۔ یہ عام دھاگے مراد نہیں ہیں۔ چنانچہ اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مِنَ الْفَجْرِ کے الفاظ کا اضافہ فرما دیا۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کرنے کے ساتھ اس کے معانی و مطالب انسانوں کو سمجھانا یہ بھی نبیﷺ کی عظیم ذمہ داری رہی اور آپﷺ نے الفاظ قرآنی کے ساتھ معانیٔ قرآن بھی بتلائے۔ نبیﷺ نے مرادِ خداوندی کو سمجھایا اور آیات قرآنی کی تشریح کر کے امت کو اس کے مقصد سے آگاہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کیا چاہتے ہیں اس لیے صحابہ کرام علیہم الرضوان جہاں الفاظِ قرآنی کے یاد کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے، وہیں معانی و مطالب کو بھی سمجھنے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ قرآن مجید کو پڑھنے کے ساتھ اس کے معانی اور مضامین میں تدبر کرنا، اس کے مفہوم میں غور و فکر کرنا، تفاسیر قرآن کی روشنی، نبی کریمﷺ کی

تشریحات اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے قرآن مجید کے مقصود تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے؛ کیوں کہ جب تک مطلوب قرآن کو نہیں سمجھا جائے گا تو یقینی طور پر عمل آوری کا جذبہ بھی نہیں ابھرے گا اور اللہ تعالی کیا فرمارہا ہے اس سے آگہی بھی حاصل نہیں ہوگی۔

چوتھا مقصد تعلیم حکمت

چوتھی چیز فرمایا وَالْحِكْمَةَ پیغمبر خدا لوگوں کو حکمت کی تعلیم بھی دیتا ہے۔حکمت کا عام فہم مطلب دانائی، دانشمندی یا گہری سمجھ کی باتیں ہیں۔حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔(تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۲۵۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں انسانوں کے لیے ہر اعتبار سے نمونہ موجود ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر تعلیمات انسانیت کے لیے سعادت وکامیابی کی علامت ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس پر عمل پیرا ہونے میں ہی فلاح دارین پوشیدہ ہے،اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سنت کی تعلیمات سے نوازا اور طریقۂ زندگی کے اصول وآداب بتلائے۔حکمت کی تشریح پہلے اور دوسرے پارے میں بھی تفصیل کے ساتھ آچکی ہے۔فرمایا وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ بیشک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔یعنی اس قدر بھٹکی ہوئی قوم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم قرآن وحکمت،تزکیہ نفس اور تلاوت قرآن کے ذریعے ایک بااخلاق اور متمدن قوم بنادیا۔اس زمانے میں جگہ جگہ بت رکھے ہوئے تھے حتی کہ خود بیت اللہ شریف میں 360 بت تھے،پوری کی پوری قوم شرک کی لعنت میں گرفتار تھی توحید کا تصور رکھنے والا کوئی اکادکا آدمی ہی ملتا تھا۔انہوں نے ملت ابراہیمیہ کے اصولوں کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔گزشتہ چار پانچ صدیوں سے پوری دنیا شرک کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص احسان فرمایا کہ ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما کر ایمان اور نیکی کی دولت عطا فرمائی۔قرآن و سنت جیسی عظیم نعمتیں عطا کیں۔اس سے زیادہ اللہ کا کیا احسان ہوسکتا ہے؟

جہاد میں فتح وشکست کی خدائی حکمتیں/مسلمانوں کے لیے تسلی

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ
عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى
الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَقِيْلَ
لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا
لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ
مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿١٦٧﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ
وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿١٦٨﴾

غزوہ احد اور اطاعت امیر

اَوَلَمَّآ	کیا اور جب	اَصَابَتْكُمْ	تمہیں پہنچی (احد کے دن)
مُّصِيْبَةٌ	مصیبت	قَدْ اَصَبْتُمْ	البتہ تم پہنچا چکے تھے
مِّثْلَيْهَا	(بدر کے دن) اس سے دوگنی	قُلْتُمْ	(تو) تم نے کہا
اَنّٰى هٰذَا	کہاں سے آئی یہ؟	قُلْ	آپ کہہ دیں

هُوَ	وہ	مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ	تمہاری ہی طرف سے ہے
اِنَّ اللّٰهَ	بلاشبہ اللہ	عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز پر
قَدِيْرٌ		خوب قادر ہے۔(165)	

اللہ جل شانہ نے اہل ایمان کی تسلی کے لیے ارشاد فرمایا اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ غزوہ احد میں بلاشبہ تمہیں تکلیف پہنچی۔ مگر تمہیں یاد ہونا چاہئے قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا تم اس سے پہلے دشمن کو دگنی تکلیف پہنچا چکے ہو۔احد کے مقام پر تو مسلمانوں کے خلاف ستر آدمی شہید ہوئے ہیں۔مگر بدر کی جنگ میں کفار کے نہ صرف ستر اکابر مارے گئے تھے بلکہ اتنی ہی تعداد میں وہ قیدی بھی بنے تھے۔ گویا تم ان کو دگنا نقصان پہنچا چکے ہو۔لہذا احد کی شکست سے دل برداشتہ نہ ہو۔اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی شکست کے باوجود ان پر یہ احسان فرمایا کہ کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔وہ نہ تو مسلمانوں کو قیدی بنا سکے اور نہ خود وہاں زیادہ دیر ٹھہر سکے بلکہ اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ مکہ واپس پلٹ جائیں۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اس وقت کی کیفیت بیان فرمائی ہے کہ جب شکست ہوئی، تکلیف پہنچی قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ تم پکار اٹھے۔یہ کیا ہو گیا۔ہمیں شکست کیسے ہو گئی۔ہم تو حق پر تھے۔اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ہیں۔ہمیں کیوں شکست سے دو چار ہونا پڑا۔اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اے پیغمبر! آپ فرما دیجئے یہ تکلیف تمہیں خاص تمہارے ہی نفسوں کی طرف سے پہنچی ہے۔تم نے اللہ کے رسول کی حکم عدولی کی،اس کے مقرر کردہ مورچہ کو چھوڑ دیا۔جس کی وجہ سے شکست دو چار ہونا پڑا۔لہذا یہ تکلیف تمہاری اپنی ہی غلطی کا نتیجہ ہے۔یعنی یہ شکست بھی تمہاری ہی بھول چوک اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے؛اس لئے نہ اس پر تعجب ہونا چاہئے اور نہ رنج۔دنیا کے جنگی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا جنگی پلان بالکل درست تھا۔اور اس میں کوئی خامی نہیں تھی۔انگریز اور یہودی مورخین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ غزوہ احد کے موقع پر سپہ سالار اعظم ﷺ کی جنگی حکمت عملی نہایت اعلی درجے کی تھی۔مگر یہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی غلطی تھی۔

کہ وہ پہاڑی درہ پر قائم نہ رہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس درے کو کسی صورت میں بھی ترک نہیں کرنا۔ مگر ان کی اکثریت نہ صرف پہاڑ سے نیچے اتر آئی بلکہ آپس میں جھگڑا بھی کیا جس کی وجہ سے اہل ایمان کو مجموعی طور پر نقصان اٹھانا پڑا۔ بہر حال اس میں مسلمانوں کی غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ تکلیف تمہارے ہی نفسوں کی طرف سے پہنچی تھی اس میں تمہارا اپنا ہی قصور تھا۔ اور یہ بھی یاد رکھو۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جو مالک الملک فتح سے ہمکنار کر سکتا ہے، وہ فتح کو شکست میں تبدیل کرنے بھی قادر ہے۔ اور وہ تمہیں تمہاری غلطیوں پر تنبیہ بھی کر سکتا ہے۔

شکست کی حکمتیں

وَمَآ	اور جو کچھ	اَصَابَكُمْ	پہنچا تمہیں
يَوْمَ	جس دن	الْتَقَى الْجَمْعٰنِ	ملیں دو جماعتیں
فَبِاِذْنِ اللّٰهِ	تو (وہ) اللہ کے حکم سے (تھا)	وَلِيَعْلَمَ	اور تا کہ وہ جان لے
الْمُؤْمِنِيْنَ	مومنوں کو۔ (166)		

آگے اللہ تعالیٰ نے اس شکست کی حکمت بھی بیان فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ دونوں جماعتوں یعنی اہل کفر واہل اسلام کے اکٹھا ہونے کے دن یعنی غزوہ احد کے موقع پر جو تکلیف تمہیں پہنچی ہے اس میں کفار نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ بلکہ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ اللہ کے حکم سے ہی ایسا ہوا ہے۔ کوئی چیز اللہ کی تقدیر، اس کی مشیت اور ارادے کے بغیر واقع نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس پر افسوس کا زیادہ اظہار نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی منظور تھا۔ اور اس میں حکمت یہ تھی۔ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٦٦﴾ کہ اللہ تعالیٰ معلوم کرے کہ مومن کون لوگ ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ہر چیز ہر وقت موجود ہے اسے تکلیف میں مبتلا کر کے اہل ایمان کا ایمان جانچنے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ یہاں پر علم کا معنیٰ ممتاز کرنا ہے اور مطلب یہ ہے۔ کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو باقی لوگوں سے ممتاز کرنا چاہتا تھا جب اس قسم کی آزمائش آئی تو سب لوگوں کو علم ہو گیا۔ کہ

پکے سچے مومن کون ہیں اللہ نے انہیں کمزور ایمان والوں سے علیحدہ کر دیا۔اس شکست میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمتیں کچھ اس طرح ہو سکتی ہیں: 1..غزوہ احد میں مسلمانوں کو تکالیف ومصائب کے ذریعے گناہوں کے ارتکاب اور اطاعت رسول سے روگردانی کی نحوست سے آگاہ کیا گیا۔ 2..اگر مسلمانوں کو ہر میدان میں فتح وغنیمت ملتی رہے تو دنیا کے حریص منافقانہ لباس میں مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہو جائیں، پھر سچے اور جھوٹے شخص میں فرق نہ رہے۔ 3..جہاد کی وجہ سے جان ومال خطرے میں پڑ جاتا ہے، اس موقع پر منافقین اپنی جان ومال کی حفاظت کے لیے حیلے بہانوں سے مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جاتے ہیں، یوں منافقوں کی چھانٹی کا عمل جاری رہتا ہے۔ 4..مسلسل فتح سے عجب پسندی کا اندیشہ رہتا ہے، تکالیف ومصائب کی وجہ سے انکساری آجاتی ہے۔ 5..اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کو شہادت کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ 6..رجوع الی اللہ بڑھ جاتا ہے، اپنی صفوں میں پائے جانے والے دشمنوں پر نظر گہری ہو جاتی ہے۔

جنگ کی بنیادی دو اقسام

وَلِيَعْلَمَ	اور تا کہ وہ جان لے	الَّذِيْنَ	اُن لوگوں کو جنہوں نے
نَافَقُوْا	منافقت کی	وَقِيْلَ	اور کہا گیا
لَهُمْ	ان سے	تَعَالَوْا	تم آؤ
قَاتِلُوْا	لڑو	فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کی راہ میں
اَوِ ادْفَعُوْا	یا تم دفع کرو (دشمن کو)	قَالُوْا	تو انہوں نے کہا
لَوْ نَعْلَمُ	اگر ہم جانتے	قِتَالًا	لڑائی کو
لَّاتَّبَعْنٰكُمْ	(تو) ضرور ہم تمہارے ساتھ چلتے	هُمْ	وہ
لِلْكُفْرِ	کفر کے	يَوْمَئِذٍ	اس دن
اَقْرَبُ	زیادہ قریب تھے	مِنْهُمْ	ان سے
لِلْاِيْمَانِ	بہ نسبت ایمان کے	يَقُوْلُوْنَ	وہ کہتے تھے

بِاَفْوَاهِهِمْ	اپنے مونھوں سے	مَّا لَيْسَ	(وہ) جو نہیں تھا
فِىْ قُلُوْبِهِمْ	ان کے دلوں میں	وَاللّٰهُ اَعْلَمُ	اوراللہ خوب جانتا ہے
بِمَا	ساتھ اس کے جو	يَكْتُمُوْنَ	وہ چھپاتے تھے۔

فرمایااللہ تعالیٰ کااس واقعہ سے یہ منشاءبھی یہی تھا وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا تاکہ منافقوں کو بھی ممتاز کردے، اہل ایمان سے علیحدہ کردے کہ یہ ہیں وہ لوگ جو مومن نہیں ہیں بلکہ کافر ہیں اور آئندہ اہل ایمان ان کے دھوکے میں نہ آئیں۔منافقین نے اپنے نفاق کااظہار توابتدائے غزوہ میں ہی کردیا تھاجب کہ ان کاایک جتھہ راستے ہی سے واپس لوٹ گیاتھا۔اورمیدان احدتک پہنچاہی نہیں۔ان میں سے جومیدان جنگ میں پہنچ گئے وہ بڑے فکرمند تھے۔انہوں نےطرح طرح کی باتیں بنائیں جن سے ان کی بزدلی کااظہار ہوتا تھامسلمانوں کی تسلی کے لیے اللہ تعالیٰ نے میدان جنگ میں ان پر نیندطاری کردی جس کی وجہ سے وہ تازہ دم ہوگئے اوران کے تمام تفکرات رفع ہوگئے۔مگر منافقوں کویہ سعادت بھی نصیب نہ ہوئی۔بہرحال اللہ تعالیٰ نے مختلف مواقع پر واضح کردیاکہ اہل ایمان کون ہیں اورمنافق کون۔تو یہاں پربھی ارشادفرمایاکہ مسلمانوں کے گروہ کو تکلیف پہنچنے میں ایک حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ مومنوں اورمنافقوں کوایک دوسرے سے ممتاز کردے۔آگے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے تعلق سے جنگی حکمت عملی کاتذکرہ فرمایاہے۔ارشادہوتا ہےوَقِيْلَ لَهُمْ اوران منافقوں سے کہاگیاتَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ آؤاللہ کےراستے میں جہادکرواَوِ ادْفَعُوْا ؕ یادفاع کرو۔جنگ کی بنیادی دواقسام جارحانہ(Aggressive) اورمدافعانہ(Defensive) ہیں،جن کاتعلق بالترتیب پہل کرکے حملہ کرنے یاصرف اپنے دفاع کی خاطرلڑنے سے ہے۔جارحانہ جنگ (Aggressive War)کسی دوسرے ملک یا قوم پربغیرکسی براہِ راست بیرونی حملے کےغلبہ،زمین یاوسائل حاصل کرنے کے لیےخودابتدا کرنا۔مقصدعلاقائی توسیع،وسائل پرقبضہ یااثرورسوخ بڑھانا۔مدافعانہ جنگ (Defensive War)اپنے ملک،جان اورمال کی حفاظت کے لیے دشمن کے حملے کے جواب میں

لڑنا۔مقصد جارحیت کو روکنا اور اپنی سرحدوں کا دفاع کرنا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔کہ اسلام نے جنگ میں پہل کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔اگر کسی علاقے میں دشمن نے ظلم وستم اور فتنہ وفساد کا بازار گرم کر رکھا ہو،شرفا کی عزت ومال محفوظ نہ ہو۔اسلام کے خلاف سازش کا گڑھ بنا ہوا ہو،تو ایسی صورت میں گندے عنصر کا قلع قمع ضروری ہو جاتا ہے۔اور اسلام جنگ میں اقدام کی اجازت دیتا ہے۔دوسری صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔جب دشمن خود چڑھائی کر دے جیسا کہ جنگ کے موقع پر ہوا تھا۔تو ایسی حالت میں دفاعی جنگ لڑی جاتی ہے۔ایسے موقع پر مرد،عورت جوان،بوڑھا سب پر فرض عاید ہوتا ہے۔کہ وہ اپنا دفاع کرے عام حالات میں تو جہاد فرض کفایہ ہے۔مسلمانوں کی فوج موجود ہے وہ دشمن کے ساتھ نبرد آزما ہو،باقی لوگوں کو میدانِ جنگ میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی،مگر جب دشمن اہل اسلام پر چڑھ دوڑے تو یہ جنگ فرض عین بن جاتی ہے۔اس میں ہر مرد وزن کی شرکت لازم ہوتی ہے۔تو یہاں پر منافقوں سے کہا جا رہا ہے کہ آؤ اللہ کے راستے میں جارحانہ جنگ لڑو یا کم از کم دفاع میں ہی شریک ہو جاؤ۔بعض اوقات بھرپور دفاعی طاقت دیکھ کر بھی دشمن مرعوب ہو جاتا ہے۔لہٰذا اے گروہ منافقین اگر تم حملہ کرنے کے لیے باہر نہیں نکل سکتے تو کم از کم دشمن کے حملہ کو روکنے کے لیے تو مسلمانوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہو جاؤ۔

منافقوں کی حیلہ سازی

فرمایا اس کے جواب میں منافقین اپنے نفاق کا اظہار یوں کرتے قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ؕ اگر ہم یہ کسی ڈھب کی لڑائی جانتے تو ضرور تمہارا اتباع کرتے یعنی تمہارے ساتھ جنگ میں شریک ہو جاتے۔مگر یہ تو کسی ڈھب کی لڑائی ہی نہیں۔دشمن کی تعداد زیادہ ہے اور ہم قلیل تعداد میں ہیں۔یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے،لہٰذا ہم اس لڑائی میں تمہارے ساتھ شامل ہونے کو تیار نہیں۔اس طرح منافقین جنگ سے بچنے کے لیے حیلہ سازی کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس دن ان کے نفاق کا پول کھل گیا۔اور ان کی حالت یہ ہو گئی هُمْ لِلْكُفْرِ

یَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ وہ لوگ اس دن ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب ہو گئے۔ پہلے تو یہ لوگ صرف دل سے منافق تھے اور زبان سے ایمان کا دعوی کرتے تھے مگر اس دن انہوں نے زبان سے بھی ایسی بات کہہ دی جس کی وجہ سے ظاہری طور پر بھی کفر کے قریب تر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان کی خصلت یہ ہے یَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ اپنے مونہوں سے ایسی بات کہتے ہیں مَّا لَیۡسَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ زبان سے تو مسلمانوں کی حمایت کا دم بھرتے ہیں مگر دل میں نفاق بھرا ہوا ہے۔ کہ کسی طرح جنگ میں شریک ہونے سے بچ جائیں۔ دل و زبان کا یہی تضاد منافقت کی نشانی ہے۔ عبداللہ بن ابی نے بھی یہی بات کی تھی۔ کہ ہماری تو بات ہی نہیں مانی گئی۔ ہم کہتے تھے شہر میں رہ کر دفاع کریں گے مگر یہ باہر نکل گئے، لہٰذا ہم ایسی جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی منافقت کا پردہ یہ کہہ کر فاش کر دیا۔ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا یَکۡتُمُوۡنَ ﴿۱۶۷﴾ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جس چیز کو جو وہ چھپاتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں چھپے ہوئے رازوں سے بھی واقف ہے۔ لہٰذا اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے بلکہ خود ہی نقصان اٹھائیں گے۔

موت سے فرار ممکن نہیں

اَلَّذِیۡنَ	وہ لوگ جنہوں نے	قَالُوۡا	کہا
لِاِخۡوَانِهِمۡ	اپنے بھائیوں سے	وَقَعَدُوۡا	جبکہ وہ خود بیٹھے رہے
لَوۡ	اگر	اَطَاعُوۡنَا	(وہ) ہماری اطاعت کرتے
مَا قُتِلُوۡا	تو نہ قتل کئے جاتے	قُلۡ	کہہ دیجئے
فَادۡرَءُوۡا	تم ہٹا دو	عَنۡ اَنۡفُسِکُمُ	اپنے نفسوں سے
الۡمَوۡتَ	موت کو	اِنۡ	اگر
کُنۡتُمۡ	ہو تم	صٰدِقِیۡنَ	سچے۔(168)

آگے اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک اور خصلت کا تذکرہ کیا ہے اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ وَقَعَدُوۡا وہ لوگ جنہوں نے اپنے بھائی بندوں یعنی مسلمانوں کے متعلق یوں کہا اور خود بیٹھ رہے

لَوۡ اَطَاعُوۡنَا مَا قُتِلُوۡا ؕ اگر یہ ہماری بات مان لیتے، تو قتل نہ ہوتے، یعنی ہم تو شہر میں رہ کر دفاع کے حق میں تھے۔ مگر انہوں نے ہماری بات نہیں مانی لہذا باہر میدان میں جا کر مارے گئے۔ غرضیکہ طرح طرح کے حیلے بہانے کیے کہ مسلمانوں کو اس وجہ سے شکست ہوئی ان کی جنگی حکمت عملی درست نہیں تھی یا ان کی صف بندی اور مورچہ بندی کمزور تھی۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ سب ان کی بہانہ سازی ہے۔ اصل میں یہ لوگ اسلام کے دشمن ہیں اور اسے پھلتا پھولتا دیکھنا نہیں چاہتے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے بد باطن لوگوں کو منہ توڑ جواب دیا قُلۡ فَادۡرَءُوۡا عَنۡ اَنۡفُسِكُمُ الۡمَوۡتَ اے نبی (علیہ السلام)، ان سے کہہ دیں پس روک لو اپنے آپ سے موت کو۔ انہوں نے کہا تھا۔ کہ اگر مسلمان باہر نکل کر نہ لڑتے تو شہید نہ ہوتے، ہم جنگ میں عدم شرکت کی بنا پر بچ گئے۔ اللہ نے فرمایا اگر تم موت کو وارد ہونے سے اس طرح روک سکتے ہو، تو روک کر دکھا دو۔ تم خواہ گھر میں بیٹھے رہو یا کہیں چلے جاؤ، موت بہر صورت اپنے وقت پر آ کر رہے گی تم اسے ٹال نہیں سکتے، جب کسی کی موت کا معین وقت آ جاتا ہے تو پھر۔ ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ تمہاری خام خیالی ہے کہ تم گھر میں بیٹھ رہنے سے موت کو ٹال سکتے ہو۔ بسا اوقات جنگ میں شریک لوگ بخیر وعافیت واپس آتے ہیں۔ اور پیچھے رہ جانے والے مر جاتے ہیں اللہ نے فرمایا اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۝۱۶۸ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو یعنی گھر بیٹھ کر موت کو وارد ہونے سے روک سکتے ہو، تو اسے روک کر دکھا دو۔ مگر تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے۔ الغرض! ان آیات میں غزوہ احد میں مسلمانوں کی شکست میں جو حکمتیں پوشیدہ تھیں اللہ نے ان کو بیان فرما دیا۔ منجملہ ان کے ایک حکمت یہ بھی تھی کہ منافقوں کا طرز عمل واضح ہو جائے۔ اس طرح اللہ جل جلالہ نے اس ایک واقعہ کے ذریعے درجنوں اصول سمجھا دیے۔ اور آئندہ کے لیے مسلمانوں کو مستعد رہنے کی تعلیم دی۔

شہدا کی حیات قرآن واحادیث سے ثابت ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ
یُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ۙ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ
یَلْحَقُوْا بِہِمْ مِّنْ خَلْفِہِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ یَسْتَبْشِرُوْنَ
بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۱﴾

شہید کی زندگی دنیاوی زندگی نہیں ہوتی

وَلَا	اور نہ	تَحْسَبَنَّ	آپ ہرگز گمان کریں
الَّذِیْنَ	ان لوگوں کو جو	قُتِلُوْا	قتل کردیئے گئے
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	اللہ کے راستے میں	اَمْوَاتًا	مُردے
بَلْ	بلکہ	اَحْیَآءٌ	(وہ) زندہ ہیں
عِنْدَ رَبِّہِمْ	اپنے رب کے ہاں	یُرْزَقُوْنَ	وہ رزق دیئے جاتے ہیں۔

فرمایا وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ؕ جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوگئے انہیں مردہ مت گمان کرو۔ اللہ کی راہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ، دین کی اقامت اور اللہ اور اس کے رسول کے مشن کا قیام ہے۔ نیکی کے تمام امور فی سبیل اللہ ہی تصور ہوتے ہیں تاہم ان سب

میں جہاد کا مرتبہ بلند ترین ہے۔ اس سے پہلے سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ يُّقۡتَلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتٌ یعنی اللہ کے راستے میں جان دینے والوں کو مردہ مت کہو۔ ان کو تو حقیقی حیات نصیب ہو چکی ہے جو اس دنیا کی زندگی سے لاکھوں کروڑوں درجے اعلیٰ وارفع ہے۔ یہاں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ مت گمان کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ بالکل ختم ہو چکے ہیں بَلۡ اَحۡيَآءٌ بلکہ وہ تو زندہ ہیں ان کو ایسی زندگی ملی ہے جو اس زندگی سے بہت فائق ہے اور وہ زندگی ہے کہاں، فرمایا عِنۡدَ رَبِّهِمۡ اپنے پروردگار کے پاس سورہ بقرہ میں شہداء کی زندگی کے متعلق فرمایا وَّلٰـكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ تم کو اس زندگی کا شعور نہیں ہے۔ شہداء جس جہاں اور جس مقام پر موجود ہیں، وہ چیز تمہاری عقل میں نہیں آسکتی اور نہ ہی تمہاری نگاہ اسے دیکھ سکتی ہے۔ وہ دوسرا جہان ہے۔ جہاں کے احکامات مختلف ہیں تمہیں اس کا شعور حاصل نہیں ہے۔ اس مقام پر فرمایا، وہ اپنے پروردگار کے ہاں زندہ ہیں۔ اور يُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾ ان کو روزی دی جارہی ہے۔ یہ شہداء کی خصوصیت ہے کہ مرنے کے بعد وہ عالیشان مقام اور نعمتوں میں رہتے ہیں۔ جس قسم کی ان کی خواہش ہوتی ہے اسی قسم کی ان کو روزی دی جاتی ہے۔ گویا شہداء کو فی الوقت باعزت روزی مل رہی ہے۔

شہداء کرام کے فضائل

1: ان کی ممتاز دائمی حیات ہے۔ 2: ان کو من جانب اللہ رزق دیا جاتا ہے۔ 3: وہ ہمیشہ خوش وخرم رہیں گے۔ 4: وہ اپنے جن متعلقین کو دنیا میں چھوڑ گئے تھے، ان کے متعلق بھی ان کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر نیک عمل اور جہاد میں مصروف رہیں تو ان کو بھی یہاں آکر یہ ہی نعمتیں اور درجاتِ عالیہ ملیں گے۔ اور سدیؒ نے بیان فرمایا ہے: ''شہید کا جو کوئی عزیز، دوست مرنے والا ہوتا ہے شہید کو پہلے سے اس کی اطلاع کر دی جاتی ہے کہ فلاں شخص اب تمہارے پاس آرہا ہے، وہ اس سے ایسا خوش ہوتا ہے، جیسے دنیا میں کسی دور افتادہ دوست سے بعد مدت ملاقات کی خوشی ہوتی ہے۔'' (معارف القرآن: ج ۲، ص: ۲۳۷) اس آیت کا شانِ نزول امام ابوداؤدؒ نے سنن

ابی داوٗد (ج ۱،ص: ۳۴۱) میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ: جب واقعۂ احد میں تمہارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے جسم میں رکھ کر آزاد کر دیا، وہ جنت کی نہروں اور باغات سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں اور پھر ان قندیلوں میں آجاتے ہیں جو اُن کے لیے عرشِ رحمان کے نیچے معلق ہیں، جب ان لوگوں نے اپنی راحت وعیش کی یہ زندگی دیکھی، تو کہنے لگے کہ: ہمارے متعلقین دنیا میں ہمارے مرنے سے غمگین ہیں، کیا کوئی ہمارے حالات کی خبر اُن کو پہنچا سکتا ہے؟ تا کہ وہ ہم پر غم نہ کریں اور وہ بھی جہاد میں کوشش کرتے رہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہاری یہ خبر اُن کو پہنچائے دیتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (قرطبی، ج: ۴،ص: ۲۶۵۔معارف القرآن، ج: ۲،ص: ۲۳۷)

منافقین کے قول کی تردید

یہ منافقین کے اس قول کا رد ہے کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو قتل نہ کئے جاتے۔ یعنی اس آیت میں منافقین کے اس شبہ کی کہ ”جہاد میں شامل ہونا خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے“ ایک دوسرے طریقے سے تردید کی ہے۔ فرمایا نہیں بلکہ اس سے دائمی زندگی حاصل ہوتی ہے، شہداء کو اللہ کے ہاں بلند درجے ملتے ہیں، پروردگار کے ہاں انھیں ہر قسم کی نعمت اور لذت حاصل ہوتی ہے، یہ زندگی حقیقی زندگی ہے مگر دنیا والی زندگی نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، جو ہماری نگاہ سے اوجھل ہے، جسے ”برزخ“ کہتے ہیں اور جو ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی، فرمایا: وَّلٰكِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ) [البقرۃ: 154] ”اور لیکن تم (اس زندگی کو) نہیں سمجھتے۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے سے موت ٹال کر دکھاؤ مطلب یہ ہے کہ تقدیر سے کسی کو مفر نہیں۔ موت بھی جہاں اور جیسے مقدر ہے، وہاں اور اسی صورت میں آ کر رہے گی۔ اس لئے جہاد اور اللہ کی راہ میں لڑنے سے گریز وفرار یہ کسی کو موت کے شکنجے سے نہیں بچا سکتا۔

شہداء کرام کا مقام

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ”شہید کو اللہ پاک کی طرف سے چھ انعامات دیئے جاتے ہیں: 1: قتل ہوتے ہی اس کے گناہ معاف کیے جاتے ہیں (سوائے قرض کے) اسی وقت اس کو جنت میں اس کا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے۔ 2: عذابِ قبر اور قیامت کے دن کی چھوٹی بڑی گھبراہٹ سے محفوظ رکھا جائے گا۔ 3: اس کے سر پر وقار عزت کا تاج رکھا جائے گا، جس کا ایک یاقوت دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔ 4: بہتر (۷۲) حوروں سے اس کا نکاح کیا جائے گا۔ 5: رشتے داروں، اقرباء میں سے ستر (۷۰) افراد کے لیے اس کو شفاعت کا حق دیا جائے گا۔“ (ترمذی: ج ۱ ص: ۲۹۵)

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت کا طالب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے شہیدوں کے درجے پر پہنچاتا ہے، اگرچہ وہ اپنے بستر پر مرے۔ (مسلم: ج ۲ ص: ۱۴۱)

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ شہداء کا مقام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”شہید وہ ہے کہ اس کا دل مشاہدۂ تجلیاتِ الٰہی میں مستغرق ہو اور جو کچھ انبیاء کرام علیہم السلام نے اُن کو پہنچایا ہے، اس کو اس کا دل اس طرح قبول کرے گویا یہ دیکھتا ہے، اس لیے دین کے معاملے میں جانی قربانی دینا اس کو آسان لگتا ہے، اگرچہ ظاہری اعتبار سے مقتول نہ بھی ہو اور قوتِ عملیہ قریب قریب انبیاء (علیہم السلام) کے ہوتی ہے۔“ (تفسیر عزیزی: ج ۱ ص: ۳۳)

علامہ اندلسی رحمۃ اللہ علیہ، مقامِ شہداء بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ”شہداء کرام وہ لوگ ہیں جو مقصود کو دلائل و براہین کے ذریعے جانتے ہیں، مشاہدہ نہیں ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو آئینے میں قریب سے دیکھ رہا ہو، جیسے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے رب کریم کے عرش کو دیکھ رہا ہوں۔“ (البحر المحیط، ص: ۳۰۰)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”یہ گروہ راہِ خدا میں اپنی جانیں دے دیتا ہے،

تاکہ جانی قربانی کے عوض اس کو تجلیاتِ ذاتیہ کا ایک مخصوص حصہ حاصل ہو، اور اس پر انوارِ ذاتیہ کی خصوصی شعاع پڑ جائیں، عمومی اور دوامی تجلیات ان پر فائز نہیں ہوتیں، بلکہ نورانیت کی ایک مخصوص شعاع ان پر ''پرتو'' انداز ہوتی ہے۔'' (مظہری: ج ۳ ص: ۱۶۵)

حضرت مولانا حماد اللہ ہالیجوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''شہداء کرام وہ جماعت ہے جو اپنی جان اور اپنا مال وحی کی حفاظت کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔'' (الیاقوت والمرجان، ص: ۱۱)

پچھلوں کے متعلق بشارت

فَرِحِیۡنَ	وہ خوش ہیں	بِمَآ	اس پر جو
اٰتٰـھُمُ اللّٰہُ	اللہ نے انہیں دیا	مِنۡ فَضۡلِہٖ	اپنے فضل سے
وَیَسۡتَبۡشِرُوۡنَ	اور وہ خوشی محسوس کرتے ہیں	بِالَّذِیۡنَ	ان کے ساتھ جو
لَمۡ یَلۡحَقُوۡا	نہیں ملے	بِہِمۡ	ان کو
مِّنۡ خَلۡفِھِمۡ	ان کے پیچھے سے	اَلَّا	یہ کہ نہ
خَوۡفٌ	کوئی خوف ہوگا	عَلَیۡہِمۡ	ان پر
وَلَا ھُمۡ	اور نہ وہ	یَحۡزَنُوۡنَ	غمگین ہوں گے۔

فَرِحِیۡنَ بِمَآ اٰتٰـھُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ اللہ نے جو کچھ انہیں اپنے فضل سے عطا کیا ہے۔ اس پر خوش ہونے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ انعامات پر وہ خوش ہو رہے ہیں۔ آگے اللہ تعالیٰ نے دو بشارتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جو شہداء کو عالم برزخ میں حاصل ہوتی ہیں۔ پہلی بشارت کے متعلق فرمایا۔ وَیَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ مِّنۡ خَلۡفِھِمۡ وہ بشارت حاصل کرتے ہیں ان لوگوں کے بارے میں جو ان سے نہیں ملے۔ یعنی شہداء کے عزیز واقارب، رشتہ دار احباب وغیرہ جو ایماندار ہیں اور ابھی تک دنیوی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کے متعلق انہیں یہ خوشخبری ملتی ہے اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾ کہ ان پر بھی خوف نہیں ہوگا اور وہ بھی غمگین نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں خوشخبری دی جاتی ہے کہ تمہارے فلاں فلاں

اعزہ واقارب بھی تمہاری طرح دنیا میں نیکی کے راستے پر چل رہے ہیں۔ اور اسی صراط مستقیم پر چلتے ہوئے وہ بھی تمہاری طرح راحت کے مقام میں پہنچیں گے۔ چناچہ یہ خوشخبری شہداء کے لیے مزید خوشی کا باعث ہوتی ہے۔

شہداء کا غسل اور جنازہ

يَسْتَبْشِرُوْنَ	وہ خوشی محسوس کرتے ہیں	بِنِعْمَةٍ	ساتھ احسان کے
مِّنَ اللّٰهِ	اللہ کی طرف سے	وَفَضْلٍ	اور (ساتھ اس کے) فضل کے
وَّاَنَّ اللّٰهَ	اور (اس پر) کہ بیشک اللہ	لَا يُضِيْعُ	ضائع نہیں کرتا
اَجْرَ	اجر	الْمُؤْمِنِيْنَ	مومنون کا۔(171)

فرمایا دوسری بشارت یہ ہے يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت اور احسان حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل بھی ان کے شامل حال ہے۔ قیامت کے بعد تو سب لوگوں کو انعام واکرام سے نوازا جائے گا مگر شہداء کو یہ نعمتیں فی الوقت مل رہی ہیں۔ اور اب انہیں یہ یقین حاصل ہو گیا ہے وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٧١﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ اہل ایمان اپنے اور اچھے عقیدے کے ساتھ جو نیک عمل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کا ضرور بدلہ دے گا۔ یہ تو عام مومنین کے متعلق ہے مگر شہداء کو تو نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی عزیز ترین متاع اللہ کی راہ میں قربان کر دی، اللہ کے دین کے قیام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو بہترین اجر عطا فرمایا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ کافروں کے ہاتھوں شہادت پانے والے شہیدوں کو غسل دینے کا حکم نہیں ہے۔ ان کو اسی طرح خون میں لت پت قبر میں اتار دیا جائے۔ شہدائے احد کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا ان کے ہتھیار زرہ وغیرہ زائد لباس میں آتے ہیں یہ ان کے جسم سے اتار دو اور ان کے اصل لباس کرتہ قمیض، تہبند پاجامہ وغیرہ سمیت دفن کر دو۔ فرمایا شہداء کا خون قیامت کے دن دوبارہ تروتازہ ہو جائے گا۔ جس سے کستوری جیسی خوشبو آئے گی اور یہ ایسی حالت میں خدا تعالیٰ کی بارگاہ

میں پیش ہوں گے۔البتہ فقہائے کرام،محدثین،مفسرین فرماتے ہیں۔کہ اگر کوئی شخص جنابت کی حالت میں شہید ہوجائے تو اس کے غسل کے مسئلہ میں اختلاف رائے ہے۔امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما فرماتے ہیں۔کہ ایسی حالت میں بھی شہید کو غسل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔البتہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ جنبی شہید کے لیے غسل ضروری ہے۔دلیل کے طور پر فرماتے ہیں۔کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جنابت کی حالت میں شہید ہوئے تھے،انہوں نے اپنی بیوی سے ہم بستری کی،جنگ زوروں پر تھی۔انہیں غسل کا موقع نہ ملا۔اسی حالت میں میدانِ جنگ میں کود گئے اور شہید ہوگئے۔حضور ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا۔کہ میں نے دیکھا ہے کہ فرشتے بارش کے پاکیزہ پانی سے چاندی کے برتن میں زمین وآسمان کے درمیان حضرت حنظلہ کو غسل دے رہے تھے،لہذا ثابت ہوا کہ جنبی شہید کا غسل ضروری ہے۔شہداء کا جنازہ پڑھنے کے متعلق امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کا جنازہ پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ ان کی مغفرت تو ہو چکی ہے۔تاہم امام ابوحنیفہ،امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کی رائے ہے کہ جنازہ پڑھا جائے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ جنازہ صرف گناہوں کی معافی کے لیے ہی نہیں بلکہ درجات کی بلندی کے لیے بھی پڑھا جاتا ہے۔شہداء کا جنازہ پڑھنے کا مقصد یہ ہوگا۔کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔حضرت اسلم رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہ فرماتے ہیں ’’حضرت عمر فاروق رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے یہ دعا مانگی ’’اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی شَھَادَۃً فِی سَبِیلِكَ، وَاجْعَلْ مَوْتِی فِی بَلَدِ رَسُولِكَ ‘‘اے اللہ عَزَّ وَجَلَّ ،مجھے اپنی راہ میں شہادت عطا فرما اور مجھے اپنے رسول صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے شہر میں وفات نصیب فرما۔(بخاری،کتاب فضائل المدینۃ،۱۳باب،۱/ ۶۲۲، الحدیث:۱۸۹۰)الغرض!اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر شہداء کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور خوشخبری سنائی ہے کہ وہ مومنوں کے نیک اعمال کو ضائع نہیں کرتا۔بلکہ ان کا بہتر اجر عطا کرتا ہے۔

پروپیگنڈا، امن و جنگ دونوں صورتوں میں استعمال ہونے والا ہتھیار

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا
مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا
لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾
فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ
وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

زخمی حالت میں اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اَلَّذِيْنَ	جن لوگوں نے	اسْتَجَابُوْا	حکم مانا
لِلّٰهِ	اللہ کا	وَالرَّسُوْلِ	اور رسول کا
مِنْۢ بَعْدِ مَآ	بعد اس کے کہ	اَصَابَهُمُ	پہنچے انہیں
الْقَرْحُ	زخم	لِلَّذِيْنَ	ان لوگوں کے لیے جنہوں نے
اَحْسَنُوْا	احسان کیا	مِنْهُمْ	ان میں سے

اجر ہے بڑا۔(172)	اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ	اور تقویٰ اختیار کیا	وَاتَّقَوۡا

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ایمان کی پختگی کا ذکر فرمایا ہے اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور رسول کا حکم مانا مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَہُمُ الۡقَرۡحُ بعد اس کے کہ وہ زخم خوردہ تھے انہیں احد کے مقام پر سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا، ستر صحابہ کرام علیہم الرضوان شہید ہو چکے تھے باقیوں میں سے بیشتر زخمی تھے مگر جب اللہ کے رسول نے منشائے ایزدی کے مطابق دشمن کے تعاقب کا حکم دیا، تو بچے کھچے زخمی صحابہ علیہم الرضوان نے اس حکم پر دل و جان سے لبیک کہا اور دشمن کے تعاقب میں آٹھ میل چلے گئے۔ یہ حمراء الاسد، یعنی جنگ احد سے اگلے روز کا واقعہ ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ احد سے پلٹ کر جب مشرکین چند منزل دور چلے گئے تو آپس میں کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی کہ مسلمانوں کا پوری طرح خاتمہ کیے بغیر واپس چلے آئے۔ چنانچہ وہ مدینے پر دوبارہ حملہ کرنے کا منصوبہ بنانے لگے، ادھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو مشرکین کے تعاقب میں نکلنے کا حکم دیا، تاکہ وہ واقعی پلٹ کر مدینہ پر حملہ نہ کر دیں۔ اس وقت اگرچہ شرکائے احد میں سے اکثر لوگ سخت زخمی اور تھکے تھے لیکن اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں فوراً نکل کھڑے ہوئے۔ جب مدینہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر حمراء الاسد (نامی جگہ) پہنچے تو مشرکین کو ان کے آنے کی اطلاع مل گئی اور انھوں نے آپس میں کہا کہ اس مرتبہ تو واپس چلتے ہیں، اگلے سال پھر آئیں گے۔ اس صورت حال کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ چنانچہ آیت میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے اور مسلمانوں کو بشارت ہے۔ (ابن کثیر) تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر صحابہ علیہم الرضوان کی مدح بیان فرما کر تمام اہل اسلام کو ترغیب دی ہے۔ کہ وہ بھی اسلام کے اولین جانثاروں کی تقلید میں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی تعمیل کے لیے ہمیشہ تیار رہیں۔ اللہ نے فرمایا لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡہُمۡ ان میں سے جن لوگوں نے نیکی کا راستہ اختیار کیا وَاتَّقَوۡا اور پرہیزگاری اختیار کی۔ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۷۲﴾ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ اللہ

تعالیٰ نے جس طرح پہلے نیک لوگوں کو انعامات سے نوازا ہے آئندہ بھی نیکی کرنے والوں کو بلند درجات عطا فرمائے گا۔ بہر صورت ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمانوں کی ستر لاشیں خاک وخون میں پڑی تھیں، اور کتنے ہی مجاہدین زخموں سے چور تھے، اس کے باوجود صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپ ﷺ کی اس آواز پر لبیک کہنا کوئی معمولی قربانی نہیں تھی؛ اسی لئے قرآن نے خاص طور پر ان کا تذکرہ کیا ہے ۔اس آیت میں صحابہ کرام رضیَ اللہُ تعالیٰ عَنہُم کی عظمت وہمت کا بیان بھی ہے کہ زخموں سے چور چور ہونے کے باوجود سرکارِ دوعالم صَلَّی اللہُ تعالیٰ عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے حکم پر فوراً حاضر ہو گئے ۔

یہ غازی یہ تیرے پُر اَسرار بندے　　جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے دریا و صحرا　　سمٹ کر پہاڑ اِن کی ہیبت سے رائی

پراپیگنڈہ بطور موثر ہتھیار

اَلَّذِیۡنَ	وہ لوگ جنہوں نے	قَالَ لَھُمُ النَّاسُ	کہا ان سے لوگوں نے
اِنَّ النَّاسَ	کہ بیشک لوگوں نے	قَدۡ جَمَعُوۡا	تحقیق جمع کیا ہے (لشکر)
لَکُمۡ	تمہارے (مقابلے کے) لیے	فَاخۡشَوۡھُمۡ	پس ان سے ڈرو
فَزَادَھُمۡ	تو انہیں (اس بات نے) زیادہ کردیا	اِیۡمَانًا	ایمان میں
وَّقَالُوۡا	اور انہوں نے کہا	حَسۡبُنَا اللّٰہُ	کافی ہے ہمیں اللہ
وَنِعۡمَ	اور (وہ) اچھا ہے	الۡوَکِیۡلُ	کارساز۔(173)

ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ وہ لوگ کہ جن کو لوگوں نے کہا یہاں پر الناس سے مراد وہی تاجر لوگ جن کا تعلق قبیلہ عبد القیس سے تھا اور وہ مدینہ کی طرف جارہے تھے اور انہوں نے مشرکین کے کہنے پر مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس ناس سے مراد جماعت بھی ہوسکتی ہے اور فرد واحد بھی ۔ کیونکہ ناس کا لفظ جماعت اور فرد واحد پر یکساں بولا جاتا ہے چونکہ مدینہ کی طرف پورا قافلہ جارہا تھا اور ان سب کو مشرکین نے پروپیگنڈا پر آمادہ کیا تھا، اس لیے اس ناس سے جماعت مراد ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مشرکین نے صرف ایک آدمی کو اس

کام پر مامور کیا تھا۔ اگر ایسا ہے تو پھر ناس سے مراد وہ فرد واحد ہوگا۔ ابوسفیان نے خفیہ طور پر ایک شخص نعیم بن مسعود کو مدینہ بھیجا اور کچھ دے دلا کر اس کی ڈیوٹی یہ لگائی کہ وہاں جا کر یہ خبر مشہور کردے کہ اس دفعہ قریش نے اتنی زبردست تیاری کی ہے اور اتنا لشکر جرار جمع کر رہے ہیں کہ پورا عرب بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکے گا۔ اور اس کا مقصد صرف مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنا تھا تاکہ مقابلہ کرنے کی انہیں ہمت ہی نہ رہے۔ چنانچہ اس نے مدینہ جا کر یہ افواہ خوب پھیلائی۔ لیکن اس پروپیگنڈا کا اثر ابوسفیان کی توقع کے برعکس نکلا۔ اس خبر سے مسلمانوں کا ایمانی جوش اور بھی بڑھ گیا، اور رسول اللہ ﷺ پندرہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر میدان بدر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بہرحال یہاں پر اَلَّذِیۡنَ سے مراد مدینہ والے اہل ایمان ہیں اور النَّاسُ سے مراد وہ ایک یا زیادہ تجار ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کیا۔ تو معنی یہ ہوا کہ جب قافلے والوں نے مدینہ طیبہ کے مسلمانوں سے یوں کہا اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَـكُمۡ بیشک لوگوں نے تمہارے لیے اکٹھا کیا ہے۔ یہاں پر ناس سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ جنہوں نے تجارتی قافلے کو اپنے حق میں پروپیگنڈا کے لیے بھیجا تھا۔ مطلب یہ قافلے والوں نے اہل مدینہ سے جا کر کہا کہ مکہ والوں نے تمہارے مقابلے کے لیے کثیر فوج اور وافر اسلحہ اکٹھا کر رکھا ہے۔ اور وہ تم پر عنقریب حملہ آور ہونے والے ہیں۔ لہٰذا فَاخۡشَوۡهُمۡ ان سے ڈر جاؤ۔ مقصد یہ تھا کہ تم اہل مکہ کا مقابلہ نہیں کرسکو گے۔ لہٰذا جنگ کیے بغیر ان کی اطاعت قبول کرلو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشرکین کے اس جھوٹے پروپیگنڈا سے مسلمان خوفزدہ نہ ہوئے۔ حالات کا تقاضہ تھا کہ مسلمان اس خبر سے لرز اُٹھتے اور گھبرا جاتے؛ لیکن صورت حال اس کے برعکس ہوئی اور مسلمانوں نے کہا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہیں۔ (مفاتیح الغیب: ۴/ ۵۷۰) اس خبر سے مسلمانوں کا ایمانی جوش اور بھی بڑھ گیا، اور رسول اللہ ﷺ پندرہ سو صحابہ علیہم الرضوان کو ساتھ لے کر میدان بدر کی طرف روانہ ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ ابوسفیان کے انتظار میں آٹھ روز تک بدر کے مقام پر ٹھہرے رہے۔ اس دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک تجارتی قافلہ سے کاروبار کر کے خوب فائدہ اٹھایا۔ پھر جب یہ پتہ چلا کہ ابوسفیان واپس چلا گیا ہے تو

آپ بھی مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر لحاظ سے فائدہ میں رہے۔ اللہ کی رضا بھی حاصل ہوگئی۔ جنگ کی سختی سے بھی بچ رہے۔ دشمن بھی مرعوب ہو کر واپس چلا گیا اور مالی فائدہ بھی حاصل ہوگیا اور ہر طرح سے کامیاب کامران واپس لوٹے۔

جنگیں جیتنے کا سستا اور موثر ترین ہتھیار

پروپیگنڈا موجودہ دور میں ذہنوں کو مسخر کرنے اور جنگیں جیتنے کا سب سے سستا اور موثر ترین ہتھیار رہے۔ یہ بندوق گولی کے بغیر انسانی سوچ، رویوں اور جذبوں کو کنٹرول کرنے کا کام کرتا ہے۔ پروپیگنڈا دراصل نفسیاتی جنگ کا ہتھیار ہے۔ دشمن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پروپیگنڈے کے ذریعے خوف اور ہیجان کی کیفیت پیدا کر کے فرد یا اجتماع کے رویّے میں حسب خواہش تبدیلی لائے۔ پروپیگنڈا کو ہمیشہ سے ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے معاملہ مذہبی ہو یا سیاسی، معاشی ہو یا معاشرتی ہر صورت میں پراپیگنڈہ کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانے میں پروپیگنڈا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ خاص طور پر جنگ کے دوران اپنی قوم کی حوصلہ افزائی اور دشمن کی اعصاب شکنی کے لیے پروپیگنڈا بہترین ہتھیار ثابت ہوا ہے۔ اس زمانے میں پروپیگنڈا کی ابتداء تو انگریزوں نے کی تھی۔ اس کا اصول یہ تھا کہ اگر کتے کو بھی مارنا مقصود ہو تو پہلے سخت پروپیگنڈا کرو کہ یہ باؤلا ہے، اس کے بعد اس کو گولی مار دو۔ پروپیگنڈہ کی جنگ میں توپ و تفنگ استعمال نہیں ہوتے بلکہ یہ جنگ ذرائع ابلاغ کے ذریعے لڑی جاتی ہے۔ دنیا میں پروپیگنڈے پر خوب رقم خرچ کی جاتی ہے اور اس سے وہ نتائج حاصل کیے جاتے ہیں جو عملی جنگ سے حاصل نہیں ہوتے۔ پروپیگنڈے کی غرض و غایت مدِ مقابل کو ذہنی شکست سے دو چار کر کے اس کے حوصلے پست کرنا ہوتا پروپیگنڈے کی تہہ میں نظریاتی' معاشی اور سیاسی مفادات اور احساسِ کمتری پیدا کرنے کے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ یہ ایک بھرپور جنگ ہوتی ہے مگر آتشیں اسلحے کے بغیر لڑی جانے کے سبب اس کو "سرد جنگ" یعنی cold war کا نام دیا جاتا ہے۔ پروپیگنڈا بذات خود اچھا یا برا نہیں ہوتا' مقاصد اور طریقہ کار کا حسن و قبح اِسے مثبت یا منفی بنا دیتا ہے۔

عہد حاضر کے تقاضے

چونکہ پروپیگنڈا زمانہ امن میں بھی ہوتا ہے اور زمانہ جنگ میں بھی۔ زمانہ جنگ میں افواہ سازی اور پروپیگنڈا اپنے پورے عروج پر ہوتا ہے۔ اس لیے ذرائع ابلاغ کی ذمّہ داری بہت بڑھ جاتی ہے تاکہ پروپیگنڈے سے خوف و ہراس نہ پھیلے اور دشمن اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو۔ ایسے مواقع پر ذرائع ابلاغ کیا کردار ادا کریں؟ اُس کی وضاحت قرآن کریم میں یوں کی گئی:

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ إِلَّا قَلِيلًا ۔

جب بھی اُن کے پاس امن یا جنگ کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو یہ اُس کو فوراً نشر کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ اُس کو رسول کی طرف یا اپنے میں سے اولی الامر کی طرف لوٹا دیتے تو اُن میں سے جو بھی لوگ اس (خبر) کی تحقیق کر سکتے ہیں وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے اور اگر تم لوگوں پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اُس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو تم بھی شیطان کے پیچھے چل پڑتے سوائے چند لوگوں کے۔

یہ آیت منافقین کی شرارتوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو افواہیں پھیلا کر معاشرے میں خوف و ہراس پیدا کرتے تھے۔ اس آیت سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ افواہیں پھیلانا شیطانی کام ہے اور منافقین کی نشانی ہے۔ موجودہ دور میں دین دشمن عناصر نے مسلمانوں بالخصوص علمائے دین کے خلاف پروپیگنڈہ مہم کے لئے باقاعدہ ادارے قائم کر رکھے ہیں جس میں بے عمل مذہبی سکالرز اور آئی ٹی انجینئروں کو خصوصی طور پر تعینات کیا گیا ان کا کام جعلی شناخت و نام کے ساتھ ٹیوٹر اکاؤنٹ ای میل و فیس بک اکاؤنٹس بنا کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ پر مبنی خبروں کو پھیلانا' ان پر تبصرے کرنا پھر یہی مصنوعی مذہبی دانشور قلمی ناموں کے ساتھ مغربی پرنٹ میڈیا کے لئے جنوبی ایشیا سے متعلق مضامین بھی لکھتے ہیں۔ اور سوشل میڈیا پر بے چاری عوام کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ پروپیگنڈہ ایک ایسا کارگر ہتھیار ہے جو تمام تر ترقیوں کے باوجود آج بھی موثر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اسے زبانی کلامی استعمال کیا جاتا تھا جس

کے اثرات مہینوں تو کبھی سالوں میں ظاہر ہوتے۔تاہم مواصلاتی ترقی نے پروپیگنڈے کی تیز رفتاری ہی میں اضافہ نہیں کیا اس کی قوت کو بھی دو چند کر دیا ہے۔اس لیے مسلم ممالک کے ذرائع ابلاغ کا کردار نہایت ذمہ دارانہ مثبت اور قرآن وسنت کی ہدایات کے عین مطابق ہونا چاہیے تاکہ دشمن کے شر انگیز پروپیگنڈے کو "خیر" سے بدلا جاسکے۔

فضل الٰہی اور نعمتِ الٰہی سے مراد

فَانْقَلَبُوْا	پھر وہ لوٹے	بِنِعْمَةٍ	نعمت کے ساتھ
مِّنَ اللّٰهِ	اللہ سے	وَفَضْلٍ	اور فضل کے (ساتھ)
لَّمْ يَمْسَسْهُمْ	انہیں نہیں پہنچی	سُوْٓءٌ	کوئی برائی
وَّاتَّبَعُوْا	اور انہوں نے پیروی کی	رِضْوَانَ اللّٰهِ	رضائے الٰہی کی
وَاللّٰهُ	اور اللہ	ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ	بڑے فضل والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ پس وہ اللہ کا انعام اور فضل لے کر واپس لوٹے۔اس انعام سے تجارتی منافع اور اخروی ثواب دونوں مراد ہیں۔اور فضل سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ خاص مہربانی ہے جو ان کے شامل حال تھی۔اور اس سے مراد وہ اضافی اجرِ عظیم اور غزوہ کے موقع پر بازارِ عکاظ میں تجارت سے حاصل ہونے والا حلال منافع ہے۔اس کے علاوہ سلامتی، عافیت اور دل کا وہ سکون واطمینان ہے جو جہاد میں ثابت قدم رہنے پر ملا۔لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ اور اہل ایمان کو کوئی تلیف بھی نہ پہنچی اور ان کی خصوصی شان یہ ہے وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی پیروی کی۔اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔جب انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی رضا کے تابع کر لیا تو پھر وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اللہ تعالیٰ بھی بہت بڑے فضل والا ہے۔اس نے دنیا میں بھی ان کو غالب کیا۔اور آخرت میں بھی ان کو وافر حصہ عطا کرے گا۔آج مسلمانوں میں صحابہ کرام علیہم الرضوان والی جانفشانی کا کروڑواں حصہ بھی باقی نہیں رہا۔کیونکہ ہمارا ایمان کمزور ہو چکا ہے۔اور دنیا صرف ایمان سے ڈرتی ہے۔الغرض! اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام علیہم الرضوان کا نمونہ بیان فرما کر آئندہ آنے والے مسلمانوں کے لیے راہ عمل متعین کر دی ہے۔

اہلِ باطل کا طریقہ/ اچھے اعمال کے ساتھ لمبی عمر پانا بھلائی کی علامت ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَہٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْھُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ
مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ ۚ اِنَّھُمْ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ
شَیْئًا ؕ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَلَّا یَجْعَلَ لَھُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ
الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیْئًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۷﴾
وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِھِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ
لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ﴿۱۷۸﴾

حقیقی خوف

اِنَّمَا	یقیناً	ذٰلِکُمْ	یہ (تو)
الشَّیْطٰنُ	شیطان ہی ہے	یُخَوِّفُ	وہ ڈراتا ہے
اَوْلِیَآءَہٗ	اپنے دوستوں سے	فَلَا	تو نہ
تَخَافُوْھُمْ	تم ان سے ڈرو	وَخَافُوْنِ	اور مجھی سے ڈرو

اِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم	مُؤْمِنِيْنَ	ایمان والے۔

فرمایا اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے یعنی اس جھوٹے پروپیگنڈا سے شیطان کے اپنے دوست (یعنی کمزور ایمان والے اور منافق قسم کے لوگ) تو ڈر سکتے ہیں مگر اہل اسلام پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوسکتا (امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، اس کا دوسرا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شیطان نے اپنے حواریوں کے ذریعے جھوٹا پروپیگنڈا کروایا تا کہ مسلمان ڈر جائیں۔ اور مشرکین کی اطاعت قبول کرلیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فرمایا فَلَا تَخَافُوْهُمْ تم ان سے مت ڈرو، ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔ مومن کا دل صرف اللہ کے خوف سے معمور ہونا چاہیے؛ کیونکہ حقیقی عزت، غلبہ اور نقصان یا نفع کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہ شخص جو یہ افواہیں پھیلا رہا تھا اسے شیطان فرمایا اور بتایا کہ یہ اپنے منافق دوستوں سے ڈرا رہا ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر دل میں نہ لائیں۔ حقیقی شیطان بھی اپنے انسانی دوست شیطانوں کے دلوں میں مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے کے نئے سے نئے طریقے ڈالتا رہتا ہے۔ آج کل اخبار، ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنیٹ سوشل میڈیا جھوٹ پھیلانے اور خوف زدہ کرنے کے لیے شیطان کے آلات ہیں۔ مومن کو ان کی خبروں سے ڈرنے کے بجائے اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے اور " اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ" (صحیح البخاری: 3030) کے تحت ان کا علاج بھی کرنا چاہیے۔ (اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ کا لغوی اور مفہوماتی مطلب یہ ہے کہ" جنگ ایک فریب/ چال ہے۔ اس کا مقصد دشمن کو ہر میدان میں جھوٹ یا بد عہدی کا درس دینا نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد جنگی تدبیر، حکمتِ عملی (Strategy) اور مکر وحیلہ ہے، حالتِ جنگ میں دشمن کو اپنی نقل وحرکت یا اصل قوت سے غافل رکھنا تا کہ کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ فتح حاصل کی جا سکے،" خدعۃ" کہلاتا ہے، اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ صلح کے معاہدات، وعدوں اور عہد کی خلاف ورزی (غدر) کی جائے۔ اسلامی اخلاقیات کے مطابق معاہدے کی پاسداری ہر حال میں لازمی ہے، البتہ برسرِ پیکار دشمن کے خلاف دورانِ جنگ عسکری چالیں چلنا جائز اور کامیاب جنگ کا حصہ

ہے۔)اس کے بجائے وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴿۱۷۵﴾ اگر تم پکے سچے مومن ہو تو مجھ سے ڈرو کہ کہیں میرے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔شیطان اور اس کے کارندے یہ کوشش کرتے ہیں کہ اہل حق کے دلوں میں باطل کی طاقت، کثرت اور سازشوں کا رعب بٹھا دیں تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر راہِ خدا سے پیچھے ہٹ جائیں۔اہل باطل کی نفسیات یہی ہے کہ وہ ہمیشہ اہل حق کو ڈرانے اور مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ وقتی حالات سے گھبرائیں نہیں بلکہ خدا پر بھروسہ رکھیں اور خدا کے سوا کسی کا خوف اپنے دل میں نہ آنے دیں، کہ جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ پوری کائنات سے ڈرتا ہے، اور جس میں خدا کا خوف ہو، کائنات کی ہر شئی اس سے ڈرتی ہے، اور قوموں کے دلوں میں اللہ کی طرف سے اس کا رعب ڈال دیا جاتا ہے۔

حقیقی مسلمانوں پر کفار کے حربے کامیاب نہیں ہوں گے

وَلَا يَحْزُنْكَ	اور نہ آپ کو غمگین کریں	الَّذِيْنَ	وہ لوگ جو
يُسَارِعُوْنَ	جلدی کرتے ہیں	فِى الْكُفْرِ	کفر میں
اِنَّهُمْ	یقیناً وہ	لَنْ يَّضُرُّوا	ہرگز نہیں نقصان پہنچا سکیں گے
اللّٰهَ	اللہ کو	شَيْئًا	کچھ بھی
يُرِيْدُ اللّٰهُ	چاہتا ہے اللہ	اَلَّا	یہ کہ نہ
يَجْعَلَ	رکھے	لَهُمْ	ان کے لئے
حَظًّا	کوئی حصہ	فِى الْاٰخِرَةِ	آخرت میں
وَلَهُمْ	اور ان کے لیے	عَذَابٌ عَظِيْمٌ	عذاب ہے بہت بڑا۔

اس دور میں مسلمانوں کے علاوہ جتنی بھی اقوام تھیں۔سب ہی اسلام دشمن اور اسے مٹانے کے درپے تھیں خواہ وہ مشرکین مکہ ہوں یا یہود مدینہ، منافقین ہوں یا دیگر قبائل عرب اور یہ سب لوگ اسلام کو کچلنے کے لیے حتیٰ المقدور کوششیں بھی کر رہے تھے۔اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ تمہارا یا اسلام کا کچھ بھی بگاڑنے کی قدرت نہیں رکھتے۔بس اپنی ہی عاقبت

خراب کر رہے ہیں۔ان کے بارے میں آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔فرمایا:
وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ اے پیغمبر (علیہ السلام)! وہ لوگ آپ کو غم میں نہ ڈالیں جو کافروں کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں تاکہ ان کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرسکیں۔فرمایا آپ دین کے معاملہ میں فکر مند نہ ہوں اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ط یہ لوگ اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔یہاں پر اللہ کو نقصان پہنچانے سے مراد اللہ کے دین کو نقصان پہنچانا ہے۔اس قسم کا طرز کلام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں آتا ہے۔جیسے سورہ حج میں آتا ہے۔وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اور اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا، جو اس کی مدد کرتا ہے۔ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی مدد کی کیا ضرورت ہے، وہ تو خود مدد کرنے والا ہے اور ہر چیز سے بے نیاز ہے۔مگر مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے دین کی مدد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے گا۔لفظ لَنْ مستقبل کے لیے نفی تاکید کا معنی دیتا ہے۔یعنی یہ لوگ آئندہ زمانہ میں بھی اللہ کے دین اور اہل ایمان کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے بشرطیکہ اہل ایمان اپنے ایمان پر پوری طرح قائم رہیں۔اس مقام پر تو منافقین کی بات ہو رہی ہے تاہم اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بتلا دیا کہ سچے مومنوں کے خلاف یہود، نصاریٰ، مشرکین یا کسی بھی دشمن دین کی سازش کامیاب نہیں ہو سکے گی۔حضور ﷺ کے زمانہ مبارک سے لے کر آج تک غیر مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ سازشیں کرتے رہے ہیں۔خصوصاً گذشتہ چار صدیوں میں تو اہل اسلام کے خلاف اس قدر طوفان برپا کیا گیا ہے کہ بیچارے اجتماعی طور پر مغلوب ہو گئے ہیں۔تاہم دین اور اہل اسلام کو جس قدر بھی نقصان پہنچا ہے۔یہ ہماری اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔اگر مسلمان صراط مستقیم پر قائم رہیں تو اللہ کا وعدہ آج بھی موجود ہے کہ تمام حربے استعمال کرنے کے باوجود یہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔فرمایا ان کی سازشوں کے صلے میں يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ج اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو۔ظاہر ہے کہ جو لوگ اہل ایمان کے خلاف کافروں کے ساتھ ساز باز کریں گے، خدا تعالیٰ کے احکام کو پس پشت ڈالیں گے، اس کے ماننے والوں کا کچھ خیال نہ کریں گے ان کا آخرت میں کیا حصہ ہوسکتا ہے، البتہ وَلَهُمْ

عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾ ان کے لیے بہت بڑا عذاب ضرور ہوگا۔اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا کہ بے شک، حقیقی مسلمانوں پر کفار کے حربے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ غلبہ ہمیشہ ایمان والوں کا ہی رہے گا۔اس حق حقیقت کی بنیادی وجوہات میں اللہ کی مدد، مومنوں کا استقامت والاعقیدہ اوران کا باہمی اتحاد شامل ہیں۔

ایمان اور کفر کا تقابل

اِنَّ الَّذِیْنَ	بیشک وہ لوگ جنہوں نے	اشْتَرَوُا	خریدا
الْكُفْرَ	کفر کو	بِالْاِیْمَانِ	ایمان کے بدلے
لَنْ	ہرگز نہیں	یَّضُرُّوا	وہ نقصان پہنچا سکیں گے
اللّٰهَ	اللہ کو	شَیْـًٔا	کچھ بھی
وَلَهُمْ	اوران کے لیے ہے	عَذَابٌ اَلِیْمٌ	عذاب دردناک۔

ارشادفرمایا:اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ : بے شک وہ جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر اختیار کیا۔کہ وہ منافقین جو کلمہ ایمان پڑھنے کے بعد کافر ہوئے یا وہ لوگ جو ایمان پر قادر ہونے کے باوجود کافر ہی رہے اور ایمان نہ لائے یہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے بلکہ ان کے کفر کا وبال انہی کے سر آئے گا۔لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وہ ہرگز اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔یہ آیت بتاتی ہے کہ ایمان کے بدلے کفر خریدنے والے اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا کفر اللہ کو نقصان نہیں دیتا،اس نقصان کا وبال خود کافر پر پڑتا ہے،اور اللہ کی پکڑ سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ایمان اور کفر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ایمان اللہ اور اس کے رسول کی سچے دل سے تصدیق کا نام ہے، جبکہ کفر اس کی تکذیب اور انکار کو کہتے ہیں،ایمان والوں کا انجام انسان کو ہدایت سکون اور اللہ کی رضا ملتی ہے،اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنتا ہے۔کفر کا انجام انسان اندھیروں اور گمراہی میں رہتا ہے،اور آخرت میں ناکامی کا سبب بنتا ہے۔

کفار کے لیے مہلت

وَلَا يَحۡسَبَنَّ	ہر گز گمان نہ کریں	الَّذِيۡنَ	وہ لوگ جنہوں نے
كَفَرُوۡۤا	کفر کیا	اَنَّمَا	کہ جو
نُمۡلِىۡ لَهُمۡ	ہم ڈھیل دے رہے ہیں انہیں	خَيۡرٌ	وہ بہتر ہے
لِّاَنۡفُسِهِمۡ	اُن کی جانوں کے لیے	اِنَّمَا	در حقیقت
نُمۡلِىۡ	ہم ڈھیل دیتے ہیں	لَهُمۡ	انہیں
لِيَزۡدَادُوۡۤا	تا کہ وہ بڑھ جائیں	اِثۡمًا	گناہ میں
وَلَهُمۡ عَذَابٌ	اور ان کے لیے عذاب ہے	مُّهِيۡنٌ	ذلیل کرنے والا۔

فرمایا وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِىۡ لَهُمۡ خَيۡرٌ لِّاَنۡفُسِهِمۡ ؕ ۔کافرلوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہماری عطا کردہ مہلت ان کے حق میں بہتر ہے۔ہم انہیں مہلت اس لیے دے رہے ہیں۔تا کہ وہ مزید گناہ کا ارتکاب کرلیں اور پھر یکبارگی ہماری گرفت میں آجائیں۔مفسرین کرام فرماتے ہیں۔کہ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شاگرد استاذ کے بار بار کہنے پر تعلیم کی طرف توجہ نہ دے، تو استاذ آخر اسے کہنا بھی چھوڑ دیتا ہے۔اور کہتا ہے اچھا! جب امتحان کا وقت آئے گا تو پھر تم سے نمنٹ لوں گا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی فرماتے ہیں۔کہ تمہیں جو ڈھیل دی جارہی ہے یہ تمہارے فائدے کے لیے نہیں۔اکثر اسلام کے دشمنوں اور جفا شعار لوگوں کو ظاہری ترقی اور عیش و آسائش کے نقشوں کو دیکھ کر یہ خیال گذرتا ہے کہ شاید ان پر خدا کا انعام ہے، اگر خدا ان سے ناراض ہوتا تو کس طرح وہ ایسی راحتوں کے نقشے میں ہوتے؟ قرآن نے اسی گتھی کو کھولا ہے، کہ دنیا میں اللہ کی نعمتیں کبھی بہ طور انعام کے دی جاتی ہیں اور کبھی بہ طور امہال کے، امہال سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ڈھیل دی جاتی ہے فرمایا: اِنَّمَا نُمۡلِىۡ لَهُمۡ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ۚ بلکہ اس واسطے کہ تم مزید گناہ میں مبتلا ہو جاؤ۔اور پھر جب میری پکڑ آئے گی تو تم ذلیل وخوار ہو کر رہ جاؤ گے۔اس آیت میں چیز سمجھائی جارہی ہے۔کہ زندگی کی قیمتی پونجی کو اچھی تجارت میں لگا کر اس سے آخرت کا سامان خرید لو۔ اس عمر کو غنیمت جانو۔صحت سے فائدہ اٹھاؤ۔مال کو اچھے مصرف میں لگاؤ۔اگر اس پونجی سے فائدہ نہ

اٹھایا تو یاد رکھو وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۱۷۸﴾ ایسے لوگوں کے لیے ذلت ناک عذاب بھی تیار ہے۔ وہ بچ نہیں سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ عموماً فوری طور پر کسی گناہ پر گرفت نہیں فرماتا بلکہ مہلت دیتا ہے اور دنیاوی آسائشوں کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے اس سے بہت سے لوگ اس دھوکے میں پڑے رہتے ہیں کہ ان کا کفر اور ان کی حرکتیں کچھ نقصان دہ نہیں ہیں ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ کافروں کو لمبی عمر ملنا، انہیں فوری عذاب نہ ہونا اور انہیں مہلت دیا جانا ایسی چیز نہیں کہ جسے وہ اپنے حق میں بہتر سمجھیں بلکہ توبہ نہ کرنے کی صورت میں یہی مہلت ان کے گناہوں میں اضافے اور ان کی تباہی و بربادی کا سبب بننے والی ہوتی ہے۔ لہٰذا اِس مہلت کو اپنے حق میں ہرگز بہتر نہ سمجھیں۔

لمبی عمر پانا اچھا بھی ہوسکتا ہے اور برا بھی۔ جیسا کہ حضرت ابو بکرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں، ایک شخص نے حضور پر نور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے دریافت کیا کہ کون شخص اچھا ہے؟ ارشاد فرمایا، جس کی عمر دراز ہو اور عمل اچھے ہوں۔ عرض کیا گیا: اور بدتر کون ہے؟ ارشاد فرمایا، جس کی عمر دراز ہو اور عمل خراب ہوں۔ (ترمذی، کتاب الفتن، ۲۲-باب منہ، ۴ / ۱۴۸، الحدیث: ۲۳۳۷) اور حضرت ابو ہریرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں ''قضاعہ قبیلے کے دو شخص نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پر ایمان لائے، ان میں ایک تو شہید ہوگیا اور دوسرا مزید ایک سال تک زندہ رہا، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہ کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ بعد میں مرنے والا شہید سے بھی پہلے جنت میں داخل ہوگیا، مجھے اس پر تعجب ہوا تو صبح میں نے یہ واقعہ حضور سید المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے عرض کیا تو ارشاد فرمایا: کیا اس نے اس کے بعد ایک رمضان کے روزے نہ رکھے تھے اور چھ ہزار رکعت نماز اور اتنی اتنی سنتیں نہ پڑھی تھیں؟ (مسند امام احمد، مسند ابی ہریرۃ، ۳ / ۲۲۹، الحدیث: ۸۴۰۷)

کیا انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے پاس علم غیب تھا؟

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ عَلٰى مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ حَتّٰى يَمِيۡزَ الۡخَبِيۡثَ مِنَ
الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى الۡغَيۡبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِىۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ
يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَلَكُمۡ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۹﴾

"علمِ غیب" باری تعالیٰ کا خاصہ ہے

مَا كَانَ اللّٰهُ	نہیں ہے اللہ	لِيَذَرَ	کہ چھوڑ دے
الۡمُؤۡمِنِيۡنَ	ایمان والوں کو	عَلٰى مَاۤ	اس (حالت) پر کہ
اَنۡتُمۡ	(ہو) تم	عَلَيۡهِ	اس پر
حَتّٰى	یہاں تک کہ	يَمِيۡزَ	وہ علیحدہ کر دے
الۡخَبِيۡثَ	ناپاک کو	مِنَ الطَّيِّبِ	پاک سے
وَمَا كَانَ اللّٰهُ	اور نہیں ہے اللہ	لِيُطۡلِعَكُمۡ	کہ تمہیں خبر دے
عَلَى الۡغَيۡبِ	غیب پر	وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	اور لیکن اللہ
يَجۡتَبِىۡ	چن لیتا ہے	مِنۡ رُّسُلِهٖ	اپنے رسولوں میں سے
مَنۡ يَّشَآءُ	جس کو وہ چاہتا ہے	فَاٰمِنُوۡا	تو تم ایمان لاؤ
بِاللّٰهِ	اللہ پر	وَرُسُلِهٖ	اور اس کے رسولوں (پر)

وَاِنْ	اور اگر	تُؤْمِنُوْا	تم ایمان لاؤ گے
وَتَتَّقُوْا	اور تقویٰ اختیار کرو گے	فَلَكُمْ	تو تمہارے لیے
اَجْرٌ	اجر ہے	عَظِيْمٌ	بہت بڑا۔(179)

ارشاد ہوتا ہے مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے۔کہ مومنوں کو اس حالت پر چھوڑ دے جس پر تم ہو۔حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ط یہاں تک کہ ناپاک کو پاک سے علیحدہ کر دے۔اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں ہے۔کہ خالص مومن اور منافق آپس میں ملے جلے بلا امتیاز چلتے رہیں۔جو لوگ ایماندار ہیں اور اپنی فکر، ذہن اور عمل کے لحاظ سے پاک ہیں۔وہ فکری، ذہنی اور عملی لحاظ سے ناپاک لوگوں کے ساتھ اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ انہیں تو بہر حال ممیز ہونا چاہئے۔بدعقیدگی، کفر اور شرک گندگی ہے۔قرآن پاک نے صاف فرمایا۔اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ مشرک بلا شبہ پلید ہیں۔اللہ نے منافق کو بھی ناپاک فرمایا ہے۔ مگر مومن کی شان یہ ہے۔کہ وہ جنابت میں بھی ناپاک نہیں ہوتا۔حضور ﷺ نے فرمایا۔اِنَّ الْمُسْلِمَ لَا يَنْجُسُ مومن کبھی نجس نہیں ہوتا، اس کی روح ہمیشہ پاک رہتی ہے وقتی طور پر اس کا جسم ناپاک ہو جاتا ہے، اس کے لیے غسل فرض ہو جاتا ہے، مگر ایسی حالت میں بھی وہ دوسرے شخص کو سلام کر سکتا ہے۔اس سے مصافحہ کر سکتا ہے۔لوگوں سے میل ملاپ کر سکتا ہے، اللہ کا ذکر کر سکتا ہے جس روح میں ایمان اور توحید بھری ہوئی ہے، وہ ناپاک نہیں ہوتی۔بہر حال اللہ تعالیٰ کی یہ تکوینی حکمت ہے کہ وہ مخلصین کو منافقین سے الگ کر دے۔دوسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ اللہ تعالیٰ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہر ایماندار کو غیب پر مطلع کر دے۔یعنی اللہ پر یہ لازم نہیں کہ ہر ایک کو دوسرے کے حال سے واقف کرائے۔کہ فلاں مومن یا فلاں منافق ہے۔فلاں توحید پرست ہے اور فلاں مشرک ہے اس کے بجائے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔بلا شبہ رسول، اللہ کے منتخب لوگ ہوتے ہیں وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ یہ چنے ہوئے لوگ ہیں۔بلا شبہ رسول، اللہ کے منتخب لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر اللہ تعالیٰ خاص صلاحیت

اور استعداد رکھتا ہے اور پھر ان کو غیب کی بات بتلاتا ہے۔غیب کا معنی مخفی اور پوشیدہ ہے۔علامہ بیضاوی نے غیب کا مفہوم یہ بھی بیان کیا ہے کہ ایسی چیز جسے حواس کے ذریعے معلوم نہ کیا جا سکے، حواس ظاہرہ ہوں یا باطنہ یعنی وہاں تک عقل کی رسائی نہ ہو سکے۔جو چیز عقل اور حواس کے ذریعے معلوم ہو گی وہ غیب نہیں ہو گی بلکہ اخبار غیب بن جائیگی۔غرض غیب وہ چیز ہے جو نہ حواس سے معلوم ہو سکے اور نہ عقل کا وہاں ادراک ہو۔

غیب اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے دو حصے ہیں۔پہلا یہ کہ غیب لذاتہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا ذاتی ہے۔کسی کا عطا کردہ نہیں۔اس کے علاوہ مخلوق کے پاس جس قدر علم ہے وہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے کسی فرد کے پاس ذاتی علم غیب نہیں ہے۔یہ تو سیدھا سا مسئلہ ہے۔کہ مخلوق میں سے کسی کی ذات ہستی بھی اس کی ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہے تو علم جو صفت ہے وہ کیسے ذاتی ہو سکتا ہے۔جب کہ ہر صفت بشمول علم اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ علم محیط بھی اللہ کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔اس کے سوا کسی کا علم، علم محیط نہیں۔قرآن پاک میں بار بار آیا ہے۔وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے۔نیز وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ازل سے لے کر ابد تک کے ذرہ ذرہ کا احاطہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات کو ہے۔اس کے علاوہ نہ کسی کو ذاتی علم ہے اور نہ وہ ہر چیز پر محیط ہے۔اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے سب سے زیادہ علم انبیاء (علیہم السلام) کو عطا کرتا ہے۔اور پھر تمام انبیاء علیہم السلام میں سے سب سے زیادہ حضور نبی کریم ﷺ کو دیا ہے۔لیکن آپ کا علم بھی نہ ذاتی ہے اور نہ محیط ہے۔آج کے دور میں تو کہا جاتا ہے۔کہ نبی (علیہ السلام) ذرے ذرے کا علم جانتے ہیں۔اہل بدعت نے اس آیت کو غلط معنی پہنائے ہیں۔کہ اللہ تعالیٰ نبی کو علم غیب عطا کر دیتا ہے۔یہ عقیدہ کتاب، سنت، اور اجماع امت کے خلاف ہے لہذا باطل ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلی علم کسی کو نہیں دیا۔قرآن پاک میں بیسیوں آیات ہیں جو اس مسئلہ کو واضح کرتی ہیں۔قرآن پاک نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ۔ہم نے اپنی نبی کو نہ شعر و شاعری سکھائی ہے اور نہ یہ اس کی شان کے شایان ہے شاعری کتنا بڑا فن

ہے۔دنیا میں اس کی لاکھوں کتابیں موجود ہیں مگر یہ چیز نبی کو نہیں سکھائی گئی۔دنیا میں کتنے علوم ہیں جن سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔جیسے جادو،کہانت،شعروغیرہ۔کیا ہم ہر علم کو نبی کی ذات جمع کریں گے۔نبی (علیہ السلام) نے تو خود دعا کی۔اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ۔ اے اللہ! میں غیر نفع بخش علم سے تیری پناہ پکڑتا ہوں،وہ مجھے نہ دیا جائے۔تو ایسی صورت میں نبی (علیہ السلام) کے لیے علم محیط کیسے تسلیم کیا جائے گا۔

تمام کائنات مل کر بھی رسول اللہ ﷺ کے علم کا تصور نہیں کر سکتی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب،سرورِکونین سیدنا ومولانا حضرت محمد ﷺ کو تمام جہانوں سے بڑھ کر علم عطا فرمایا،تمام کائنات مل کر بھی رسول اللہ ﷺ کے علم کا تصور نہیں کر سکتی،اسی طرح ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے اتنا وسیع علم عطا فرمایا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ تمام مخلوقات مل کر اس مقام تک نہیں پہنچ سکتیں،اور پھر رسول اللہ ﷺ کو تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر فضیلت بخشی لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے "علم" (اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت) میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے،جو کسی کا عطا کیا ہوا نہیں ہے،جو اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ ہمیشہ سے اور ہمیشہ ہمیشہ تک ہر چیز کے بارے میں حاصل ہے،اس علم کے حصول میں کسی بھی قسم کا واسطہ نہیں ہے،جس کی خبر اللہ تعالیٰ کو کسی نے نہیں دی۔ شریعت کے عرف میں علمِ غیب سے یہی مراد ہوتا ہے اور اُس پر غیب کا اطلاق بندوں کی نسبت سے ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی علم جو بلا واسطہ،کسی کے بتائے بغیر ہمیشہ سے ہمیشہ تک کے لیے حاصل ہے،اس میں کوئی بھی شریک نہیں ہو سکتا۔

البتہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو اور ان کے واسطے امتوں کو جنت،جہنم اور قبر کے احوال نیز بہت سی وہ باتیں بتائی ہیں جو پردہ غیب میں ہیں۔جنہیں "اَخبارِغیب" "انباء الغیب" یا "اطلاع علی بعض المغیبات" کہا جاتا ہے،اور اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام علیہم السلام کو جتنا چاہتے ہیں اَخبارِغیب کا علم عطا فرماتے ہیں،لیکن غیب کی خبر کو غیب کا علم نہیں کہا جاتا،کیوں کہ یہ علم اللہ تعالیٰ کے بتانے سے حاصل ہوتا ہے،اور بسا اوقات جبریل امین کا بھی درمیان میں واسطہ

آجاتا ہے، لہٰذا ان اخبارِ غیب کو علمِ غیب نہیں کہا جاسکتا۔

اسے (بلاتشبیہ) ایک مثال کے ذریعے سمجھیے، ایک وہ شخص ہے جو کوئی چیز ایجاد کرے یا کوئی سائنسی تجربہ کر کے جدید ٹیکنالوجی حاصل کرے، اور دوسرا شخص وہ ہے جو پہلے شخص سے ٹیکنالوجی حاصل کر کے وہی چیز بنائے، یا دنیا میں سب سے پہلے اس ٹیکنالوجی کی خبر دے اور اس کی تشہیر کرے۔ ظاہر ہے کہ دنیاوی نظم کے تحت ایجاد موجد کی ہی کہلائے گی، اور خبر دینے والے یا اس ایجاد کو نقل کر کے اشیاء بنانے والے کو موجد نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح بلاتشبیہ سمجھ لیجیے کہ ایک غیب کا براہِ راست بلاواسطہ علم ہے، اور دوسرا انہی مغیبات میں سے بعض اشیاء کے بارے میں خبر دینا ہے۔

علمِ غیب اور اَخبارِ غیب

"علمِ غیب" اور "اَخبارِ غیب" کا یہ فرق قرآنِ مجید نے بھی واضح کیا ہے، ذیل میں دونوں طرح کی آیات ذکر کی جاتی ہیں، مذکورہ تشریح کی روشنی میں دونوں آیات اپنی جگہ واضح ہیں۔

ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُل لَّآ أَقُولُ لَكُمۡ عِندِي خَزَآئِنُ ٱللَّهِ وَلَآ أَعۡلَمُ ٱلۡغَيۡبَ وَلَآ أَقُولُ لَكُمۡ إِنِّي مَلَكٌۖ (الأنعام:50)

"آپ کہہ دیجیے کہ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب جانتا ہوں، نہ ہی میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔"

سیدنا نوح علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب اللہ تعالیٰ نے یوں نقل فرمایا ہے:

وَلَآ أَقُولُ لَكُمۡ عِندِي خَزَآئِنُ ٱللَّهِ وَلَآ أَعۡلَمُ ٱلۡغَيۡبَ وَلَآ أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ

(ہود:31)

"میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب جانتا ہوں، نہ ہی میں فرشتہ ہوں۔"

سورہ النمل میں ہے:

قُلۡ لَّا یَعۡلَمُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الۡغَیۡبَ اِلَّا اللّٰہُ (النمل:65)

آپ کہہ دیجیے کہ آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی غیب نہیں جانتا سوائے اللہ کے۔

سورہ اعراف میں ہے:

قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِکُ لِنَفۡسِیۡ نَفۡعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ وَ لَوۡ کُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ لَا سۡتَکۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَیۡرِ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوۡٓءُ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ (الأعراف:188)

آپ کہہ دیجیے کہ میں اپنے لیے نہ تو نفع کا مالک ہوں، اور نہ ہی نقصان کا، مگر جو اللہ چاہے، اور اگر میں غیب جانتا تو میں بہت زیادہ خیر حاصل کرتا، اور مجھے برائی چھوتی ہی نہیں، میں تو ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں ایمان والوں کو۔

یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ بہت سے مواقع پر رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچائی گئی۔ مثلاً: آپ ﷺ کے پاس کچھ لوگ آئے اور انہوں نے خود کو مسلمان ظاہر کیا، اور کہا کہ قوم میں تبلیغِ دین اور قرآن کریم سکھانے کی ضرورت ہے، آپ ﷺ قراء و علماء صحابہ کرام کو ساتھ بھیج دیں، اس طرح کے دو واقعے پیش آئے جن میں آپ ﷺ کے صحابہ کرام کو راستے میں دھوکے سے شہید کر دیا گیا۔ ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ دشمن کی سازش کو جانتے ہوئے اپنی امت کے ان منتخب لوگوں کو ہرگز ان کے حوالے نہ فرماتے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو گوشت میں زہر دیا گیا اور آپ ﷺ نے ایک لقمہ منہ میں لیا بھی، جسے تھوک دیا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس گوشت نے خبر دی کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے، اور مرضِ وفات میں آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ مجھے خیبر کے زہر کا اثر محسوس ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے سے علم ہوتا تو حضور ﷺ ہرگز زہر آلود گوشت تناول نہ فرماتے۔

جب کہ دوسری طرف بے شمار مواقع پر قبل از وقوعِ واقعہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بذریعہ

وحی اطلاع دے دی، اور آپ ﷺ نے قیامت تک پیش آنے والے بے شمار احوال کی امت کو خبر دے دی، بلکہ جنت وجہنم میں داخلے تک کے تمام مراحل کی بے شمار غیبی خبریں پہنچا دیں، غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا: "أَمَا إِنَّهَا سَتَهُبُّ اللَّيْلَةَ رِيحٌ شَدِيدَةٌ فَلَا يَقُومَنَّ أَحَدٌ وَمَنْ كَانَ مَعَهُ بَعِيرٌ فَلْيَعْقِلْهُ". (صحيح البخاري: 1481، صحيح مسلم: 1392) "خبردار! آج رات سخت آندھی چلے گی، لہٰذا کوئی بھی کھڑا نہ ہو اور جس کے پاس اونٹ ہو، اسے باندھ لے۔"

اور پھر اسی طرح ہوا۔ اسی طرح غزوہ بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے کفار کے سرداروں کے قتل کی جگہیں متعین فرما دیں، چناں چہ وہ اپنے مقتل سے ایک سوت اِدھر اُدھر نہ ہو پائے۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر طویل خطبہ ارشاد فرمایا جس میں قیامت تک آنے والی ہر قابل ذکر جماعت اور گروپ کا ذکر فرمایا اور اس کے امیر (لیڈر) کا نام بھی بتایا، اور ایک موقع پر آپ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے تو دونوں ہاتھوں میں دو رجسٹر تھے، دائیں ہاتھ والے کی بابت فرمایا کہ اس میں اہلِ جنت کے نام ہیں، جب کہ بائیں ہاتھ والے کی بابت فرمایا کہ اس میں اہلِ جہنم کے نام ہیں، پھر ان دونوں رجسٹروں کو اشارہ سے چھوڑ دیا اور وہ غائب ہو گئے۔ اور آپ ﷺ نے دجال کے آنے سے پہلے قسطنطنیہ کی فتح کی بشارت دی، اور مغرب کی فتح کے بعد جب دجال کے ظہور کی باطل خبر دنیا میں پھیلے گی اس وقت مسلمانوں کی فاتح فوج جن افراد کو دجال کی خبر کی تحقیق کے لیے روانہ کرے گی، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں ان کو ان کے ناموں سے جانتا ہوں۔ اس طرح کی بے شمار خبریں اور آپ ﷺ کے معجزات ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ "علمِ غیب" باری تعالیٰ کا خاصہ ہے، جو اللہ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہے، البتہ انبیاءِ کرام علیہم السلام خصوصاً رسول اللہ ﷺ کو بے شمار اَخبارِ غیب عطا دی گئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ایسے علوم عطا فرمائے ہیں کہ تمام مخلوق مل کر بھی کسی نبی کے علم کی ہم سری کرنا تو درکنار پاسنگ تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ فرمایا فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ تمہارا فرض ہے۔ کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ کیونکہ اسی میں تمہاری فلاح ہے وَاِنْ تُؤْمِنُوْا اور اگر کما حقہ ایمان لاؤ گے وَتَتَّقُوْا اور تقوی کی راہ

اختیار کرو گے۔کفر، شرک، بدعت، معاصی اور ذنوب سے بچتے رہو گے۔اللہ کی مقرر کردہ حدوں کی حفاظت کرو گے فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب الطاف القدس (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصوف، باطنی علوم اور انسانی لطائف پر ایک اہم فارسی کتاب ہے، جس کا پورا نام" الطائف القدس فی معرفۃ لطائف النفس" ہے۔اس کتاب میں قلب، روح، عقل اور نفس کی حقیقت اور اصلاح کے طریقے بیان کیے گئے ہیں) میں فرماتے ہیں کہ تقوی محافظت برحدود شرع کا نام ہے۔شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے حلال وحرام کا امتیاز کرنا، صحیح اور غلط میں فرق کرنا ہی تقوی کہلاتا ہے۔جو شخص تقوی کے معیار پر پورا اترا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بہت بڑے انعام کا وعدہ فرمایا ہے۔

بخل کے بجائے سخاوت وفیاضی/
بخل کے اسباب اور ان کا علاج

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ
هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۠﴿۱۸۰﴾

بخل وکنجوسی کی ممانعت

وَلَا یَحْسَبَنَّ	اور ہرگز گمان نہ کریں	الَّذِیْنَ	وہ لوگ جو
یَبْخَلُوْنَ	بخل کرتے ہیں	بِمَآ اٰتٰىهُمُ	ساتھ اس کے جو انہیں دیا
اللّٰهُ	اللہ نے	مِنْ فَضْلِهٖ	اپنے فضل سے
هُوَ خَیْرًا	(کہ) وہ بہتر ہے	لَّهُمْ	ان کے لیے
بَلْ هُوَ	بلکہ وہ	شَرٌّ	برا ہے
لَّهُمْ	انکے لیے	سَیُطَوَّقُوْنَ	عنقریب وہ طوق پہنائے جائیں گے
مَا	اس (مال) کا کہ	بَخِلُوْا	انہوں نے بخل کیا تھا
بِهٖ	اس کے ساتھ	یَوْمَ الْقِیٰمَةِ	قیامت کے دن

وَلِلّٰهِ	اور اللہ ہی کے لیے	مِيْرَاثُ	ملکیت ہے
السَّمٰوٰتِ	آسمانوں	وَالْاَرْضِ	اور زمین کی
وَاللّٰهُ	اور اللہ	بِمَا	ساتھ اُس کے جو
تَعْمَلُوْنَ	تم کرتے ہو	خَبِيْرٌ	خوب خبر دار ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ

بخیل لوگ بخل کر کے یہ نہ گمان کریں کہ جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے، وہ ان کے لیے بہتر ہے۔ بلکہ وہ تو ان کے لیے برا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بِمَآ اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں۔ اللہ کریم انسان کو یہ جتلانا چاہتے ہیں کہ جس مال کے خرچ کا اس سے تقاضا کیا جا رہا ہے۔ وہ اس کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ ہی کا عطا کردہ ہے۔ انسان کا تو جسم اور قویٰ بھی ذاتی نہیں ہیں چہ جائیکہ مال ذاتی ہو۔ اللہ تعالیٰ مختلف لوگوں کو مختلف ذرائع سے مال مہیا کر دیتا ہے اور انسان یہ سمجھتا ہے۔ کہ یہ اس کے عقل و ہنر کا مرہون منت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اسباب پیدا کر کے مال دیا ہے۔ اور پھر اس میں سے اپنے راستے میں کرچ کرنے کی ترغیب دی ہے مگر کنجوس آدمی سمجھتا ہے۔ کہ کنجوسی اس کے حق میں بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ بخل ان کے حق میں بہت بری چیز ہے۔ بخل، جود و کرم اور سخاوت کی ضد ہے۔ لغت میں 'بخل' کے معنی ہیں انسان کے پاس جو کچھ مال و دولت ہے اس کو روک کر رکھنا، دوسروں کو نہ دینا اور خرچ نہ کرنا۔

بخل اور بخیل

اسلام کی بنیادی تعلیم ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی ہوئی دولت خود اپنی ذات اور لازمی ضروریات پر اور بیوی بچوں اور عزیز و اقارب پر خرچ کرے۔ اس کے ساتھ دوسروں کی ضروریات پر خرچ کرے۔ اس کے برعکس بخل یہ ہے کہ آدمی مال و دولت کو گن گن کر رکھے۔ ممکنہ حد تک اس کو خرچ ہونے سے بچائے اور اگر خرچ ہو بھی تو محض اس کی اپنی ذات پر ہو۔ بخیل کو

دوسروں کی ضروریات، ان کی تکلیف اور پریشانی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ خود کو اور اپنے متعلقین کو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے محروم رکھتا ہے۔ اس کے باوجود اپنی اس بُری عادت کو درست اور صحیح گردانتا ہے۔ خود کو عقل مند سمجھتا ہے کہ وہ مستقبل کے لئے خزانہ اکٹھا کر رہا ہے۔ وہ افادۂ عام اور دوسرے انسانوں کے دکھ درد میں خرچ کرنے والوں کو بے وقوف سمجھتا ہے۔ 'بخل' ایک مزاجی کیفیت کا نام ہے۔ جس شخص کو یہ بیماری لگ جاتی ہے، وہ خود دنیا کی ساری چیزوں کا مالک بن کر رہنا چاہتا ہے، لیکن کسی کو کچھ بھی نہیں دینا چاہتا۔ اس کے دل و دماغ میں خود غرضی اور خود نمائی سمائی ہوئی ہوتی ہے۔ اسے صرف اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے ہر رویے سے تنگی جھلکتی ہے۔ مزاج وطبیعت میں بخل نظر آتا ہے۔ اس مزاجی کیفیت کی جھلک کبھی مال و دولت میں دکھائی دیتی ہے، کبھی علم وفن میں اس کا رنگ ظاہر ہوتا ہے۔

بخیل شخص مال و دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے، نہ خود کھاتا ہے، نہ دوسروں کو کھانے دیتا ہے۔ وہ اگر عہدے اور منصب کو حاصل کر لیتا ہے یا پھر قوت وطاقت کا مالک بن جاتا ہے تو سارے اختیارات اپنی مٹھی میں رکھتا ہے۔ اس کے ماتحت کام کرنے والے پریشان رہتے ہیں۔ پورا نظام تباہ و برباد ہو کر رہتا ہے۔ اسی طرح بخیل شخص اگر علم وفن کے خزانوں پر قابض ہو جاتا ہے تو اس کے فیض سے انسانیت محروم رہتی ہے۔ قرآن نے اس طرح کے رویے پر سخت وعید سنائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے۔'' (البقرہ: ۱۴۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد سب سے بڑا سخی وہ شخص ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا۔'' (مشکوٰۃ، کتاب العلم)

بخیل شخص کے اخلاق، معاملات اور رویے میں بھی تنگی کا ہی مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہ شفقت، ہمدردی، احسان، رواداری، حُسنِ سلوک جیسے اوصاف سے عاری دکھائی دیتا ہے۔ دوسروں کو پھلتا پھولتا، خوش حال اور مسکراتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس کی ذات سے دوسروں کو کلفت اور زحمت ہی ملتی ہے۔ اسے پھول سے الجھن ہوتی ہے، وہ راستوں میں کانٹے ڈالنے کا ہی کام کرتا

ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس رویے پر ہلاکت کی وعید سنائی ہے۔ارشادِ ربانی ہے:’’پھر تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں میں غافل رہتے ہیں اور جو دکھاوا کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی معمولی چیزوں کو مانگنے پر نہیں دیتے۔‘‘ (الماعون:۴-۷)

دین اسلام نے نرمی اور محبت ،سخاوت اور فیاضی کا مزاج دیا ہے۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:’’انسانوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ شخص ہے جو لوگوں کے لئے زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہو۔‘‘ (الصحیح الالبانی:۹۰۶) دوسری حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ’’دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔‘‘ (بخاری) دین اسلام نے انسانوں کے ساتھ ہمدردی کرنے اور ان کے کام آنے کی تعلیم دی ہے۔حدیث میں انسانوں کی پریشانیوں کو دور کرنے اور انھیں خوش کرنے کو صدقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’نیکی کا حکم دینا، بُرائی سے روکنا، راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹا دینا، بہرے کو بات سمجھا دینا، اندھے کو راہ دکھا دینا، کمزوروں کو سواری پر چڑھا دینا، اچھی اور پیاری باتیں بولنا، یہاں تک کہ اپنے بھائی سے مسکرا کر ملنا بھی صدقہ ہے۔‘‘ (بخاری ،مسلم ابن حبان) لوگوں کے لئے سلامتی اور بھلائی کی دعا نہ کرنا بھی بخل ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:’’وہ شخص بہت بڑا بخیل ہے جو سلام کرنے میں بخل کرے۔‘‘ (ابن حبان، الصحیح الالبانی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:’’بخیل وہ شخص ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود وسلام نہ بھیجے۔‘‘ (ترمذی، حسن صحیح)

اچھے جذبات اور احساسات کا اظہار نہ کرنا بھی بخل ہے۔اس کوتاہی سے کتنے خاندان بکھر جاتے ہیں، کتنے جوڑے بچھڑ جاتے ہیں، بچے یتیم ہو جاتے ہیں، گھر اُجڑ جاتے ہیں۔اس کے برخلاف دوسروں کے لئے بہتر جذبات واحساسات کا اظہار کرنے سے تعلقات استوار ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے لئے قبولیت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:’’تم میں بہتر شخص وہ ہے جو تم میں اپنے گھر والوں کے لئے سب سے بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم میں سب سے بہتر ہوں۔‘‘ (ترمذی)

احساسات کا بخل

کتنے بچے ہیں جو زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ ہمیں صرف مدرسے کا اچھا بیگ، عمدہ لباس، لذیذ کھانے، اچھے کھلونے ہی نہیں چاہئیں بلکہ نرم دل اور کشادہ سینہ چاہیے، جو ہمیں چمٹا لے، محبت کا اظہار کرے۔ ہمیں ایسے کان چاہئیں جو ہماری آرزوؤں کو سنیں۔ حاضر جواب دماغ چاہیے جو ہمیں تسلی بخش جوابات دے۔ کبھی کبھی جذبات اور احساسات کا بخل مالی بخل سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ کتنے بچے ہیں جو گھر میں محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ ان کی اس خواہش کی تکمیل گھر کے عزیز و اقارب سے نہیں ہوتی ہے تو اس محبت کی تلاش میں باہر بازاروں میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ بہت سے بچے جذبات کے بخل کی وجہ سے گوشہ گیر ہو جاتے ہیں۔ انھیں انسانوں سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ مزاج میں چڑچڑاپن اور ایک رخاپن آجاتا ہے۔ بعض بچے تشدد اور انحراف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ سکون کی تلاش میں نشہ آور چیزیں استعمال کرنے لگتے ہیں۔ رقم نہ ملنے کی صورت میں انھیں چوری کی لت لگ جاتی ہے۔ پھر وہ ہر طرح کی سماجی بُرائیوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔

بخل کے دینی و دنیاوی نقصانات

بخل کی بیماری ایسی مہلک بیماری ہے جس کی وجہ سے انسان نہ صرف نیکیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کر کے ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔ بخل کی وجہ سے انسان فرائض بھی ادا نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر جو شخص اپنے مال سے اللہ کی فرض کردہ زکوۃ ادا نہیں کرتا۔ وہ مسنون اور مستحب صدقہ و خیرات کب کرے گا۔ بخل بہت بُری اور مذموم صفت ہے، اس کے متعدد دینی و دنیاوی نقصانات ہیں، ان میں سے چند حسب ذیل ہیں: 1 بخیل کبھی کامل مؤمن نہیں بن سکتا۔ 2 بخل ایمان سے روکنے اور کفر کی طرف لے جانے کا باعث ہے۔ 3 بخل جنت سے محرومی اور جہنم میں لے جانے کا باعث ہے۔ 4 بخل کی وجہ سے ایک مسلمان، کامل مومن بننے سے محروم رہتا ہے۔ 5 بخل خونریزی اور دنیا و آخرت میں ہلاکت کا باعث ہے۔ 6 بخل کے باعث انسان راہِ

خدا میں خرچ کرنے کے اجر و ثواب سے محروم رہتا ہے۔ 7 بخل عزت و ناموس کی بربادی اور حرام کو حلال ٹھہرانے کا باعث ہے۔ 8 بخل کے باعث انسان زکوٰۃ جیسے اہم فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے۔ 9 بخل کی وجہ سے دلوں میں نفاق اور رشتوں میں دوریاں پیدا ہوتی ہیں 10 اور بخل کے باعث لالچ، حرص، نفرت، کدورت، تنگدلی اور تنگ ظرفی جیسی متعدد سماجی برائیوں میں اضافہ ہوتا ہے، جس کے سبب معاشرے میں انسان کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا حتی الامکان اس مذموم صفت سے بچیں اور ایثار قربانی اور سخاوت کا مظاہرہ کریں۔

فرمایا بخیلوں کو جو کچھ اللہ نے دیا ہے، وہ اسے اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے لیے شر ہے۔ اور ان کے بخل کی آخرت میں سزا یہ ہوگی۔ فرمایا: سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ط قیامت کے دن بخیلوں کے گلے میں اس چیز کو طوق بنا کر ڈالا جائے گا، جس کے ساتھ انہوں نے بخل کیا۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی کی دولت عطا کی اور اس نے زکوٰۃ ادا نہیں کی، قیامت کے دن یہ مال سانپ بن جائیگا، اور اس کے گلے میں پڑ کر اس کو کاٹے گا، اور کہے گا أَنَا مَالُكَ أَنَا كَنْزُكَ۔ میں تیرا وہ مال ہوں، میں تیرا وہ خزانہ ہوں جسے تو سمیٹ سمیٹ کر رکھتا تھا، جسے تو عیاشی اور فحاشی میں صرف کرتا تھا اور جس کے ساتھ تو غریب و مسکین کی پرورش نہیں کرتا تھا۔ فرمایا اسی طرح اگر کسی کے پاس جانور تھے اور اس نے ان کا حق ادا نہیں کیا۔ تو وہ اس شخص کے اوپر سے گزریں گے اس کو روندیں گے اس کو سینگ ماریں گے۔ اور اس کو کاٹیں گے۔ فرمایا یہ نہ سمجھو کہ اگر دنیا میں کسی کو مال مل گیا تو وہ اس کی ذاتی میراث بن گیا۔ بلکہ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ط زمین و آسمان کی تمام وراثت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ ہر چیز کا خالق بھی وہی ہے۔ اور مالک بھی وہی ہے۔ أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ۔ اللہ نے تم پر احسان فرمایا کہ تمہیں عارضی طور پر اس کا مالک بنایا۔ پھر اپنے احکام بھیجے تا کہ ان کے مطابق عمل کر کے اس مال سے نیکی کما لو۔ اس کے مال کو اسی کے راستے میں خرچ کرو، بخل نہ کرو۔ اور یاد رکھو! وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١٨٠﴾ تمہارے ہر فعل کی اللہ تعالیٰ کو خبر ہے۔ تم جو کچھ دنیا میں کر رہے ہو، وہ سب کچھ تمہارے سامنے آجائیگا اور پھر تمہیں اس کا بھگتان کرنا ہوگا۔ (1) بخل کا پہلا سبب تنگ دستی کا

خوف ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھے، کہ راہِ خدا میں مال خرچ کرنے سے کمی نہیں آتی بلکہ اضافہ ہوتا ہے۔(2) بخل کا دوسرا سبب مال سے محبت ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ قبر کی تنہائی کو یاد کرے، کہ میرا یہ مال قبر میں میرے کسی کام نہ آئے گا، بلکہ میرے مرنے کے بعد ورثا اسے بے دردی سے خرچ کریں گے۔(3) بخل کا تیسرا سبب نفسانی خواہشات کا غلبہ ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ خواہشاتِ نفسانی کے نقصانات اور اس کے اخروی انجام کا بار بار مطالعہ کرے۔(4) بخل کا چوتھا سبب بچوں کے روشن مستقبل کی خواہش ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ بندۂ مؤمن اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے، اور اپنے اعتقاد و یقین کو مزید پختہ کرے، کہ جس رب تعالیٰ نے میرا مستقبل بہتر بنایا، وہی خالق کائنات میرے بچوں کے مستقبل کو بھی بہتر بنانے پر قادر ہے۔(5) بخل کا پانچواں سبب آخرت کے معاملے میں غفلت ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ بندہ اس بات پر غور کرے، کہ جو مال و دولت میں نے راہِ خدا میں خرچ کیا، مرنے کے بعد وہ یقیناً مجھے نفع دے گا، لہٰذا اس فانی مال سے خوب نفع اٹھانے کے لیے، اسے نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا ہی عقل مندی ہے۔(۲۴)(6) بخل کا مؤثر اور بنیادی علاج یہ ہے کہ بخل کے اسباب پر غور کر کے انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے، اپنے دل کو مال کی محبت اور نفسانی خواہشات سے پاک کیا جائے، نیز اپنے معاملات میں قناعت، صبر اور میانہ روی اختیار کی جائے کہ دین اسلام ہمیں ہر معاملے میں ہمیشہ اعتدال و میانہ روی کا حکم دیتا ہے، نیز بخل و کنجوسی اور اسراف سے منع کرتا ہے۔بخل ایمان کے لیے کس قدر خطرناک اور بُری صفت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اللہ کی پناہ چاہی، حضرت سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اَللّٰھُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ اے اللہ! میں بخل سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔اے اللہ! ہمیں بخل و کنجوسی کی عادت سے بچا، دین و دنیا کے تمام معاملات میں اعتدال اور میانہ روی کی توفیق عطا فرما، کفایت شعاری اور سادگی کی دولت سے مالا مال فرما اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔

یہودیوں کا گستاخانہ قول اور اس کا جواب/قرض حسنہ کسے کہتے ہیں؟

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا
قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا
قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۱۸۲﴾

قرض حسنہ کے سلسلہ میں دس ہدایات

لَقَدْ	البتہ تحقیق	سَمِعَ اللّٰهُ	سن لی اللہ نے
قَوْلَ الَّذِیْنَ	بات اُن لوگوں کی جنہوں نے	قَالُوْٓا	کہا
اِنَّ اللّٰهَ	کہ بیشک اللہ	فَقِیْرٌ	فقیر ہے
وَّنَحْنُ	اور ہم	اَغْنِیَآءُ	مالدار ہیں
سَنَكْتُبُ	یقیناً ہم لکھتے ہیں	مَا قَالُوْا	جو کچھ انہوں نے کہا
وَقَتْلَهُمُ	اور ان کے قتل کرنے کو (بھی)	الْاَنْۢبِیَآءَ	انبیاء کا
بِغَیْرِ حَقٍّ	ناحق	وَّنَقُوْلُ	اور ہم کہیں گے
ذُوْقُوْا	تم چکھو	عَذَابَ الْحَرِیْقِ	عذاب جلانے والا۔

اس آیت کریمہ میں یہودیوں کی گستاخی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ

الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ بیشک اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بات سن لی جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) فقیر ہے اور ہم غنی ہیں ان آیات میں یہود کے اعتراضات کا بیان اور ان کا جواب دینا مقصود ہے۔ دراصل یہود یہ اعتراضات نبوت پر طعن کی غرض سے کرتے تھے۔ کتب تفسیر میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: (مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا) [البقرۃ:245] "کون ہے جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض" نازل ہوئی تو بعض یہود نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: "لو جی، اللہ میاں بھی فقیر ہوگئے ہیں اور بندوں سے قرض مانگنے پر اتر آئے ہیں۔" تو ان کے جواب میں یہ آیت اتری۔ (ابن کثیر) دراصل اس قسم کے اعتراضات وہ عوام کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے متنفر کرنے کی غرض سے کرتے تھے، ورنہ وہ بھی خوب جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسے الفاظ کہنا کتنی بڑی گستاخی اور کفر ہے۔ (قرطبی) قرآن مجید نے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے ایک نہایت ہی ایمان افروز تعبیر اختیار کی ہے، کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اللہ کو قرض دینا ہے، جو اس کو زیادہ بہتر صورت میں قیامت کے دن واپس ملے گا، مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا) (الحدید:۱۱) یہ ایسا وجد انگیز ترغیبی کلام ہے کہ نہ دینے والے ہاتھ بھی دینے کو بے قرار ہوجائیں اور بخیل سے بخیل شخص بھی اس کو سن کر اپنے قلب کو کشادہ پائے؛ لیکن 'مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر' کے مصداق یہودیوں نے اسے اُلٹے تمسخر کا ذریعہ بنالیا اور کہنے لگے کہ لیجئے، گویا ہم مالدار ہیں اور اللہ محتاج ہیں کہ قرض طلب کررہے ہیں، ان کے اسی جواب کو اللہ تعالیٰ نے یہاں حکایتاً نقل فرمایا ہے۔ یہود کا یہ جواب ان کے بخل کا ہی نہیں ان کے خبث باطن کا پورا پورا پتہ دے رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مال تو سب اللہ ہی کا ہے۔ اسی نے تمہیں عطا کیا ہے اور جو قرض مانگتا ہے وہ بھی تمہارے ہی بھائی بندوں پر خرچ ہوگا۔ کیونکہ اللہ تو بے نیاز ہے۔ پھر اس قرض کو اپنی طرف منسوب کرنا اور پھر اس پر بڑا اجر عطا فرمانا اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت

اور اس کا فضل ہے پھر اس جملہ میں جس انداز سے صدقہ کی ترغیب دی گئی ہے وہ نہایت لطیف پیرایہ ہے اور جتنا یہ پیرایہ لطیف ہے۔ اتنا ہی بھونڈے انداز سے یہود نے اس کا جواب دیا۔ جہاں تک اللہ کو قرض حسن دینے کی بات ہے۔ اسے یہودی اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہ سمجھ سکے۔ اللہ تعالیٰ نہ تو فقیر ہے (نعوذ باللہ) اور نہ اسے اپنی مخلوق سے قرض کی ضرورت ہے۔ اس نے جس قرض حسن کا ذکر کیا ہے۔ اس سے مراد یتیموں، مسکینوں، بیواؤ اور دیگر مستحقین پر خرچ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے۔ کہ تم اپنے مال میں سے مستحقین پر خرچ کرو۔ اور اس کا اجر مجھ سے وصول کرلو۔

قرض حسنہ سے مراد ہر وہ مال ہے جو محض اللہ کی رضا کے لیے اس کی ہدایات واحکام کے مطابق خرچ کیا جائے۔ خواہ وہ فرضی صدقہ یا زکوٰۃ ہو یا واجبی صدقات ہوں یا نفلی ہوں اور خواہ وہ فی سبیل اللہ جہاد میں خرچ کیا جائے یا کسی محتاج کی احتیاج کو دور کرنے کے لیے اسے دیا جائے۔ قرض حسنہ کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل دس امور کا لحاظ رکھنا اسے افضل صدقہ بنادیں گے۔ (1) حلال کمائی سے خرچ کیا جائے کیونکہ حرام کمائی سے صدقہ قبول نہیں، (2) صدقہ میں ناقص مال نہ دے، (3) اس وقت صدقہ کرے جبکہ خود بھی اسے احتیاج ہو، (4) اپنی احتیاج پر دوسرے کی احتیاج کو مقدم رکھے، (5) صدقہ چھپا کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ (6) صدقہ دینے کے بعد احسان نہ جتلائے اور نہ ہی کسی دوسری صورت میں اس کا معاوضہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ باتیں صدقہ کو برباد کردیتی ہیں، (7) صدقہ میں نمود ونمائش یعنی ریا کا شائبہ تک نہ ہو۔ یہ بات بھی صدقہ کو برباد کردیتی ہے، اپنے دیئے ہوئے صدقہ کو حقیر جانے۔ صدقہ دے کر اس کا نفس اس نیکی پر پھول نہ جائے، (9) اگر صدقہ میں اپنا بہترین اور پسندیدہ مال دے تو یہ اس کے اپنے حق میں بہت بہتر ہے۔ (10) محتاج کو صدقہ دینے کے بعد یہ نہ سمجھے کہ میں نے اس پر احسان کیا ہے بلکہ یہ سمجھے کہ میرے مال میں اس کا یہ حق تھا اور میں نے اس کا حق ادا کیا ہے اور مستحق کو حق دے کر اپنے سر سے بوجھ ہلکا کیا ہے۔

قرضہ حسنہ کے دو فائدے

قرضہ حسنہ دینے والوں سے اللہ تعالیٰ نے دو وعدے فرمائے ایک یہ کہ اللہ اسے کئی گناہ زیادہ کرکے واپس کرے گا۔ دنیا میں بھی ایسے خرچ کیے ہوئے مال کی واپسی کا اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے۔ اور آخرت میں تو سات سو گنا یا اس سے بڑھ کر بھی اضافہ ہوسکتا ہے یعنی قرضہ حسنہ کی مندرجہ بالا شرائط کو جتنا زیادہ ملحوظ رکھا جائے گا۔ اسی تناسب سے اس کے اجر میں اضافہ ہوگا۔ اور دوسرا وعدہ یہ کہ انہیں عمدہ اجر عطا کرے گا۔ یہ فقرہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ہی عطا کردہ مال میں سے انسان اس مال کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کے کہنے کے مطابق خرچ کردے تو انسان کو بدلہ ملنے کا حق کہاں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ ایسے قرض حسنہ دینے والوں کو بہت عمدہ اجر عطا فرمائے گا۔ واضح رہے کہ اللہ کا بندے کو اصل سے دوگنا یا زیادہ دینے کا معاملہ کوئی سود بیاج کا معاملہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ معاملہ آقا اور اس کے غلام کے درمیان ہے۔ اور غلام کی خدمات کا مالک جتنا بھی صلہ دے دے، برابر برابر دے دوگنا دے، دس بیس گنا دے وہ سود بیاج نہیں کہلاسکتا۔ البتہ یہ اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ آقا اپنے غلام کی خدمات کا کس قدر قدر شناس اور کریم النفس ہے۔ باری تعالیٰ ان صدقات وخیرات کو اپنی بارگاہ میں کبھی قرض حسنہ کا نام دیتا ہے اور کبھی ان کو زکوٰۃ کا نام دیتا ہے اور کبھی ان کو صدقہ کا نام دیتا ہے اور کبھی ان کو رزق کا نام دیتا ہے اور کبھی اس کو انفاق فی المال کا نام دیتا ہے اور کبھی اس کو خیر کا نام دیتا ہے۔ غرضیکہ صدقات وخیرات کے باب میں نام کوئی بھی ہو اس رب کا وعدہ ہے جو یہ صدقہ وخیرات کا عمل کرے گا تو میں اس کے رزق کو بڑھا دوں گا۔ اس کے رزق کو کشادہ کردوں گا اور اس کے رزق کو دوگنا اور کئی گنا کردوں گا اور اس کے رزق کو حالت بسط عطا کردوں گا اور اس کا انفاق کا یہ عمل خیر ہی خیر ہوگا اور یہ صدقہ اس بندے کے لیے اللہ کی بارگاہ میں بہت بڑے اجر وثواب کا باعث ہوگا۔

بہر حال فرمایا جو اللہ کو قرض دے گا۔میں اس کا دگنا چوگنا اجر عطا کروں گا۔اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے میں خرچ کرنے والوں کو یقین دلایا ہے۔کہ تمہارا خرچ کیا ہوا مال ضائع نہیں جائے گا۔ اس آیہ کریمہ میں واضح کیا جو اللہ کو قرض حسنہ اس کی ضرورت منداور حاجت مند مخلوق پر خرچ کرنے کی صورت میں دے گا۔باری تعالیٰ نے فرمایا جو میرے محتاج بندوں پر خرچ کرے گا اسے میں قرض حسنہ شمار کروں گا اور اس قرض حسنہ کو اس بندے کو اَضۡعَافًا كَثِيۡرَةً کئی گنا بڑھا کر عطا کروں گا۔ صدقات اور خیرات کی صورت میں خرچ کیے ہوئے مال کو بڑھانا اور اس مال میں برکت پیدا کرنا اور اس مال میں مسلسل اضافہ کرتے رہنا ہی عمل مشیت الٰہیہ ہے۔بندے کو یہ سوچ کر کہ صدقے کے ذریعے مال میں کمی ہو جائے گی۔خیرات کے ذریعے مال میں تنگی ہو جائے گی اور مالی حالت میں برتری اور دشواری آجائے گی۔ان تصورات اور خیالات کی بنا پر بندے کو کبھی اپنا ہاتھ صدقہ و خیرات سے نہیں روکنا چاہیے۔اس لیے کہ رزق میں اضافہ اور کمی رب کی مشیت اور رب کی قدرت اور رب کی عطا اور رب کی کرم نوازی اور رب کی خوشنودی اور رب کی ناراضگی سے ہوتا ہے۔رزق کو بڑھانا اور رزق کو کم کرنا اس کی دست قدرت میں ہے۔اس لیے وہ فرماتا ہے: قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ وَیَقۡدِرُ لَہٗ وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَہُوَ یُخۡلِفُہٗ وَہُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ. (السباء، 39:34)''فرما دیجیے: بے شک میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رِزق کشادہ فرما دیتا ہے اور جس کے لیے (چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے، اور تم (اللہ کی راہ میں) جو کچھ بھی خرچ کرو گے تو وہ اس کے بدلہ میں اور دے گا اور وہ سب سے بہتر رِزق دینے والا ہے۔'' یہ آیہ کریمہ اہل ایمان کو انفاق فی المال کے حوالے سے ہر اندیشے اور ہر خطرے اور ہر وسوسے سے امان اور تحفظ دیتی ہے کہ اللہ کے رزق میں سے جی بھر کر اللہ کی راہ میں خرچ کرو مال میں تنگی اور کمی کے اندیشے کو اپنے ذہن سے نکال دو۔اس لیے کہ وہ رب ہی تمہارے

رزق اور مال میں قوتِ بسط اور قوتِ قدر کا مالک ہے۔مال میں فراخی بھی اس کی عطا ہے اور مال میں کمی بھی اس کی حکمت ہے۔وہ بندے کے مال میں فراخی اور تنگی دونوں حالتوں پر قادر ہے اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔

اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اس کے سامنے تمام مخلوق محتاج ہے۔جیسا کہ اس کا اپنا ارشاد ہے۔یٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۔اس کی ذات بے نیاز ہے اور تم سب اس کے سامنے فقیر اور محتاج ہو۔یہاں پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے۔کہ اللہ تعالیٰ نے حلت وحرمت کے جتنے احکام نازل فرمائے ہیں وہ سب انسانوں ہی کے فائدے کے لیے ہیں یا ان کے نقصان سے بچنے کے لیے ہیں۔لوگ جس قدر صدقہ خیرات کرتے ہیں یا زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، ان میں سے اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی چیز نہیں جاتی اور نہ ہی اس کو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔وہ تو غنی ہے۔اس میں باقی انسانوں کے لیے فائدے ہیں۔امیر آدمی کے صدقہ خیرات سے محتاج کی پرورش ہوجاتی ہے۔یہ تو اللہ تعالیٰ نے آپس میں ہمدردی اور غمگساری کا ذریعہ پیدا فرمادیا ہے اس سے پاکیزہ جذبات پیدا ہوتے ہیں اور انسان کو تہذیب نفس حاصل ہوتی ہے۔اس سے انسان کے اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے۔یہ چیزیں بہر حال بنی نوع انسان کے لیے مفید ہوتی ہیں۔اسی طرح اللہ جل جلالہ نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے۔ان میں لوگوں کے لیے نقصانات ہیں۔اول تو کوئی نہ کوئی جسمانی نقصان ہوگا، وگرنہ روحانی نقصان تو لازمی ہوگا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو انسانوں کے لیے حرام قرار دے دیا ہے۔

یہاں ان کی اسی جسارت انگیز بات پر نکیر فرمائی جارہی ہے۔۔فرمایا یہودیوں کے اس گستاخانہ کلام کا بدلہ یہ ہے کہ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا ہم اس بات کو ضرور لکھ لیں گے۔اللہ تعالیٰ تو علیم کل ہے اسے لکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ہر چیز اس کے علم میں ہے۔تاہم انصاف کے تقاضوں کو

پورا کرنے کے لیے ان کی یہ بات لکھ لی جائیگی۔ اور دفتر میں محفوظ ہو جائیگی۔ پھر حساب کتاب کے دن لا کر ان کے سامنے رکھ دی جائیگی۔ تا کہ وہ اس کا انکار نہ کرسکیں۔ وَقَتْلَهُمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ اور ان کا نبیوں کو کسی حق کے بغیر قتل کرنا بھی اور ہم کہیں گے جلنے کا عذاب چکھو۔ چنانچہ ان کی یہ بدکلامی بھی ان کے نامہ اعمال میں لکھ دی گئی ہے، اسی نامہ اعمال میں جہاں جہاں ان کی انتہائی بدکرداری یعنی انبیاء علیہم السلام کا قتل لکھا گیا ہے۔ قیامت کے دن یہ سب کچھ ان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ پھر ان کے کیے کی پوری پوری سزا بھی انہیں جلا دینے والے عذاب کی صورت میں دی جائے گی۔

ظَلَّام کا معنی ومفہوم

ذٰلِكَ بِمَا	یہ بسبب اس کے جو	قَدَّمَتْ	آگے بھیجا
اَيْدِيْكُمْ	تمہارے ہاتھوں نے	وَاَنَّ اللّٰهَ	اور یہ کہ اللہ
لَيْسَ	نہیں ہے	بِظَلَّامٍ	ظلم کرنے والا
لِّلْعَبِيْدِ	واسطے بندوں کے۔(182)		

فرمایا ہماری سخت سزا تمہارے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ بلکہ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ یہ اس وجہ سے ہے جو کچھ تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ تم نے دنیا میں جس قسم کے اعمال انجام دیے یہ انہی کا بدلہ ہے۔ سورہ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ تمہاری اپنی ہی کمائی تمہارے سامنے آئے گی۔ یہ تمہاری بداعمالیوں کا صلہ ہے۔ جو تمہیں مل رہا ہے۔ اور یاد رکھو وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا، وہ تو انصاف کرنے والا ہے۔ رحیم و کریم ہے۔ یہاں پر ظلام مبالغہ کا صیغہ ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بالکل ظلم نہیں کرتا یا ذرہ بھر بھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ اس

مبالغے کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ظلم کی نفی کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعوذ باللہ رتی برابر بھی ظلم صادر ہو تو وہ "ظَلاَّمٌ" ٹھہرے گا اور اللہ تعالیٰ کی ذات ظلم سے منزہ ہے۔" یہ جواب بھی اچھا ہے، مگر اس سے قوی جواب یہ ہے کہ بعض اوقات مبالغے کے صیغے پر نفی آئے تو اس سے مراد مبالغہ کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ نفی میں مبالغہ ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ "اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔ مگر انسان خود اپنی نافرمانی، بداعتقادی، بداعمالی اور معاصی کی وجہ سے شدید تر سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

بائبل اور قرآن میں قربانی کا تصور

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَلَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰہَ عَھِدَ اِلَیْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ

النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَکُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ

قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ کَذَّبُوْکَ فَقَدْ کُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِکَ

جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْکِتٰبِ الْمُنِیْرِ ﴿۱۸۴﴾

سوختنی قربانی کی فرمائش

اَلَّذِیْنَ	جن لوگوں نے	قَالُوْۤا	کہا
اِنَّ اللّٰہَ	بلاشبہ اللہ نے	عَھِدَ	عہد لیا ہے
اِلَیْنَاۤ	ہم سے	اَلَّا	یہ کہ نہ
نُؤْمِنَ	ہم ایمان لائیں	لِرَسُوْلٍ	کسی رسول پر
حَتّٰی	یہاں تک کہ	یَاْتِیَنَا	وہ لائے ہمارے پاس
بِقُرْبَانٍ	ایسی قربانی	تَاْکُلُہُ	کہ کھا جائے اسے
النَّارُ	آگ	قُلْ	آپ کہہ دیں
قَدْ جَآءَکُمْ	تحقیق آئے تمہارے پاس	رُسُلٌ	بہت سے رسول

مِّنۡ قَبۡلِىۡ	مجھ سے پہلے	بِالۡبَيِّنٰتِ	واضح دلائل کے ساتھ
وَبِالَّذِىۡ	اور اس کے ساتھ جو	قُلۡتُمۡ	تم نے کہا
فَلِمَ	پھر کیوں	قَتَلۡتُمُوۡهُمۡ	تم نے انہیں قتل کیا
اِنۡ كُنۡتُمۡ	اگر ہو تم	صٰدِقِيۡنَ	سچے۔(183)

اَلَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰى يَاۡتِيَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡكُلُهُ النَّارُ ؕ : وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ہمارے ساتھ عہد کیا ہے کہ ہم کسی رسول پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں، جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جس کو آگ کھا جائے۔ یہ ان کا دوسرا اعتراض ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہ لانے کے سلسلے میں پیش کیا کہ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا ہے کہ اگر کوئی نبی یہ معجزہ پیش نہ کرے تو اس پر ایمان نہ لائیں۔(رازی) حالانکہ ان کی کسی کتاب میں یہ حکم نہیں اور ان کے تمام انبیاء علیہم السلام کو یہ معجزہ عطا بھی نہیں ہوا تھا، جیسا کہ اسی آیت میں اشارہ ہے: (قُلۡ قَدۡ جَآءَكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِىۡ) یہاں "رسل" نکرہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تمام انبیاء علیہم السلام کو نہیں، بلکہ بعض کو یہ معجزہ عطا ہوا کہ جب کوئی سوختنی (جلائی جانے والی) قربانی (نذر) پیش کی جاتی تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے، اس قربانی (نذر) کی قبولیت کی علامت کے طور پر آسمان سے آگ اترتی، جو اسے جلا ڈالتی۔(سوختنی قربانی سے مراد ایسی قربانی ہے جسے آگ کے ذریعے مکمل طور پر جلا کر راکھ یا بھسم کر دیا جائے تا کہ وہ خدا کے حضور نذرانہ بن جائے۔ یہ پرانے مذاہب اور بالخصوص بنی اسرائیل کی شریعت میں ایک معروف قسم کی قربانی تھی) سابقہ امتوں میں مال غنیمت کا استعمال بھی جائز نہیں تھا۔لہذا محاذ جنگ سے حاصل ہونے والا مال لوگ استعمال بھی جائز نہیں تھا۔لہذا محاذ جنگ سے حاصل ہونے والا مال لوگ استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ سارا سامان ایک مقام پر اکٹھا کر دیا جاتا تھا۔آسمان سے سفید رنگ کی معجزانہ آگ آتی تھی جو اسے جلا کر راکھ کر دیتی تھی۔اور ایسا بھی ہوسکتا ہے۔کہ چونکہ یہ مال ان لوگوں کے لیے حلال نہیں تھا۔اس

لیے وہ خود ہی اسے آگ لگا کر ضائع کر دیتے ہوں۔ مگر نبی آخر الزمان ﷺ کی امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت کو حلال قرار دیا ہے۔ صحیح حدیث میں حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری عاجزی اور ضعف کو دیکھ کر ہمارے لیے مال غنیمت جائز قرار دے دیا ہے۔ سورہ انفال میں بھی موجود ہے فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا مال غنیمت کے حلال اور طیب مال میں سے کھاؤ۔ بائیبل کی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ہاں قربانی کی قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ آسمان سے آگ نازل ہو کر اسے جلا دیتی تھی۔ چنانچہ بعض مواقع پر کوئی نبی سوختنی قربانی کرتا تھا تو آگ اسے جلا دیتی تھی۔ الغرض! اہل کتاب نے نبی ﷺ سے ایسی ہی معجزانہ قربانی کی فرمائش کی، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے عہد کر رکھا ہے کہ جب تک ایسی قربانی کا مشاہدہ نہ کر لیں ہم کسی رسول پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرمائش کے جواب میں فرمایا۔ قُلْ اے پیغمبر (علیہ السلام)! ان کو کہہ دیجئے قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِي مجھ سے پہلے تمہارے پاس بہت سے رسول آئے ہیں بِالْبَيِّنٰتِ واضح باتیں لے کر۔ بینات معجزے کو بھی کہتے ہیں اور واضح احکام پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے نماز روزہ، توحید، صبر، شکر، خدا کا ذکر وغیرہ یہ سب بینات اور دین کے بڑے اہم اصول ہیں۔ اللہ کے نبی ہر بات میں واضح دلائل پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر توحید کے متعلق تو بڑے بڑے عقلی اور نقلی دلائل اور مشاہدہ کے ہزاروں دلائل پیش کیے گئے ہیں جن کو سن کر اور دیکھ کر ہر سلیم الفطرت انسان تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور عنادی ذہن والے لاجواب ہو جاتے ہیں اور جہالت پر اتر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے توحید باری تعالیٰ کے متعلق عقلی، نقلی اور مشاہداتی دلائل کتنے مضبوط تھے جن کا جواب نہ باپ دے سکا، نہ بادشاہ وقت اور نہ ساری قوم نتیجہ یہ ہوا کہ دلائل کا جواب دلائل سے دینے کی بجائے مار پیٹ پر تیار ہو گئے، باپ نے گھر سے نکال دیا۔ حتی کہ پوری قوم دشمن جان بن گئی۔ اسی لیے فرمایا کہ اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھ سے پہلے بھی اللہ کے رسول واضح دلائل لے کر آئے ہیں وَبِالَّذِي قُلْتُمْ اور وہ چیز بھی لائے ہیں جسکی تم لوگ فرمائش کر رہے

ہو۔یعنی مجھ سے پہلے اللہ کے نبی سوختنی قربانی کی دلیل بھی تمہارے آباء واجداد کے سامنے پیش کر چکے ہیں مگر انہوں نے پھر بھی انکار کر دیا۔یہودیوں کا یہ قول صریح جھوٹ اور اللہ پر بہتان ہے۔تورات میں یا موجودہ بائیبل میں کہیں بھی مذکور نہیں کہ جو نبی آتشیں قربانی کا معجزہ پیش نہ کر سکے وہ نبی نہ ہوگا۔البتہ اس حد تک یہ بات درست ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو یہ معجزہ دیا گیا تھا۔سب سے پہلے تو قابیل اور ہابیل کی قربانی کے قبول ہونے کا ہی یہ معیار مقرر ہوا تھا۔پھر بعد میں حضرت الیاس، حضرت سلیمان اور حضرت یحییٰ (علیہم السلام) کو یہ معجزہ عطا ہوا تھا اور بیشتر انبیاء علیہم السلام ایسے تھے جنہیں یہ معجزہ نہیں دیا گیا تھا۔اب یہود سے سوال یہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک کسی نبی کے برحق ہونے کا یہی معیار ہے تو پھر جن انبیاء علیہم السلام کو یہ معجزہ دیا گیا تھا۔انہیں تم نے کیوں قتل کیا تھا۔حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ان یہود نے قتل کر دیا اور اسرائیل کے بادشاہ کی بعل پرست ملکہ حضرت الیاس علیہ السلام کی دشمن ہوگئی اور زن پرست بادشاہ اپنی ملکہ کو خوش کرنے کے لیے ان کے قتل کے درپے ہوا۔آخر انہیں وہاں سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا میں پناہ لینا پڑی (سلاطین باب 19:18) فرمایا تمہارے آباء واجداد نے منہ مانگا معجزہ دیکھنے کے باوجود فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ پس تم نے یعنی تمہارے آباء واجداد کے نام پر قربان کرو، پھر دیکھتے ہیں۔کہ کس کی قربانی کو آسمانی آگ جلا کر قبولیت کے درجہ تک پہنچاتی ہے۔چنانچہ دونوں قربانیاں کی گئیں۔حضرت الیاس (علیہ السلام) کی قربانی کو آگ نے جلا دیا اور اسرائیلیوں کی قربانی ویسی کی ویسی رہی۔چاہیئے تو یہ تھا کہ اب یہودی حضرت الیاس (علیہ السلام) کو اللہ کا نبی تسلیم کر لیتے مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے، بلکہ آپ کے اور زیادہ دشمن ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے نبی کو پہاڑوں میں پناہ لے کر جان بچانا پڑی۔حتیٰ کہ وہ اپنے ملک سے ہجرت کر گئے۔ فرمایا اس بات کا جواب دو اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔مقصد یہ کہ آج تم مجھ سے وہی پرانا قربانی والا معجزہ طلب کر رہے ہو۔اگر اللہ تعالیٰ تمہاری فرمائش پوری بھی کر دے، پھر بھی تم ماننے پر تیار نہ ہو گے بلکہ کسی اور حیلے بہانے سے انکار

کر دو گے ۔ان انبیاء کرام کے ساتھ بنی اسرائیل نے جو بدسلوکی روا رکھی ،اس پر خود بائبل گواہ ہے ،اگر ان کے ماننے کا یہی معیار ہوتا تو ان انبیاء علیہم السلام کو تکلیفیں نہ پہنچاتے ،غرض کہ یہ محض سرکشی اور روگردانی کے بہانے ہیں ؛ ورنہ اللہ تعالیٰ نے ہرگز ان سے یہ عہد نہیں لیا کہ جو پیغمبر فلاں متعین معجزہ دکھائے اس پر ایمان لاؤ ورنہ نہیں ۔

الزُّبُر کا معنیٰ مفہوم

فَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ	پھر اگر وہ جھٹلائیں آپ کو	فَقَدۡ	تو تحقیق
كُذِّبَ	جھٹلائے گئے	رُسُلٌ	بہت سے رسول
مِّنۡ قَبۡلِكَ	آپ سے پہلے	جَآءُوۡ	وہ لائے تھے
بِالۡبَيِّنٰتِ	واضح دلائل	وَالزُّبُرِ	اور صحیفے
وَالۡكِتٰبِ	اور کتاب	الۡمُنِيۡرِ	روشن ۔(184)

یہود کے تمسخر اور اعتراضات کا جواب دینے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اس قسم کے شبہات پیدا کر کے اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو یہ غم کی بات نہیں ، کیونکہ آپ سے پہلے بہت سے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ وہ یہ سلوک کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور اس کے متبعین کو تسلی دی اور فرمایا فَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ اگر یہ لوگ ایسا کرتے ہیں ،تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے فَقَدۡ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ بیشک آپ سے پہلے بھی اللہ کے رسول جھٹلائے گئے ہیں ۔جس طرح آج آپ کی قوم آپ کا انکار کر رہی ہے اسی طرح سابقہ قومیں سابقہ انبیاء(علیہم السلام) کا انکار کرتی رہی ہیں اور نبی بھی ایسے جَآءُوۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۔جو کھلی نشانیاں یعنی معجزات اور دلائل لے کر آئے ۔اور بڑی نصیحت آموز باتیں لے کر اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے ۔”البینات“ سے دلائل عقلیہ اور معجزات دونوں مراد ہیں ۔”الزُّبُرِ یہ زبور کی جمع ہے ۔اس سے وہ چھوٹے چھوٹے صحیفے مراد ہیں جن میں نیکی کی نصیحت ، برائی سے روکنے اور حکمت و دانائی کی باتیں ہوتی تھیں ۔حضرت داؤد علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی ،قرآن نے اسے بھی ”زبور“ کہا ہے، کیونکہ اس میں بھی انہی

چیزوں کا پہلو نمایاں ہے اور قرآن کی اصطلاح میں "الکتاب" سے مراد وہ بڑی کتاب ہے جس میں مسائل واحکام اور دوسری سب چیزیں ہوں، مگر ان کتابوں میں قرآن مجید کے سوا کسی کتاب کو اعجازی حیثیت حاصل نہیں ہوئی (کہ اس کی کسی سورت کے مقابلے میں اس جیسی ایک سورت لانے کا چیلنج ہو)۔ اسی لیے حضرت داود (علیہ السلام) کا صحیفہ زبور کہلاتا ہے۔ صحیفے میں احکام اتنے زیادہ نہیں ہوتے البتہ معاشرتی پند ونصائح ہوتے ہیں۔ فرمایا اس کے علاوہ اللہ کے وہ پیغمبر وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ روشن کتاب بھی لے کر آئے، مگر پھر بھی تمہاری قوم نے انہیں تسلیم نہ کیا۔ روشن کتاب سے مراد ایسی کتاب ہے جس میں وعظ ونصیحت کے علاوہ ہر قسم کے احکام منجملہ حلال وحرام کے احکام، سیاسی اور معاشی احکام، جہاد، عبادات اور دیگر معاشرتی احکام موجود ہوں۔ فرمایا اللہ کے نبیوں نے تمام حجت پوری کر دی مگر ان لوگوں نے ان کا نہ صرف انکار کیا، بلکہ ان کے قتل کے درپے ہوئے۔ لہذا اے پیغمبر! آپ بددل نہ ہوں۔ پیغمبروں کو جھٹلانا ان کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ یہ لوگ اپنی عادت سے باز نہیں آئیں گے۔ لہذا آپ اپنا کام کرتے چلے جائیں۔

اس آیت کریمہ میں حضور پرنور صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ کو تسلی دی جارہی ہے کیونکہ جب کوئی حق پر ہو اور اس کی حقانیت سورج سے زیادہ روشن ہو لیکن پھر بھی ایک گروہ اسے جھٹلائے اور اس کی حقانیت تسلیم نہ کرے تو اسے قلبی رنج ضرور ہوتا ہے اور رسول اکرم صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ چونکہ اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ قرآن میں بار بار سرکارِ دوعالم صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ کو تسلی دیتا ہے، چنانچہ یہاں بھی اِسی کا بیان ہوا اور فرمایا گیا کہ اے حبیب! صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ، اگر یہ کفار تمہاری تکذیب کرتے ہیں تو آپ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ غمزدہ نہ ہوں کیونکہ آپ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ سے پہلے رسولوں کی بھی تکذیب کی گئی ہے جو صاف نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔ آپ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ بھی ان کی طرح صبر واِستقامت سے تبلیغ دین فرماتے رہیں۔

معلوم ہوا اسلام کی سربلندی کے لیے جستجو کرنا اور توحید ورسالت کا پیغام لوگوں تک پہنچانا انتہائی عظیم عمل ہے اور مشکل بھی۔ خاص کر جب اسلام کو چند عبادات واخلاقیات کی بجائے ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کیا جائے۔ ایسے میں معبودان باطلہ کی تردید بھی ہوگی، ادیان باطلہ پر ضرب بھی

لگے گی۔ ملحدین کے لیے ایسی دعوت باعث تشویش ہوگی۔ تمام طرح کے نظام ہائے معیشت و معاشرت اور سیاست ایسی دعوت گوارہ نہیں کریں گے۔ طاغوت کی تردید ونفی پر مبنی دعوت کو کبھی پھیلنے نہیں دیا جائے گا۔ جتنا دعوت کا وژن بڑا ہوگا اسی قدر مخالفین کی طرف سے شدید مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جدید الحاد، سیکولرزام جو معیشت و معاشرت اور تعلیم وسیاست میں مذہب کی دخل اندازی قطعاً برداشت نہیں کرتا۔ یہ اسلام کی دعوت کو ایک مکمل نظام حیات کی صورت میں کبھی گوراہ نہیں کرے گا۔ دعوت دین کی وجہ سے جس کے مفاد اور عقائد ونظریات پر بھی زد پڑے گا وہ مخالفت کرے گا۔ اس لیے دعوت کے رستہ پر گامزن اہل ایمان کا صبر واستقلال کا پیکر ہونا بہت ہی ضروری ہے۔ یہ صبر جمیل مستقل ہونا چاہیے اور اللہ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے۔ دعوت وتبلیغ پیغمبرانہ عظیم مشن ہے۔ اس پر گامزن اہل ایمان کو صبر واستقامت کا کوہ گراں چاہیے۔ داعیان کرام کو مخالفین کے ظلم و ستم پر رب کی رضا کی خاطر بے مثل صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکام ہمارے سامنے ہیں مگر ہماری ان کی طرف توجہ نہیں ہے، جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات شب وروز ہم سنتے ہیں مگر ہمارے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ کتاب اللہ کے فیصلوں سے انحراف کرنے والوں پر ہم دنیا میں رسوائی اور ذلت مسلط کر دیتے ہیں، ہماری صورتحال آج کل یہی ہے کہ ہم نے شریعت پر عملدرآمد سے انکار کیا، قرآن وسنت کی بالادستی سے منہ موڑا، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام وقوانین سے اعراض کیا، تو ہر طرف سے ہم پر ذلت اور رسوائی مسلط ہے اور عزت ووقار کا کوئی راستہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہا۔ آج بھی اگر ہم اللہ کے در پر جھک جائیں، جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات وتعلیمات کے سامنے جھک جائیں، اور شریعت اسلامیہ کے سامنے سرنڈر ہو جائیں، تو ساری صورتحال بدل سکتی ہے، اس دلدل سے نجات مل سکتی ہے، اور ہم قومی طور پر عزت ووقار کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے اجتماعی طور پر توبہ واستغفار کی ضرورت ہے، ملی حمیت وغیرت کو جگانے کی ضرورت ہے، اور عوامی سطح پر بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

”اور ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے“

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ
عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

موت کو کثرت سے یاد کرو

كُلُّ نَفْسٍ	ہر ایک نفس	ذَآىِٕقَةُ	چکھنے والا ہے
الْمَوْتِ	موت کو	وَاِنَّمَا	اور بلاشبہ
تُوَفَّوْنَ	پورے پورے ملیں گے	اُجُوْرَكُمْ	تمہارے اجر
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن	فَمَنْ	پھر جو
زُحْزِحَ	دور کر دیا گیا	عَنِ النَّارِ	آگ سے
وَاُدْخِلَ	اور داخل کر دیا گیا	الْجَنَّةَ	جنت میں
فَقَدْ فَازَ	تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا	وَمَا	اور نہیں ہے
الْحَيٰوةُ	زندگی	الدُّنْيَآ	دنیا کی
اِلَّا	مگر	مَتَاعُ الْغُرُوْرِ	سامان دھوکے کا۔

فرمایا كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ ہر ایک نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے، کوئی ذی روح

موت سے نہیں بچ سکتا۔ یہ قطعی اور یقینی بات ہے اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ جس طرح نبی اور اس کے ماننے والے موت سے ہم کنار ہوں گے، اسی طرح ان کے مخالفین کو بھی یہی گھاٹی لازما عبور کرنا ہوگی۔ یہ زندگی ختم ہو جائے گی اور سب کو نئی زندگی داخل ہو کر رب العزت کی بارگاہ میں پیش ہونا ہوگا۔ یہ قرآنی حقیقت ہے کہ ہر جاندار کو ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے، اور سب نے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہ زندگی کا اٹل قانون ہے جس سے مفر نہیں۔

موت ایک مسلّمہ حقیقت

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس دارِفانی میں انسان کی زندگی بہت مختصر اور اس کے مال و اسباب سے لطف اندوزی محض ایک مقررہ مدت تک کے لیے ہے۔ اسے ایک نہ ایک دن موت سے دو چار ہونا، یعنی اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ اللہ رب العزت نے اولین انسان حضرت آدمؑ وحضرت حوا علیہما السلام کو زمین پر اتارتے ہی یہ اٹل حقیقت ان کے سامنے واضح کر دی تھی اور گویا ان کے واسطے سے پوری بنی نوع انسان کو اس سے باخبر کر دیا تھا۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۳۶ (البقرۃ ۲:۳۶) اور تمھارے لیے زمین میں ٹھکانا اور (یہاں کے) متاع سے نفع اٹھانا ہے ایک خاص مدت تک کے لیے۔ حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اس آیت کی تشریح میں یہ رقم فرمایا ہے: ''یعنی آدم وحوّا علیہما السلام کو یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور ایک میعاد معین تک کام چلانا ہے، یعنی زمین پر جا کر دوام نہ ملے گا، کچھ مدت کے بعد یہ گھر چھوڑنا ہوگا'' یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ انسان کو روزانہ نیند کی صورت میں موت یاد دلائی جاتی ہے۔ رات میں سونے کو اس پہلو سے موت سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس حالت میں اللہ رب العزت کے حکم سے انسان کے ہوش وحواس، فہم وادراک عارضی طور پر معطل کر دیے جاتے ہیں اور ظاہری طور پر اس پر موت طاری کر دی جاتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے بعض علما نے نیند کے

لیےوفاتِ صغریٰ اور موت کے لیےوفاتِ کبریٰ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

اس میں کسی شبہے کی گنجایش نہیں کہ موت کی یاد انسان کوغفلت سے بیدار کرتی ہے اور آخرت کی تیاری کی زبردست تحریک پیدا کرتی ہے۔موت کی یاد انسان کو فخر و مباہات، تکبر و غرور اور عیش و عشرت سے بھری زندگی سے دور رکھتی ہے اور اس کے اندر یہ احساس بیدار کرتی ہے کہ آخر کار اس دارِفانی سے کوچ کرتے ہوئے سب کچھ (آل و اولاد، مال و دولت، ساز و سامان، عہدہ و منصب) چھوڑ کر جانا ہے تو ان فانی چیزوں پر فخر و غرور اور اترانے کے کیا معنی؟ دنیا کے لوگوں اور دنیا کے ساز و سامان پر بھروسا کس کام کا ہے؟ موت کی یاد کی اہمیت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے محض یاد کرنے کی نہیں، بلکہ کثرت سے یاد کرنے کی ہدایت دی ہے اور اسے دنیا کی لذّات کو ختم کرنے والی، یعنی ان کے غلط اثرات سے انسان کو محفوظ رکھنے والی شے سے تعبیر کیا ہے۔ارشادِ نبوی ﷺ ہے: اَکْثِرُوْا ذِکْرَھَا ذِمِ اللذَّاتِ یَعْنِی الْمَوْتِ لذتوں کو ختم کرنے والی، یعنی موت کو کثرت سے یاد کرو۔

زندگی کس قدر عارضی اور بے اعتباری ہے یا یہ کہ یہ دنیا کس قدر ناقدر شناس اور بے فیض ہے۔ اس بارے میں بہت کم لوگ سوچتے ہیں اور شاید اس لئے بھی نہیں سوچتے کہ زندگی اور موت دونوں انتہائی گنجلک عنوان ہیں؟ زندگی، جو کھنکتی اور بجتی مٹی سے بنے ہوئے انسانوں کو خوبصورت روشنیوں، رنگینیوں اور دلچسپیوں اور خوشیوں میں لپیٹ کر پل پل موت کی طرف لئے چل رہی ہے اور انہیں اپنے اندھے جادو میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ وہ ساری زندگی صرف زندگی ہی کی باتیں کرتا ہے، لمبے لمبے منصوبے گھڑتا ہے، مال و عیال کے جال میں پھنسا ہوا ہے اور اسے اب تک یہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملی کہ موت کا ذائقہ چکھنے کیلئے چند لمحوں کو ذرا مر کر دیکھوں۔انسان یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے زندگی سے مختلف ذائقے کشید کرنے پر تل گیا ہے۔

موجودہ روحانی خلا اور ذہنی خلفشار کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ زندگی کے ساتھ ہمارا لین دین کھرا نہیں ہے ہم اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ زندگی کو شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر جانے میں یا انجانے میں، دانستہ یا نادانستہ طور پر جو کچھ ہم لمحہ بہ لمحہ دیتے رہتے ہیں یا اس سے جو سلوک کرتے ہیں وہ گو کہ ہماری یادداشت میں اپنی اصلی صورت میں محفوظ و موجود نہیں رہتا لیکن خود زندگی اسے ہرگز نہیں بھولتی، ایک مخصوص مدت کے بعد ہمیں انتہائی ایمانداری اور خلوص سے وہی کچھ لوٹانا شروع کر دیتی ہے جو کچھ ہم نے اسے دیا ہوتا ہے لیکن ان ثمرات کو جب ہم اپنے دامن میں دیکھتے ہیں تو بھونچکے رہ جاتے ہیں بلکہ چلا اٹھتے ہیں کہ نہیں نہیں زندگی اتنی بدصورت اور دردناک ہرگز نہیں ہو سکتی ہم نے تو اسے یہ سب کچھ نہیں دیا تھا یہ بدی، بدنیتی، حسد، جلن، گناہ، ذلت، اذیت رسانی یہ تمام برائیاں ہم نے کب اسے دی تھیں جن کے بدلے میں وہ ہم سے یہ ناروا سلوک رکھ رہی ہے تب تک اوپر حساب برابر ہو چکا ہوتا ہے۔ اے کاش ایمان کے نور سے خالی اور مان و گمان سے بھرے ہوئے انسان کو اس وقت سے پناہ مانگنی چاہیئے جب خدانخواستہ زندگی اس کا کیا دھرا اسے خود نہ لوٹائے بلکہ حساب کتاب کا چارج براہ راست رب العالمین سنبھال لیں اور قہر کی زبان میں اس سے پوچھیں کہ اب تک تم نے اس کی عطا کردہ زندگی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یا کیا سلوک کرنا چاہیئے تھا۔

جزائے عمل ایک اٹل حقیقت

وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اور پھر فیصلے کے دن تمہیں تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اس میں نہ کمی ہوگی اور نہ کسی پر ظلم کیا جائے گا۔ ہر شخص کو اس کے کیے کا پھل مل جائے گا۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جیسا انسان کا اپنا وجود۔ جس طرح انسان کے اپنے جسم کے موجود ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی طرح جزائے عمل بھی لاریب واقع ہو کر رہے گی فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ پس جو شخص دوزخ سے دور کر دیا گیا

اور جنت میں داخل کر دیا گیا، وہ کامیاب ہوگیا یہی ایسی کامیابی ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی بڑی بڑی دولت، سرمایہ اور اقتدار سب ہیچ ہیں۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان دوزخ سے بچ کر جنت کا داخلہ حاصل کر لے جو ہمیشہ کے لیے خدا تعالیٰ کی رحمت کا مقام ہے۔ جو وہاں پہنچ گیا۔ وہ حظیرۃ القدس کا ممبر بن گیا اور اسی کے لیے فلاح و کامیابی ہے۔ دنیا دھوکہ محض ہے: فرمایا فَازَ ؕ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ اور دنیا کی زندگی محض دھوکے کا سامان ہے۔ شیطان بہت بڑا دھوکے باز ہے اس نے لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ آدمی اس دنیا کے کاموں میں مگن ہو کر اس کو مستقل ٹھکانا سمجھنے لگتا ہے اور آخرت کے انجام سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر لوگ حقیقت سے بے بہرہ ہو کر دین حق کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں اور پھر بد اعمالی اور بدعقیدگی کا ذخیرہ جمع کر کے آخرت میں نامراد و ناکام ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے فرمایا کہ دنیا دھوکے کا سامان ہے اس سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

اس آیت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اس تصور کا رد ہے کہ موت گناہ اور پاپ کی سزا ہے، اگر ایسا ہوتا تو جنتیوں کو دنیا میں موت سے گذارا نہ جاتا، انبیاء کو موت آئی ہے، عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح کو سولی پر چڑھا دیا گیا، اگر موت گناہ کی سزا ہوتی تو ایسی برگزیدہ ہستیوں کو کیوں کر موت آتی؟ اسلامی تعلیمات کے مطابق کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک مخصوص حکمت کے تحت، ایک متعین مدّت تک کے لیے اپنا کام کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں موت کو ''اَجَل'' سے تعبیر فرمایا ہے، اس کے معنی ہیں، کسی چیز کا مقررہ وقت، جو کسی قیمت پر نہ ٹلے'' یعنی دنیا کی ساری آسائشیں سُراب سے زیادہ نہیں ہیں، یہ سب کی سب عارضی اور بے ثبات ہیں۔ یعنی دنیا میں کسی پر نعمتوں کی بارش ہونا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ حق پر ہے اور اللہ کے ہاں مقبول بندہ ہے۔ اسی طرح کسی کا مصائب و مشکلات میں مبتلا ہونا بھی اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ اللہ اس سے ناراض ہے یا وہ باطل پر ہے۔ بلکہ بسا اوقات

اخری نتائج ان کے برعکس ہوتے ہیں۔لہٰذا کسی کو اس دھوکہ میں نہ رہنا چاہیئے اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی عارضی بہار اور ظاہری زیب وزینت میں اتنی کشش ہے اور اتنی پر فریب ہے۔جس میں مگن ہو کر انسان بسا اوقات آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اور غافل رہتا ہے۔تا آنکہ جب موت آجاتی ہے تب اس کی آنکھیں کھلتی ہیں کہ مجھے دنیا میں رہ کر کرنا کیا چاہیئے تھے اور میں کرتا کیا رہا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دنیا میں اس طرح رہو، جیسے تم ایک (راہ چلتے) مسافر ہو یا کسی منزل کے راہی‘‘۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہا کرتے تھے: جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو اور بیماری سے پہلے صحت کو غنیمت سمجھو اور موت سے پہلے زندگی کو غنیمت سمجھو‘‘(صحیح بخاری) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دنیا آخرت کی کھیتی ہے (یعنی دنیا میں ایمان وعمل کی جو فصل کاشت کرو گے، آخرت میں اسی کا پھل ملے گا)‘‘(احیاءعلوم الدین) اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ دنیا ہر شخص کے لئے دارالامتحان ہے۔ اس کی زندگی عیش وعشرت میں گزر رہی ہو یا تنگی ترشی میں، وہ خود صحت مند ہو یا بیمار ہو، عالم ہو یا نادان۔ غرضیکہ انسان کی کوئی بھی حالت ہو وہ امتحانی دور سے گزر رہا ہے۔اس امتحانی دور یا امتحانی پرچے کا آخری وقت اس کی موت ہے۔موت کے ساتھ ہی اسے یہ از خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ اس امتحان میں کامیاب رہا ہے یا ناکام؟ ساتھ ہی اس کی کامیابی اور ناکامی کے اس پر اثرات مرتب ہونا شروع ہو جائیں گے۔اور آخرت میں اسے اس کے اعمال کے مطابق اچھا یا برا بدلہ مل کے رہے گا۔اس لحاظ سے دنیا اور اس کی زندگی بلکہ اس کا ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی ہے۔اور ہر شخص کو اپنی زندگی کے لمحات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

پوری زندگی کا لائحہ عمل

اس آیت میں پوری زندگی کا لائحہ عمل، نظریہ اور فلسفہ زندگی سمجھایا گیا ہے کہ زندگی کی اصل حقیقت موت ہے جو ہر کسی کو آنی ہے اور اصل کامیابی زندگی کی کامیابی نہیں بلکہ آخرت کی کامیابی ہے. یہ دنیا

کی بھاگ دوڑ، مال و دولت، اولاد، حیثیت، ناموری اور سرداری، یہ سب امتحان کا حصہ ہیں. زیادہ مال یا زیادہ اولاد ہونا کامیابی کی دلیل نہیں لہٰذا اگر کوئی ان چیزوں کی بہتات کو اصلی اور آخری کامیابی سمجھے تو سخت دھوکے میں ہے. دنیا میں مصائب میں مبتلا ہونا بھی یہ بات ثابت نہیں کرتا کہ کوئی شخص باطل پر ہے کیونکہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے، نہ کہ دنیا کی. لہٰذا ایک مسلمان کی نظر اس کامیابی کو حاصل کرنے پر ہونی چاہیے. اور محدود وقتی اور فانی کامیابی کو اپنا مقصود بنانا درحقیقت اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے. اور دنیا، جو کہ کلمہ ادنیٰ سے ماخوذ ہے، اس کی کامیابی کے پیچھے پوری زندگی گزار دینا ایک احمق کا وتیرہ تو ہوسکتا ہے، ایک مومن کی شان نہیں. ان آیات سے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ یہ تسلی بھی دے رہے ہیں کہ دین کی راہ میں چلنے سے جو مشکلات درپیش ہیں، وہ وقتی ہیں اور ان کے لئیے آخرت میں لافانی اجر تیار کیا گیا ہے۔ ان آیات سے یہ تسلی ملتی ہے کہ دنیا میں جیسی مرضی تکلیفوں، مشکلات اور ناکامیوں سے انسان دوچار ہو، بالآخر اس کا اور ہر دوسرے شخص کا خاتمہ موت پر ہی ہونا ہے، کتنا ہی بڑا اور طاقتور کیوں نہ ہو۔ اور پھر جس عدالت میں حاضری ہوگی، تو وہ یقیناً ہماری ان مشکلات کا مداوا کرے گا اور ہمارے صبر کا پھل دائمی کامیابی کی صورت میں عطا فرمائے گا ان شاء اللہ!

یہودی علما کی ایک اور خرابی عوام سے علم چھپانا

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ قف وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ
قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا ط وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ
عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ
وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ ز فَنَبَذُوْہُ وَرَآءَ ظُہُوْرِہِمْ وَاشْتَرَوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ط فَبِئْسَ مَا
یَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

جان اور مال کی آزمائش اللہ کا قانون

لَتُبْلَوُنَّ	البتہ تم ضرور آزمائے جاؤ گے	فِیْٓ اَمْوَالِکُمْ	اپنے مالوں میں
وَاَنْفُسِکُمْ	اور اپنی جانوں (میں)	وَلَتَسْمَعُنَّ	اور تم ضرور سنو گے
مِنَ الَّذِیْنَ	اُن لوگوں سے جن کو	اُوْتُوا الْکِتٰبَ	دی گئی کتاب
مِنْ قَبْلِکُمْ	تم سے پہلے	وَمِنَ الَّذِیْنَ	اور اُن لوگوں سے جنہوں نے
اَشْرَکُوْٓا	شرک کیا	اَذًی	ایذا (دینے والی باتیں)
کَثِیْرًا	بہت سی	وَاِنْ	اور اگر
تَصْبِرُوْا	تم صبر کرو	وَتَتَّقُوْا	اور تقویٰ اختیار کرو

فَاِنَّ ذٰلِكَ	تو بلا شبہ یہ	مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ	ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

فرمایا: لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (مسلمانو)! تمہیں اپنے اموال اور اپنی 185
جانوں میں آزمائش پیش آکے رہے گی۔ یہ خطاب نبی ﷺ اور عام مسلمانوں سے ہے کہ آئندہ بھی جان و مال میں تمہاری آزمائش ہوگی اور تمہیں ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنا ہوں گی، جیسے اموال کا تلف ہو جانا اور بیمار پڑ جانا وغیرہ۔ جب بھی مالی یا جانی نقصان ہوتا ہے، اہل ایمان کے لیے آزمائش ہوتی ہے۔ کہ اس تکلیف پر وہ کہاں تک ثابت قدم رہتا ہے۔ سورہ انبیاء میں آتا ہے وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ہم خیر و شر دونوں طریقوں سے آزماتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس دنیا کو دار الابتلاء کہا جاتا ہے اس دنیا کو کوئی مستقل گھر نہ سمجھ بیٹھے، وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ نیز تمہیں ان لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے تھے نیز مشرکین سے بھی بہت سی تکلیف دہ باتیں سننا ہوں گی۔ اہل کتاب اور مشرکین کی زبانوں سے تمہیں انتہائی دل آزار اور جگر خراش طعن و تشنیع، بے ہودہ گفتگو اور جھوٹے الزامات سننا پڑیں گے، جیسا کہ منافقین نے ہر طرح ستایا۔ ایسی تکلیف دہ باتیں وہ پہلے بھی کرتے آئے ہیں اور آئندہ بھی باز نہیں آئیں گے۔ لہٰذا اہل ایمان کو اس کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ مشرکین کے متعلق تو مکی سورتوں میں آپ جگہ جگہ پڑھتے ہیں کہ وہ قرآن پاک، پیغمبر خدا اور اہل ایمان کے متعلق کس قسم کی زبان استعمال کرتے تھے۔ اس وقت سے لے کر یہ اذیت ناک سلسلہ آج تک جاری ہے۔ مشرکین کو دنیا میں جہاں کہیں غلبہ حاصل ہوتا ہے یا انہیں موقع ملتا ہے۔ وہ اہل ایمان کو ذلیل کرنے سے باز نہیں آتے۔ باقی رہے اہل کتاب تو ان کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ ہجرت کے وقت مدینہ کے گرد و نواح میں جو یہودی آباد تھے انہوں نے اہل اسلام کے متعلق کیا کیا شوشے چھوڑے، اور نئے نئے مسلمانوں پر کس کس طرح عرصہ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی۔ کعب بن اشرف یہودیوں کا دولت مند تاجر اور سردار تھا۔ وہ بدبخت شعر بھی کہتا تھا۔ اور اپنے اشعار میں حضور ﷺ کی ہجو بیان کرتا تھا۔ (هَجْو لغوی معنی مذمت کرنا، کسی کی برائی بیان کرنا، بدگوئی

یا غیبت کرنا، اردو اور عربی ادب میں ہجو ایسی نظم یا شعر کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص، حریف یا معاشرے کے کسی عیب کو طنز، ظرافت، مضحکہ خیز پیرائے یا برے الفاظ میں بیان کیا گیا ہو) اور یہ بد بخت اور بد باطن گندی ذہنیت کا مالک ایسے قبیح اشعار سر عام پڑھنے کی دوسروں کو بھی ترغیب دیتا تھا۔ یہ لعین اپنے شعروں میں مسلمان پاکدامن اور باعصمت عورتوں کے ساتھ اپنے عشق و محبت کا اظہار کرتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ چیز نہایت ہی تکلیف دہ تھی۔ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مشرکین کی ذلت ناک شکست کے بعد یہ شخص مکہ گیا اور اہل مکہ کو مسلمانوں کے خلاف حملہ کرنے پر اکسایا وہ کہا کرتا تھا۔ کہ مسلمانوں کے دین کی نسبت مشرکین کا دین بہتر ہے۔ اس شخص نے معاہدہ کی خلاف ورزی بھی کی تھی، آخر حضور ﷺ کے حکم سے مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ بعض دوسرے یہودی بھی نبی کریم ﷺ کے جانی دشمن بن گئے۔ چنانچہ خیبر کے یہودیوں نے کھانے میں زہر ملا کر حضور ﷺ کو شہید کرنیکی ناکام کوشش کی۔ بعض دیگر سازشیں بھی کیں، جو آج تک جاری ہیں۔ وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے ہو تو بلا شبہ یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے۔ یہ انتباہ کر کے مسلمانوں کو اسلام کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کے لیے آمادہ کیا جا رہا ہے اور آزمائش کے فوائد پہلے بتلائے جا چکے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ابتلاء سے صبر و استقامت کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ اخلاقی کمزوریوں کا علاج ہوتا ہے۔ درجات بلند ہوتے ہیں اور مومنوں اور منافقوں میں امتیاز ہو جاتا ہے یعنی ان کا علاج یہ ہے کہ تم صبر، یعنی ثابت قدمی اور استقلال سے کام لو اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اپنے دلوں میں رکھو۔ اگر صبر اور تقویٰ سے ان آزمائشوں کا مقابلہ کرو گے تو یہ نہایت ہمت، حوصلہ اور اولو العزمی کا کام ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام علیہم الرضوان ہمیشہ صبر اور تقویٰ سے کام لیتے رہے، حتیٰ کہ حالت جنگ میں بھی نہ ان کی طرح بدزبانی سے کام لیا اور نہ عملاً اس طرح زیادتی کی جس طرح انھوں نے کی تھی۔ مسلمانوں نے اہل کفر سے جان و مال کی کیا کچھ تکلیفیں نہ اٹھائی ہیں، اور اہل کتاب اور مشرکین کی کیسی کیسی باتیں برداشت نہیں کی ہیں، یہ گویا ان ہی واقعات کی پیشین گوئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ کبھی بھی مسلمانوں

کے صبر کا پیمانہ لبریز نہیں ہونا چاہیئے اور نہ تقویٰ کا دامن ہاتھوں سے چھوٹنا چاہیئے۔فرمایا اگر تم صبر کرو گے اور تقوے کا دامن پکڑو گے فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ تو یہ مقصودی امور ہیں، یعنی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ایں از کارہائے مقصود است۔یہ چیزیں ایسے کاموں میں سے ہیں کہ جن پر پختہ عزم ہونا چاہیئے۔ایک مسلمان کے لیے لازم ہے۔کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام وفرامین بدل وجان قبول کرے۔فرمایا صبر اور تقوی انہی عزم بالجزم امور میں سے ہیں۔

علم کو چھپانے والوں کا انجام

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ	اور جب لیا اللہ نے	مِيْثَاقَ	عہد
الَّذِيْنَ	وہ لوگ جنہیں	اُوْتُوا الْكِتٰبَ	کتاب دی گئی
لَتُبَيِّنُنَّهٗ	البتہ اسے ضرور بیان کر دینا	لِلنَّاسِ	لوگوں کے لیے
وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ	اور نہ چھپانا اسے	فَنَبَذُوْهُ	تو انہوں نے اسے پھینک دیا
وَرَآءَ	پیچھے	ظُهُوْرِهِمْ	اپنی پیٹھوں کے
وَاشْتَرَوْا بِهٖ	اور خرید لیا اس کے بدلے	ثَمَنًا	قیمت
قَلِيْلًا	تھوڑی سی	فَبِئْسَ	چنانچہ برا ہے (وہ)
مَا	جو	يَشْتَرُوْنَ	وہ خریدتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اے پیغمبر (علیہ السلام)! اس بات کو اپنے دھیان میں لاؤ جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے پختہ عہد لیا۔میثاق وثق کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی پختہ عہد کرنے کا ہوتا ہے۔ایسا عہد جس کی پابندی نہایت ضروری ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اس عہد کا ذکر فرمایا ہے جس میں ان کو دی گئی کتاب کے متعلق فرمایا تھا لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ کہ تم اسے لوگوں کے سامنے ظاہر کرو گے۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں پر ہٗ کی ضمیر کتاب کی طرف لوٹتی ہے اور معنی یہ ہوتا ہے۔کہ تم اس کتاب کو ضرور

ظاہر کرو گے، بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ہٗ کی ضمیر میثاق کی طرف بھی راجع ہوسکتی ہے۔ کہ تم لوگوں کے سامنے اس عہد کا واضح اعلان کرو گے کہ ہم نے اللہ سے یہ پختہ وعدہ کیا ہے۔ بہر حال عہد یہ تھا کہ تم اللہ کے احکام لوگوں کے سامنے بلا کم و کاست واضح طور پر بیان کرو گے وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ اور اسے چھپاؤ گے نہیں یہ عہد تورات و انجیل دونوں کتابوں میں موجود تھا بلکہ موجودہ تحریف شدہ کتابوں میں اب بھی ایسی آیتیں موجود ہیں۔ جن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ جو کتاب میں نے تم کو دی ہے اس کو لوگوں کے سامنے علی الاعلان بیان کرنا، اس کے احکام کو ظاہر کرنا، جو چیز میں نے تمہیں اندھیرے میں دی ہے اسے تم روشنی میں لوگوں سے بیان کرنا۔ بعض مقامات پر آتا ہے کہ اس کے متعلق اپنی اولادوں کو بتلانا۔ انجیل میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اس کتاب کا اعلان کوٹھوں اور مکانوں پر کرنا اور منادی کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بتلائی ہے اور اس کو چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔ مگر اس پختہ عہد کے باوجود اللہ نے فرمایا فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ انہوں نے اس کتاب کو یا عہد کو پس پشت ڈال دیا۔ دوسری جگہ پر ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور پھر یہ بھی کہ کتاب میں جو چیزیں ان کے مفاد میں تھیں انہیں ظاہر کر دیا اور باقی باتوں کو چھپا دیا۔ قرآن پاک کی شہادت کے مطابق جن چیزوں کو انہوں نے چھپا دیا وہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق پیشن گوئیاں تھیں جو اللہ نے تورات و انجیل میں بیان فرمائی تھیں۔ سورہ اعراف میں موجود ہے کہ یہ لوگ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے۔ حالانکہ یہ وہ نبی ہیں۔ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ جن کا ذکر ان کی تورات و انجیل میں لکھا ہوا موجود ہے۔ سورہ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۔ یہ اللہ کی کتاب کو اسی طرح پہچانتے ہیں۔ جیسے اپنی اولادوں کو پہچانتے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ یہ وہی کتاب اور وہی پیغمبر ہے جس کی خوشخبری ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ مگر یہ لوگوں کے سامنے اسے ظاہر نہیں کرتے بلکہ چھپا جاتے ہیں۔ فرمایا اہل کتاب نے عہد شکنی کی اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ط اور کتاب اللہ کے

بدلے میں دنیا کا حقیر مال خریدا۔ چند ٹکوں کی خاطر دین حق کو بیچ ڈالا۔ اور حقیقت کے بدلے گمراہی مول لی۔ توحید کی جگہ بدعات اور شرکیہ افعال کو رائج کیا۔ سحر، جادو گنڈے اور تعویذ کے ذریعے دنیا کا حقیر مال اکٹھا کیا۔ اللہ کا فرمان ہے۔ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ۔ دنیا کا سارا مال بھی قلیل ہے۔ آخرت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں، ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سمندر میں سوئی ڈبو کر نکال لے سوئی کے ذریعہ وہ کتنا پانی حاصل کرلے گا۔ فرمایا آخرت کی نسبت پوری دنیا ایک سوئی کے برابر ہے۔ اگر کوئی شخص پوری دنیا کا مال ومتاع بھی سمیٹ کر رکھ لے تو کتنے روز اس کے پاس رہے گا۔ آخری امت کی تو عمر ہی تھوڑی ہے۔ پہلی امتوں کے لوگ چار چار پان پانچ سو سال تک بھی عمریں پاتے تھے۔ مگر وہ بھی دنیا کا مال دنیا ہی میں چھوڑ کر چلے گئے۔ لہذا اس دنیا کے بڑے سے بڑے مال کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، وہ ہمہ وقت دنیا کے حقیر مال کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا، ہر امت کا کوئی نہ کوئی فتنہ ہوتا ہے۔ اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔ لوگ اسی کے پیچھے دوڑتے رہیں گے۔ صحیحین کی روایت میں آتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھے اپنی امت پر فقر و ناداری آنے کا ڈر نہیں بلکہ خوف یہ ہے۔

أَنْ تُبْسَطَ الدُّنْيَا عَلَيْكُمْ تم پر دنیا پھیلا دی جائیگی وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ اور یہ تمہیں اسی طرح تباہ کردے گی جس طرح پہلے لوگوں کو کیا۔ اسی لیے فرمایا کہ جن لوگوں نے دنیا خریدی فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ﴿۱۸۷﴾ بہت بری چیز ہے جو انہوں نے خریدی۔ ایمان کو برباد کر کے دنیا کا حقیر مال خریدا انہوں نے نہایت ہی گھاٹے کا سودا کیا۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علمِ دین کو چھپانا گناہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ''جس شخص سے کچھ دریافت کیا گیا جس کو وہ جانتا ہے اور اس نے اس کو چھپایا روزِ قیامت اسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ (ترمذی، کتاب العلم، باب ما جاء فی کتمان العلم، ۴/ ۲۹۵، الحدیث: ۲۶۵۸) علمائے امت پر واجب ہے کہ اپنے علم سے فائدہ پہنچائیں اور حق ظاہر

کریں اور کسی غرض فاسد کے لئے اس میں سے کچھ نہ چھپائیں۔اس آیت میں ضمناً عام مسلمان علماء کو بھی یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ حق بات کو جانتے بوجھتے ہوئے چھپانے کے جرم کا ارتکاب نہ کریں۔

علم کا بنیادی مقصد انسانیت کے فائدے اور نفع کے لیے بہتر نظام بنانا ہوتا ہے۔خاص طور پر علمِ الٰہی، جو انبیا علیہم السلام پر اس لیے نازل ہوتا ہے، تاکہ انسانیت عدل وانصاف پر قائم ہوجائے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ‘‘ (57الحدید:25) ایسے علم کو چھپانا انسانیت کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنا ہے۔اس لیے احادیثِ نبویہؐ میں کتمانِ علم پر بڑی سخت وعید بیان کی گئی ہے۔علم چھپانا بہت بڑا جرم ہے۔یہ انسانیت کی ترقی میں مجرمانہ کردار کا حامل ہے۔اس لیے قرآن حکیم نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان آیات میں علم اور عقل کے نام پر وجود میں آنے والی جاہلیت کا پردہ چاک کیا ہے۔علم کے فروغ اور پھیلاؤ کے ذریعے عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔

عصرِ حاضر میں حدیث کی تطبیق، آج علم چھپانے کی نئی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں، سچ جانتے ہوئے ”نیوٹرل“ بن جانا، حق بات کو ”غیر مقبول“ کہہ کر دبانا، دین کو صرف نجی معاملہ قرار دے کر رہنمائی سے گریز کرنا۔سوشل میڈیا پر غلط بات دیکھ کر خاموش رہنا، حالانکہ اصلاح کی قدرت ہو، یہ سب علمی امانت کے منافی ہے۔توازن کی بات: یہ حدیث ہمیں دو انتہاؤں سے بچاتی ہے: ہر بات ہر جگہ کہہ دینا۔حق جانتے ہوئے مکمل خاموشی اختیار کرنا۔علم اللہ کی طرف سے نور ہے، اور نور کو چھپانا اندھیرا پھیلانا ہے۔جو علم کو ذاتی جاگیر بنالے، وہ قیامت کے دن جواب دہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں: علم سیکھنے، اس پر عمل کرنے، اور حکمت کے ساتھ اسے پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

ریاکاری اور نام ونمود عبادات اور نیک اعمال کی بربادی کا سبب

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا
تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾

خود پسندی اور حب جاہ کی مذمت

لَا تَحْسَبَنَّ	آپ ہرگز گمان نہ کریں	الَّذِيْنَ	اُن لوگوں کو جو
يَفْرَحُوْنَ	خوش ہوتے ہیں	بِمَآ	اس کے ساتھ جو
اَتَوْا	انہوں نے (کرتوت) کئے	وَّيُحِبُّوْنَ	اور وہ چاہتے ہیں
اَنْ	یہ کہ	يُّحْمَدُوْا	ان کی تعریف کی جائے
بِمَا	اس کے ساتھ جو	لَمْ يَفْعَلُوْا	نہیں کیا انہوں نے
فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ	پھر ہرگز نہ سمجھیں آپ ان کیلئے	بِمَفَازَةٍ	نجات پا جانا
مِّنَ الْعَذَابِ	عذاب سے	وَلَهُمْ	اور ان کیلئے ہے

عَذَابٌ	عذاب	اَلِيْمٌ	دردناک۔

ارشاد ہوتا ہے لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا نہ گمان کریں آپ ان لوگوں کے بارے میں جو اس چیز پر خوش ہوتے ہیں جو انہوں نے کی وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا اور چاہتے ہیں کہ ان کی ان باتوں پر تعریف کی جائے جو انہوں نے نہیں کیں۔ فرمایا ایسے لوگوں کے متعلق فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ آپ یہ مت گمان کریں کہ وہ عذاب سے چھوٹ جائیں گے۔ یہاں پر تَحْسَبَنَّ اور يَحْسَبَنَّ دونوں قرائتیں منقول ہیں۔ تحسبن مخاطب کا صیغہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر (علیہ السلام)! یا دیگر مخاطبین۔ ظاہر ہے کہ اول مخاطب تو نبی (علیہ السلام) کی ذات مبارکہ ہے اور اس کے بعد صحابہ کرام علیہم الرضوان اور پھر دیگر اہل ایمان یعنی آپ ان لوگوں کے متعلق گمان نہ کریں جو اپنے کیے پر خوش ہوتے ہیں اور ناکردہ پر تعریف چاہتے ہیں۔ اور اگر اسے يَحْسَبَنَّ پڑھا جائے، تو یہ غائب کا صیغہ ہے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنے کیے پر خوش ہوتے ہیں اور ناکردہ پر مدح چاہتے ہیں، وہ یہ گمان نہ کریں کہ عذاب سے بچ جائیں گے۔ اب رہا یہ سوال کہ انہوں نے کیا کیا اور کیا نہ کیا۔ جو کچھ اہل کتاب اور منافقین نے کیا وہ تو یہ ہے کہ حق بات کو چھپایا اور اس کے بدلے میں دنیا کا حقیر مال وصول کیا۔ ہر قسم کی برائی، دھوکہ اور فریب کیا، اور اس پر بھی خوش ہو رہے ہیں۔ کہ ہم نے بہت بڑا معرکہ مار لیا ہے۔ اور جو کام نہیں کیا وہ نیکی کا کام ہے حق بات کو ظاہر نہیں کیا۔ حضور ﷺ اور قرآن پاک کے متعلق پیشین گوئیوں کو ظاہر نہیں کیا۔ اور چاہتے یہ ہیں کہ ان کے ناکردہ کاموں پر بھی لوگ ان کی تعریف کریں کہ یہ بہت اچھے دیندار آدمی ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ محض ان کی خام خیالی ہے اس قسم کی ہوشیاری اور چالاکی کر کے وہ عذاب الٰہی سے نہیں بچ سکتے۔ انہیں اپنے کیے دھرے کا حساب دینا ہوگا۔ منافقین کا بھی یہی حال ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے نفاق کا کسی کو علم نہیں، ہمیں کوئی گرفت نہیں کر سکتا، لہٰذا توقع رکھتے ہیں کہ لوگ ہمیں نیک سیرت اور عابد و زاہد سمجھ کر ہماری تعریف کریں۔ اللہ نے فرمایا:

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ ایسے لوگوں کے لیے اللہ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اہل ایمان کی خدا خوفی

اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے متعلق سورہ مومنون میں فرمایا: وَالَّذِيۡنَ يُؤۡتُوۡنَ مَاۤ اٰتَوۡا وَّقُلُوۡبُهُمۡ وَجِلَةٌ کہ وہ نیکی کا کام کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اَنَّهُمۡ اِلٰى رَبِّهِمۡ رٰجِعُوۡنَ کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ نامعلوم ہماری نیکیوں میں کتنی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ چنانچہ بزرگان دین کا مقولہ ہے کہ بعض نیک آدمی نماز پڑھ کر بھی اس قدر گھبراجاتے ہیں جیسے کوئی چوری کر کے نکلتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نامعلوم اس فرض میں کس قدر کوتاہی اور غلطی واقع ہوئی ہے۔ کہیں اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہو جائے۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نیکی کرنے کے بعد انسان کو اللہ تعالیٰ سے بہتر اجر کی توقع رکھنی چاہیئے اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے نیکی کی توفیق بخشی۔ اور ساتھ ڈرتے بھی رہنا چاہیئے۔ کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو، اسی طرح روزہ رکھ کر بھی دل میں خوف رہنا چاہیئے۔ کہ یہ قبولیت کے قابل بھی ہوا ہے یا نہیں۔

لفظ رَجاءِ کا معنی اور مفہوم

اسی لیے تو فرمایا اَلۡاِيۡمَانُ بَيۡنَ الۡخَوۡفِ وَالرَّجَاءِ اس کا مفہوم یہ ہے کہ سچا ایمان خوفِ خدا اور امیدِ رحمت کے درمیان کی کیفیت کا نام ہے۔ یعنی ایمان خوف اور امید کے درمیان پایا جاتا ہے۔ عربی میں رَجاءِ کے ایک سے زیادہ معانی اور مفاہیم بھی ملتے ہیں لیکن یہاں اس کے لیے لفظ رَجاءِ کا معنی اور مفہوم اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ کی رحمت اور بخشش کی اُمید جو کبھی یقین کی کیفیت تک جا پہنچتی ہے۔ رجاءِ کا متضاد خوف ہے، جس کا معنی اور مفہوم تقریباً ہر کسی کے علم میں ہے کہ کسی چیز یا شخصیت کی طرف سے کسی نقصان، دکھ، پریشانی، تکلیف وغیرہ کے ملنے کا اندیشہ جو کبھی یقین کی حد تک جا پہنچتا ہے۔ رجاءِ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت اور بخشش کی اُمید، یا اُن دونوں، یا دونوں میں سے کسی ایک کے ملنے کا یقین، مُسلمانوں میں پائی جانی والی جانی پہچانی کیفیات ہیں۔ اور اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب کا خوف بھی سب کے لیے جانی پہچانی کیفیت ہے۔

سچے اور درست اِیمان والا اللہ کی رحمت اور بخشش کی اُمید، یا ان کے ملنے کا یقین، اور اللہ کی

ناراضگی اور عذاب کے خوف کی کیفیات کے درمیان ہی رہتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت میں اُس کا قُرب حاصل کرنے کی کوشش میں اُس کی عِبادت کرتا رہتا ہے۔صحیح ایمان کا تقاضا یہ ہے۔ کہ انسان اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھی ڈرتا رہے اور اس کے ساتھ امید کا دامن بھی وابستہ رکھے۔اللہ نے فرمایا ہے کہ ہمارے نبی بھی ۔ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے ہیں۔اور ہمارے سامنے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔

ریاکاری ایک معاشرتی برائی

اپنی تعریف کرانے کی بیماری یہودیوں سے نکل کر اہل اسلام تک بھی پہنچ چکی ہے اللہ والے تو نیکی کرنے کے بعد بھی اپنی تعریف نہیں چاہتے مگر آج کا ہر چھوٹا بڑا اسی چکر میں پڑا ہوا ہے کہ کسی طرح اخبار میں نام آجائے فوٹو چھپ جائے تو بہت بڑا مقصد پورا ہو جائے گا اور جب سے سوشل میڈیا کا سکہ چلنے لگا ہے ہر ایک اس دوڑ میں کہ میری فالونگ زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔حکومت کے کارپردازان خصوصاً صدر،وزیر اعظم،وزرائے اعلی اور دیگر وزراء حضرات اپنی ہر کردہ اور ناکردہ پر تعریف سننا چاہتے ہیں۔یہ تو صریحاً ریاکاری ہے۔اور اچھے کام پر بھی پانی پھیرنے کے مترادف ہے، لہٰذا اگر اللہ نے کسی کو نیکی کی توفیق عطا کی ہے۔تو اسے شہرت کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے بلکہ حتی الامکان اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔موجودہ دور میں ہر شخص اپنی ظاہری حالت بہتر بنانے میں مگن ہے اور کسی کو باطن کی فکر ہی نہیں ہے۔ایک وقت تھا جب لوگ ظاہری طور پر بالکل سادہ مگر اندر سے علم وعمل کا سمندر ہوتے تھے مگر آج کل کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔آج معاشرے کا ہر شخص ظاہر بینی میں دوسروں پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ عبادات، جو کہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں، ان میں بھی ریاکاری اور دکھاوے کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔کئی لوگ عبادتیں اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ انہیں نمازی، حاجی اور پرہیزگار کہیں۔

البتہ ایک چیز ہے۔نیک کام کر کے اگر مومن کے دل میں خوشی پیدا ہو۔تو یہ طبعی امر ہے۔اس میں کوئی حرج نہیں۔حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ روزہ دار کو دو وقت خوشی حاصل ہوتی ہے۔ایک خوشی

اسے افطاری کے وقت حاصل ہوتی ہے۔کہ اس کی ذمہ داری پوری ہوئی اور دوسری خوشی اس وقت حاصل ہوگی۔جب قیامت کے دن اللہ روزے کا اجر عطا فرمائیں گے۔ یہ طبعی خوشی ہے اور جائز ہے۔ ہاں اگر خوشی اس وجہ سے ہے کہ لوگ اسے روزہ دار کہیں یا نمازی اور پرہیز گار تصور کریں، تو یہ خطرناک بیماری ہے۔ یہ چیز ریاکاری کہلاتی ہے اور نفاق کی تعریف میں بھی آتی ہے۔ایسے شخص کو آخرت میں سخت ترین عذاب سے سابقہ پڑے گا۔

بہرحال اس آیت میں خود پسندی کرنے والوں کے لئے وعید ہے اور ان کے لئے جو حب ِجاہ یعنی عزت، تعریف، شہرت کے حصول کی تمنا میں مبتلا ہیں۔جب کسی شخص کے دل میں یہ آرزو پیدا ہونے لگے کہ لوگ اس کے شیدائی ہوں، ہر زبان اس کی تعریف میں تر ہو، سب میرے کمال کے مُعترف ہوں، مجھے ہر جگہ عزت سے نوازا جائے، عالم نہیں ہوں پھر بھی علامہ صاحب کہا جائے، ملک و قوم کی کوئی خدمت نہیں کی پھر بھی معمارِ قوم کہا جائے، نجات دہندہ سمجھا جائے، محسن قوم قرار دیا جائے، میرا تعارف بہترین القابات کے ساتھ ہو، ملاقات پرتپاک انداز میں کی جائے، سلام جھک کر کیا جائے تو اسے چاہئے کہ اپنے دل پر غور کرلے کہ کہیں وہ حبّ جاہ کا شکار تو نہیں ہوچکا، اگر ایسا ہو تو اس آیت سے سبق حاصل کرتے ہوئے فوراً سے پیشتر اُس سے چھٹکارے کی کوشش کرے۔ یاد رکھئے خود پسندی اور حب جاہ کے مرض میں مبتلا شخص اخروی انعامات سے محرومی کا شکار ہوتا ہے اور دل میں مُنافقت کی زیادتی، قلبی نورانیت سے محرومی، دین کی خرابی میں مبتلا ہوجاتا ہے نیز برائی سے منع کرنے اور نیکی کی دعوت دینے سے محرومی، ذلت و رسوائی کا سامنا، اخروی لذت سے محرومی، قلبی سکون کی بربادی اور دولتِ اخلاص سے محرومی جیسے نقصانات کا سامنا کرسکتا ہے، لہٰذا اسے چاہئے کہ دنیا کی بے ثباتی، تعریف پسندی کی مذمت، منصب و مرتبہ کے تعلق سے اخروی معاملات اور بزرگان دین کے حالات و اقوال کا بکثرت مطالعہ کرے تاکہ ان مذموم امراض سے نجات کی کوئی صورت ہو۔

حضرت جندب رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنۡہُ سے روایت ہے، نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ’’جو شہرت طلب کرے گا (قیامت کے دن) اس کے عیبوں کی تشہیر ہوگی اور جو شخص

لوگوں کو دکھانے کے لئے عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس کا بدلہ دے گا۔(بخاری، کتاب الرقاق، باب الریاء والسمعۃ، ۴ / ۲۴۷، الحدیث: ۶۴۹۹) حضرت کعب بن مالک رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ’’دو بھوکے بھیڑئیے بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے جائیں تو وہ اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا مال اور مرتبے کی حرص کرنے والا اپنے دین کے لئے نقصان دِہ ہے۔(ترمذی، کتاب الزہد، ۴۳-باب، ۴ / ۱۶۶، الحدیث: ۲۳۸۳) ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہا سے روایت ہے، حضورِ اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ’’اگر خود پسندی انسانی شکل میں ہوتی تو وہ سب سے بدصورت انسان ہوتی۔(الفردوس بماثور الخطاب، باب اللام، ۲ / ۱۹۳، الحدیث: ۵۰۶۴) حضرت حسن بن علی رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے مروی ہے، نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ’’خود پسندی 70 سال کے عمل کو برباد کر دیتی ہے۔(کنز العمال، کتاب الاخلاق، قسم الاقوال، حرف العین، ۲ / ۲۰۵، الجزء الثالث، الحدیث: ۷۶۶۶) حضرت ابو بکر صدیق رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ خود پسندی سے بہت زیادہ ڈرتے تھے اور جب لوگ آپ کی تعریف کرتے تو آپ دعا مانگتے: یا اللہ! عَزَّ وَجَلَّ، مجھے اس سے بہتر بنا دے جو کچھ یہ کہتے ہیں اور جو کچھ یہ نہیں جانتے میرا وہ عمل بخش دے۔حضرت محمد بن واسع رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ اپنے زمانے کے عبادت گزاروں سے فرماتے تھے: تم پر افسوس ہے، تمہارے اعمال کم ہونے کے باوجود ان میں خود پسندی داخل ہوگئی اور تم سے پہلے لوگ اپنے اعمال کی کثرت کے باوجود ان پر تکبر نہیں کرتے تھے۔اللہ کی قسم! پہلے لوگوں کی عبادت کو دیکھا جائے تو (اس کے مقابلے میں) تم محض کھیلنے والے ہو۔(تنبیہ المغترین، الباب الرابع فی جملۃ اخری من الاخلاق، ومن اخلاقہم عدم العجب۔۔۔الخ، ص ۲۴۲)

مقصد یہ کہ جس طرح یہود اپنے ہر کردہ کام پر خوش ہوتے تھے اور نا کردہ پر تعریف چاہتے تھے، آج اہل اسلام بھی اسی بیماری میں مبتلا ہو چکے ہیں۔الا ماشاء اللہ اللہ تعالیٰ صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائے۔آمین۔یعنی جو شخص بھی ایسی شہرت پسند کرتا ہو کہ فلاں آدمی بڑا مخلص، دیانتدار،

ایثار پیشہ خادم خلق اور عالم دین ہے یا ان میں سے کسی بھی صفت کی شہرت چاہتا ہو جبکہ حقیقت میں معاملہ ایسا نہ ہو یا کسی نے اچھے کام میں محنت تو تھوڑی ہی کی مگر شہرت اور ناموری اس سے بہت زیادہ چاہتا تو اس کا وہی حشر ہوگا جو اس آیت میں مذکور ہے۔ یہ لوگ اپنے برے اعمال کی سزا سے ہرگز بچ نہیں سکتے ان کی پکڑ ضرور ہوگی اور ان کو غلط اعمال کا بدلہ ضرور ملے گا۔

حقیقی اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکت کو حاصل ہے

وَلِلّٰهِ	اور اللہ ہی کیلیے	مُلْكُ	بادشاہی
السَّمٰوٰتِ	آسمانوں	وَالْاَرْضِ	اور زمین کی
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	اور اللہ ہر چیز پر	قَدِيْرٌ	خوب قادر ہے۔

فرمایا یاد رکھو! وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط آسمان و زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ جب حقیقی اقتدار اعلیٰ اس مالک الملک کے پاس ہے۔ تو پھر کتمانِ حق کرنے والے مجرمین۔ مخلوق خدا کو ہدایت کی بجائے گمراہی کے راستے پر چلانے والے، جھوٹی تعریف پر خوش ہونے والے اور ریاکار لوگ اللہ کی سزا سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ وہ تو ایک دن پکڑے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ دنیا میں لوگ جس مال کی خاطر دھوکہ کرتے تھے، غلط بیانی کرتے تھے، اس پر بھی ان کا قبضہ نہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کی ملکیت میں ہے۔ وہ جب چاہے کسی کو عطا کر دے اور جب چاہے واپس لے لے۔ اس کے سامنے سب حقیر اور بے بس ہیں۔ دنیا کی یہ چند روزہ بادشاہت اسی مالک کی عطا کردہ ہے اور انسانوں کے پاس امانت ہے۔ انہیں اس کا حساب دینا ہوگا۔ فرمایا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ اللہ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔ ہر قسم کی بادشاہی اسی کی ہے۔ سزا و جزا پر بھی وہ قادر ہے۔ لہذا جھوٹے، مکار، اور کتمان حق کرنے والے لوگوں کو مالک الملک کی گرفت کا انتظار کرنا چاہئے۔ اور صاحب بصیرت لوگوں کو اللہ کی طرف سے بہتر جزا کی امید رکھنی چاہیے۔ وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ اللہ جل جلالہ سے دعا ہے کہ وہ ہم تمام مسلمانوں کو نیکی کی ہدایت دے، اپنے راستوں پر چلنے کی توفیق دے اور عذاب جہنم سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

ذکر اللہ کی فضیلت، اقسام، آداب اور فوائد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

اُولِی الْاَلْبَابِ کے لیے غور وفکر

اِنَّ فِیْ خَلْقِ	بیشک پیدائش میں	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں
وَالْاَرْضِ	اور زمین کی	وَاخْتِلَافِ	اور بدل بدل کر آنا جانا
الَّیْلِ	رات	وَالنَّهَارِ	اور دن کے
لَاٰیٰتٍ	البتہ نشانیاں ہیں	لِّاُولِی الْاَلْبَابِ	عقل مندوں کے لیے۔

فرمایا: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ اور شب و روز کے اختلاف یعنی آگے پیچھے آنے میں لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ البتہ عقلمند کے لیے نشانیاں ہیں۔ "الْاَلْبَابِ" یہ "لُبّ" کی جمع ہے، جس کا معنی خالص عقل ہے، اس لیے ترجمہ "عقلوں والوں" کیا ہے۔ یعنی جو لوگ زمین و آسمان کی تخلیق

اور کائنات کے دیگر اسرار و رموز پر غور کرتے ہیں، انھیں کائنات کے خالق اور اس کے اصل فرماں روا کی پہچان ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اتنی طویل و عریض کائنات کا یہ لگا بندھا نظام، جس میں ذرا خلل واقع نہیں ہوتا، یقیناً اس کے پیچھے ایک ذات ہے جو اسے چلا رہی ہے اور وہ ہے اللہ کی ذات۔ اس میں عقلوں والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اکیلے مالک ہونے کی، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کاریگری کی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حاکمیت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ نظام فلکی اور اس کی تفصیلات، چاند سورج، ستاروں کی تعداد، ان کے درمیانی فاصلے، ان کے باہمی تعلقات و تاثرات، ان کی گردشوں کی پیمائش، گرہن کے اسباب و اوقات، ان کے طلوع و غروب اور نور و حرارت وغیرہ کے قاعدے وضابطے، غرض اس قسم کی تفصیلات سے علم ہیئت کی کتابوں کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ رہی زمین تو اس کی شکل و صورت، اس کی پیمائش، اس کے پہاڑ اور سمندر، اس کی معدنیات، اس کی کشش، اس کی ہواؤں اور موسموں کے تغیرات وغیرہ کے لیے تو کوئی ایک فن بھی پوری طرح کافی نہ ہوا، بلکہ جغرافیہ، جغرافیہ طبعی، جیالوجی، فزیالوجی، میٹرالوجی اور آرکیالوجی، اللہ جانے کتنے فنون پر فنون نکلتے چلے آرہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی کاریگری کے اندازے اور تخمینے ختم ہونے میں نہیں آرہے، زمین و آسمان کی تخلیق اور اس کو ایک نظام کا پابند رکھنا، قوتِ کشش کے ذریعہ زمین میں تھامنے کی صلاحیت اور اسی نظام کشش کے تحت سیاروں کے درمیان ہمیشہ مناسب فاصلہ کا برقرار رہنا، سورج کی گردش کا نظام، جس سے دن و رات کی آمد و رفت متعلق ہے، دن اور رات کے اوقات میں ایک متعین نظام کے مطابق کبھی اضافہ اور کبھی کمی، پھر زمین کے سینہ میں ہزاروں معدنیات کی موجودگی اور زمین کی فضاء میں آلودگی کو جذب کرنے کی ان دیکھی صلاحیت اور نہ جانے قدرت خداوندی کے کیا کیا کرشمے ہیں، جن سے سائنس دانوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور جوں جوں کائنات کی مخفی حقیقتوں سے پردہ اٹھتا جاتا ہے، لگتا ہے کہ ابھی تحقیق کا روز اول ہے، یہ ساری چیزیں خدا کے وجود، اس کی بے پناہ قدرت و حکمت اور اس کی توحید کی کھلی نشانیاں ہیں؛ بشرطیکہ انسان عقل و خرد سے کام لے۔ اب "لِّاُولِي الْاَلْبَابِ" کے بجائے غیر مسلم قومیں ان

چیزوں پر غور میں مصروف ہیں اور چونکہ ان کا ہدف ہی دنیا ہے، اس لیے دنیا کے بیشمار فائدے حاصل کر رہے ہیں، بلکہ انہی فنون کے ذریعے سے انھوں نے مسلمانوں کو مغلوب کر رکھا ہے، ہدف کی غلطی کی وجہ سے انھیں ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کو سمجھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ کاش! مسلمان ان فنون میں پوری طرح حصہ لیتے تو یہ سارے علوم دین کی سربلندی اور توحید کی دعوت کا زبردست ذریعہ بنتے اور دنیا پر غلبے کے کام آتے، کیونکہ مسلمان تو (رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ) کا ہدف سامنے رکھتا ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس آیت سے آخر سورت تک آیات کی بڑی فضیلت ہے۔ رسول اللہ ﷺ رات کو تہجد کے لیے اٹھتے تو ان آیات کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ (بخاری)

غرضیکہ عقلمند انسان جب زمین و آسمان کی پیدائش، سورج اور چاند کی گردش اور سیاروں کے احوال، دن رات کی آمد و رفت کے مضبوط اور مربوط نظام میں غور کرتا ہے کہ کس طرح سب سیارے ایک معین رفتار اور معین قانون کے تحت فضاؤں میں گردش کر رہے ہیں اور ان کے اس انضباط میں کبھی لمحہ بھر کا بھی فرق نہیں پڑتا تو اسے یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ تمام تر کارخانہ کائنات ایک ہی قادر مطلق اور مختار کل فرمانروا کے ہاتھ میں ہو سکتا ہے۔ جس نے اپنی عظیم قدرت و اختیار سے کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو اپنی اپنی حدود میں جکڑ رکھا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ حدود سے تجاوز کر سکے۔ اگر اس عظیم الشان کارگاہ کا ایک پرزہ یا کوئی کارندہ اس مالک الملک کی قدرت و تصرف سے باہر ہوتا تو کارخانہ عالم کا یہ مربوط اور مستحکم نظام ہر گز قائم نہ رہ سکتا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے سوال کے جواب میں اپنی الوہیت اور ملکیت کے متعلق دلائل پیش فرمائے ہیں، دلائل عقلی اور نقلی دونوں قسم کے ہو سکتے ہیں تاہم یہاں پر عقلی دلائل کا تذکرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا نام کائنات کی روح ہے

اَلَّذِيْنَ	جو لوگ	يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ	یاد کرتے ہیں اللہ کو
قِيٰمًا	کھڑے	وَّقُعُوْدًا	اور بیٹھے

وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ	اور اپنے پہلوؤں پر	وَيَتَفَكَّرُوْنَ	اور وہ غور وفکر کرتے ہیں
فِيْ خَلْقِ	پیدائش میں	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں
وَالْاَرْضِ	اور زمین کی	رَبَّنَا	(اور کہتے ہیں) اے ہمارے رب
مَا خَلَقْتَ	نہیں تونے پیدا کیا	هٰذَا	یہ
بَاطِلًا	بے فائدہ	سُبْحٰنَكَ	تو پاک ہے
فَقِنَا	تو ہمیں بچالے	عَذَابَ النَّارِ	آگ کے عذاب سے۔

فرمایا عقلمند وہ لوگ ہیں الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔اللہ کے نام کی بڑی عظمت ہے۔جب تک ایک اللہ کا بندہ بھی ایسا رہے گا جو صرف اللہ کا نام لے گا، اللہ پاک اپنے نام کی برکت سے اس دنیا کے نظام کو چلائے گا، اور جب وہ "اللہ، اللہ" کہنے والا واحد بندہ بھی دنیا سے رخصت ہو جائے گا تو پھر اللہ پاک اس دنیا کے نظام کو لپیٹ لیں گے کہ اب میرا نام لینے والا کوئی نہیں رہا، اب یہ دنیا بے مقصد ہو چکی ہے، بے فائدہ ہو چکی ہے۔سو اللہ کے نام کی بڑی قیمت ہے، بڑا وزن ہے، اس لیے کہ اللہ بڑے ہیں، اللہ کا نام بھی بڑا ہے، تو اللہ کا نام عظمت سے لینا چاہیے۔ذکرُ اللہ افضل ترین اعمال اور بہترین عبادات میں سے ہے۔بلکہ اعمالِ صالحہ کی روح ذکرِ الٰہی ہے، کیونکہ جو عمل ذکرِ اللہ سے خالی ہو وہ اس جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو۔قرآنِ مجید کی آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ نبویہ میں ذکر کی اہمیت، قدر و منزلت، فضیلت اور اس کے فوائد وثمرات کو مختلف انداز سے واضح کیا گیا ہے: کہیں ذکر اور ذکر کرنے والوں کے اجر وثواب کا تذکرہ کرکے رغبت دلائی گئی، کہیں کثرتِ ذکر کا حکم دیا گیا، اور کہیں ذکر سے غفلت اختیار کرنے سے منع کیا گیا۔اللہ رب العزت نے اپنے ذکر کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا ہے۔چنانچہ فرمایا: وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ (العنکبوت 29:45) اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ عبادات میں سب سے افضل عبادت ہے، کیونکہ تمام عبادات کا مقصد بھی ذکر اللہ ہی ہے۔یوں ذکر اللہ تمام عبادات کی جان اور روح ہے۔ذکرِ عام سے مراد وہ ذکر ہے جس میں ساری عبادات شامل ہو جاتی ہیں، مثلاً: نماز، روزہ، حج، تلاوتِ قرآن، دعا،

تسبیحات وغیرہ۔شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مطابق: اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والا اور اس کے قریب کرنے والا ہر لفظ اللہ کا ذکر ہے، چاہے وہ علم کا حصول ہو، تعلیم ہو، امر بالمعروف ہو یا نہی عن المنکر ہو۔اور شیخ عبد الرحمن السعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "ذکر اللہ" کہا جائے تو اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو اللہ کے قریب کر دے، چاہے وہ عقیدے سے متعلق ہو یا سوچ و فکر سے، دل کا عمل ہو یا بدن کا۔اللہ تعالیٰ کی تعریف ہو یا علمِ نافع کا حصول یہ سب ذکرِ الٰہی ہی کی صورتیں ہیں۔لہٰذا یہ سمجھنا درست نہیں کہ ذکر صرف تسبیحات تک محدود ہے۔درحقیقت ہر وہ عمل جو قرآن و حدیث کے مطابق ہو اور اللہ کی رضا کیلئے کیا جائے، وہ ذکر میں شامل ہے۔

ذکرِ خاص سے مراد وہ مخصوص دعائیں اور اذکار ہیں جن کے الفاظ اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوں، اور جن کے اوقات اور تعداد بھی متعین ہوں، مثلاً: فرض نمازوں کے بعد کے مسنون اذکار، صبح و شام کے اذکار، اور مختلف مواقع کی خاص دعائیں۔ذکر: زبان، دل اور دونوں کے ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ذکر تین طرح ہوتا ہے: صرف زبان کے ساتھ، صرف دل کے ساتھ، ※ زبان اور دل دونوں کے ساتھ (یہ سب سے افضل ہے) سب سے افضل اور سب سے زیادہ نفع بخش ذکر وہ ہے جو زبان اور دل دونوں کے ساتھ ہو، یعنی زبان ذکر ادا کرے اور دل اس کے معانی میں غور و فکر کرے۔مثلاً: "سبحان اللہ" کہتے ہوئے زبان حرکت کرے اور دل میں یہ یقین تازہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔"الحمد للہ" کہتے ہوئے زبان بھی ہو اور دل میں شکر و تشکر کے جذبات پیدا ہوں۔"اللہ اکبر" کہتے ہوئے دل میں اللہ کی عظمت اور بڑائی کا تصور قائم ہو۔"لا إلہ إلا اللہ" پڑھتے ہوئے دل میں توحید کا اقرار زندہ ہو۔اس کے بعد بقول ابن القیم رحمہ اللہ وہ ذکر ہے جو صرف دل کے ساتھ ہو، جیسے اللہ کی نعمتوں کو یاد کرنا، اوامر و نواہی میں تدبر، قدرت کی نشانیوں پر غور، اور عظمتِ الٰہی کا استحضار۔اور تیسرے درجے پر وہ ذکر ہے جو صرف زبان پر ہو مگر دل و دماغ اس کا ساتھ نہ دیں۔ذکرِ الٰہی کی فضیلت و اہمیت جان لینے کے بعد اگلی بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کثرت سے ذکر کرنے کا صریح حکم دیا ہے۔یہ ذکر صرف چند لمحات یا

مخصوص اوقات تک محدود نہیں، بلکہ مومن کی زندگی کے ہر لمحے میں جاری رہنے والا عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسے اہلِ عقل کی علامت قرار دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنتِ مبارکہ سے اس کی عملی شکل واضح فرمائی۔ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی میں ذکرِ الٰہی کو مرکزی حیثیت دے۔ صبح وشام کے اذکار، فرض نمازوں کے بعد کے اذکار، تسبیحات، استغفار، تلاوتِ قرآن اور مجالس ذکر، یہ سب مومن کی روحانی زندگی کی بنیادیں ہیں۔ جو شخص اللہ کو یاد رکھتا ہے اللہ اسے یاد رکھتا ہے، اور یہی حقیقی کامیابی ہے۔

وَّقِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ کھڑے ہوں یا بیٹھے ہو یا اپنی کروٹوں کے بل لیٹے ہوں ہر حالت میں اپنے خالق ومالک کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اور اس یاد آوری میں آگے ان کی دعاؤں کا ذکر بھی آرہا ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں کس قسم کی التجا کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی فکر کیسی صحیح ہے، اور ان کے عقائد کیسے پختہ ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی عقلمند پہچانے جاتے ہیں، یہی ان کی علامت ہے جو لوگ بزرگان دین سے تربیت حاصل کرتے ہیں، وہ بزرگان دین انہیں قلبی ذکر بھی سکھلا دیتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کا دل ہمیشہ بیدار رہتا ہے اور ذکر الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔ ان کا کوئی سانس ذکر سے خالی نہیں ہوتا حتیٰ کہ ان کے لطائف باطنی بھی ذکر کرنے لگتے ہیں۔ یہ چیزیں ایسے لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ جو سلوک کی منازل طے کرتے ہیں۔ اور مرشدان برحق کا یہ طریقہ ہے کہ وہ ہر طالب کی تربیت اس کی صلاحیت کے مطابق کرتے ہیں۔ غرضیکہ کوئی وقت اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہونا چاہیئے، جس قدر کثرت سے ذکر کرے گا، اسی قدر فلاح حاصل ہوگی۔ فرمایا کہ ان کی پہلی صفت تو یہ ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور دوسری صفت یہ یہ بیان فرمائی وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ کہ وہ آسمان وزمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں۔ اس غور وفکر کے نتیجے میں انسان اللہ تعالیٰ کی، وحدانیت اور اس کی صفات کمال کو سمجھ سکے گا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آسمان وزمین اور دیگر مصنوعاتِ الٰہی میں غور وفکر وہی کامیاب سمجھا جائے گا جس کا نتیجہ خدا تعالیٰ کی یاد اور آخرت کی طرف توجہ ہو۔ حضرت حسن بصری کی

روایت میں آتا ہے کہ تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً ۔ یعنی ساٹھ سال کی عبادت کی نسبت ایک گھڑی بھر کا غور وفکر زیادہ قیمتی ہے ۔ اگر کسی نے غور وفکر کے بعد اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لی تو یہ چیز سال ہا سال کی عبادت بلا معرفت سے بدرجہا بہتر ہوگی ۔

مصنوعات قدرت میں غور وفکر

فرمایا صاحب عقل وہ لوگ ہیں جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور مصنوعات قدرت میں غور وفکر کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب چیزیں بیکار نہیں پیدا کیں ۔ ان اشیا کی تخلیق میں ضرور کوئی حکمت ہے ۔ اور دنیا کی حکمت آخرت ہے ۔ اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ ۔ فرمایا دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۔ یہ اگلی منزل کا راستہ ہے ۔ اس راستے پر چل کر انسان آخرت میں پہنچ سکتا ہے ۔ اس دنیا میں جو کچھ کمائی کرے گا ۔ اسے آخرت میں پالے گا ۔ مقصد یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق بیکار محض یا کوئی کھیل تماشہ نہیں ، بلکہ اس کی کوئی غرض وغایت ہے اور وہ ہے آخرت ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے عرض کی گئی ہے سُبْحٰنَكَ اے مولا! تیری ذات پاک ہے تو تمام عیوب ، نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے ، اے اللہ! ہم تیری تسبیح اور پاکیزگی بیان کرتے ہیں فَتَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے ۔ نہ کوئی عبادت میں شریک ہے ۔ نہ اختیار میں نہ مشکل کشائی میں ، نہ حاجت روائی میں ۔ اس میں عقیدہ کی اصلاح کا پورا مواد موجود ہے اگر عقیدہ درست نہیں ، خدا کی تنزیہ کا قائل نہیں تو ایسا شخص عقلمند نہیں ہو سکتا ، وہ بیوقوف ہوگا ۔ جب عقیدہ صاف ہو گیا اور قیامت کے دن پر یقین ہو گیا تو ایسے لوگ پھر اللہ کے حضور دعا کرتے ہیں فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ اے مولا کریم! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے ، عقلمندوں کی یہ پہلی دعا ہے جو غور وفکر کے نتیجے میں ان کے دل سے نکلی ہے ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں کثرت سے اپنا ذکر کرنے والوں میں شامل فرمائے ، غفلت سے محفوظ رکھے اور سنت کے مطابق ذکر کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین ۔

ذلت ورسوائی کے مارے لوگ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
رَبَّنَآ إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ
إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْإِيْمَانِ أَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا
ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى
رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

بہتر انجام اور دنیا و آخرت کی رسوائی سے بچنے کی دعا

رَبَّنَآ	اے ہمارے رب	إِنَّكَ	بلا شبہ تو
مَنْ	جس کو	تُدْخِلِ	داخل کرے گا
النَّارَ	آگ (میں)	فَقَدْ	تو یقیناً
أَخْزَيْتَهٗ	تو نے اس کو رسوا کر دیا	وَمَا	اور نہیں
لِلظّٰلِمِيْنَ	ظالموں کے لیے	مِنْ أَنْصَارٍ	کوئی مددگار۔(192)

فرمایا: رَبَّنَآ إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهٗ ؕ اے اللہ! جس کو تو نے دوزخ کی آگ میں ڈال دیا، تو نے اس کو رسوا کر دیا۔ کافروں کی رسوائی تو واضح ہے کیونکہ وہ ابدی جہنمی ہیں۔ تاہم بعض مومن بھی کچھ عرصہ کے لیے دوزخ میں جائیں گے اگرچہ ان کی یہ قید و بند دوامی نہیں ہوگی

بلکہ ان کے تزکیہ کے لیے ہوگا۔تا کہ گناہوں کی وجہ سے جو میل کچیل ان پر جم چکا ہے، اسے صاف کر کے اس شخص کو پاک مقام پر جانے کا اہل بنایا جاسکے گا۔تو بہر حال مفسرین کرام فرماتے ہیں۔کہ مومن جتنا عرصہ بھی دوزخ میں رہے گا، اتنا عرصہ تو رسوائی ضرور ہوگی۔اسی لیے بندہ عرض کرتا ہے۔کہ مولیٰ کریم! دوزخ سے بچالے کیونکہ وہ رسوائی کا مقام ہے اور پھر وہ یہ بھی جانتا ہے وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ جو شخص اپنے گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں چلا گیا، اس کے لیے وہاں کوئی مددگار نہیں ہوگا اس دنیا میں تو لوگ حیلے بہانے اور سفارشات کے ذریعے کسی نہ کسی طرح سزا سے بچ جاتے ہیں مگر وہاں پر چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہوگی، مقررہ سزا بہر حال بھگتنا ہوگی۔نبی کریم ﷺ نے آخرت کی رسوائی سے بچنے کیلئے دعا سکھائی اَللّٰهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ اے اللہ! ہمارے سارے کاموں کا انجام بہتر کر اور دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب ہمیں بچا اور ہماری حفاظت فرما۔(المعجم الکبیر للطبرانی، 2/33، قاھرۃ) اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک دعا سکھائی۔جس کو آپ رات دن مانگتے ہیں، یہ دعا بہت ہی عام ہے، ہر مسلمان تقریباً اس دعا کو مانگتا ہے: رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور حج کے زمانے میں بھی رکن یمانی سے حجر اسود تک کے درمیان میں یہ دعا مانگی جاتی ہے۔اس کا ترجمہ کیا ہے؟ اے ہمارے رب! ہم کو دنیا میں بھی بھلائی دیجیے اور آخرت میں بھی بھلائی دیجیے۔

حَسَنَةً کا معنی ومفہوم؟

جب آپ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ مانگیں تو میری گزارش آپ کو یاد آجائے کہ میں خدائے تعالیٰ سے کیا مانگ رہا ہوں اب سنیے: حسنۃ کیا چیز ہے اور کتنی نعمتیں اس حسنۃ میں داخل ہیں؟ اے خدا! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما لیکن دنیا کی بھلائی میں سے کیا کیا چیزیں ہیں اور یہ جو تفسیر عرض کر رہا ہوں یہ صحابہ کی بتائی ہوئی ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو عافیت سے رکھیں۔دنیا میں حسنہ کیا ہے کہ ہم کو عافیت سے رکھیں

اور عافیت کے کیا معنی ہیں کہ دنیاوی جسمانی مصیبت بھی نہ ہو اور کسی معصیت میں ابتلا بھی نہ ہو، پھر وہ عافیت میں ہے۔ کھا کھا کے موٹا مسٹنڈا ہو اور شان دار ایئر کنڈیشنڈ میں رہتا ہے، لیکن خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہے، یہ عافیت میں نہیں ہے، جو مصیبت میں بھی مبتلا نہ رہے اور معصیت میں بھی مبتلا نہ رہے اور اگر مصیبت میں مبتلا ہے، لیکن معصیت میں مبتلا نہیں ہے، یہ بھی عافیت میں ہے۔

ان آیات میں انسان اپنے رب سے دعائیں کرتا ہے جیسا کہ آیات میں واضح بیان کیا گیا ہے آخر میں انسان التجا کرتا ہے کہ تو وعدہ پورا کرنا کبھی بھول نہیں سکتا مگر ہمیں اتنا پکا پرہیز گار اور نیک مسلمان بنا دے کہ ہم بھی ان لوگوں میں شامل ہوسکیں جن سے تو نے وعدہ کیا ہے کہ قیامت کے دن ان کو رسوائی اور عذاب جہنم سے تو بچالے گا۔ آمین۔

مُنَادِيًا يُّنَادِيْ کا مفہوم اور تشریح

رَبَّنَآ	اے ہمارے رب	اِنَّنَا	بیشک ہم نے
سَمِعْنَا	سنا	مُنَادِيًا	ایک پکارنے والے کو
يُّنَادِيْ	وہ پکارتا ہے	لِلْاِيْمَانِ	ایمان کے لیے
اَنْ اٰمِنُوْا	یہ کہ تم ایمان لاؤ	بِرَبِّكُمْ	اپنے رب پر
فَاٰمَنَّا	چنانچہ ہم ایمان لائے	رَبَّنَا	اے ہمارے رب
فَاغْفِرْ لَنَا	لہذا تو بخش دے ہمارے لئے	ذُنُوْبَنَا	ہمارے گناہ
وَكَفِّرْ عَنَّا	اور دور کر دے ہم سے	سَيِّاٰتِنَا	ہماری برائیاں
وَتَوَفَّنَا	اور ہمیں موت دے	مَعَ الْاَبْرَارِ	نیک لوگوں کے ساتھ۔

مومن بارگاہ رب العزت میں عرض کرتا ہے۔ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ اے مولا کریم! بیشک ہم نے ایک منادی کرنے والے کی آواز کو سنا جو ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ منادی کرنے والا کون ہے۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اگر اس سے صامت یعنی خاموش منادی

کرنے والا مراد لیا جائے تو وہ قرآن پاک ہے۔اور اگر ناطق یعنی بولنے والا منادی ہو تو وہ پیغمبر (علیہ السلام) کی ذات مبارکہ ہے۔قرآن پاک بظاہر خاموش ہے۔مگر وہ زبان حال سے پکار پکار کر ایمان کی دعوت دے رہا ہے۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس وقت انسان صراط مستقیم پر قدم رکھتا ہے،تو کوئی شخص اس کو کہتا ہے۔اِسۡتَقِمۡ وَلَا تَعۡدُ۔یعنی سیدھے چلے جانا اور دائیں بائیں نہ مڑنا۔جب صراط مستقیم کا مسافر آگے کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔تو دائیں بائیں طرف موجود دیواروں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے پھر اوپر سے کوئی دوسرا شخص آواز دیتا ہے کہ بھائی پردہ نہ اٹھاؤ،ایسا کروگے تو غلط راستے پر چل پڑوگے جہاں سے واپس نہیں آسکوگے۔ فرمایا یہ صراط مستقیم اسلام کا راستہ ہے۔اور جو ہستی انسان کو اس پر سیدھا چلنے کی دعوت دیتی ہے،وہ قرآن پاک ہے۔اور جب کوئی شخص حرام یا ناجائز چیز کی طرف جاتا ہے تو گویا دیوار کا پردہ اٹھاتا ہے۔اس وقت جو شخص اسے ایسا کرنے سے منع کرتا ہے وہ انسان کا زندہ ضمیر ہوتا ہے۔وہ انسان کو جھنجھوڑ کر کہتا ہے۔کہ غلط راستے پر مت جاؤ۔مگر جب کوئی شخص گناہوں پر اصرار کرتا ہے تو اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے، جو آخر کار ایسے غلط کار کو منع کرنا بھی چھوڑ دیتا ہے اور مسلسل گناہوں کی وجہ سے انسان کے دل پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ كَلَّا بَلۡ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ۔فرمایا لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ جاتا ہے۔جس طرح نمی لگنے سے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔اسی طرح گناہوں کی وجہ سے لوگوں کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں۔

اگر اس منادی سے مراد ناطق منادی لیا جائے تو وہ نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔آپ ﷺ بلا واسطہ منادی ہیں،جنہوں نے ہر مقام پر براہ راست ایمان کی دعوت دی۔آپ ﷺ نے کوہ صفا پر ایمان کی دعوت دی۔کعبۃ اللہ کے پاس اعلان کیا۔طائف پہنچ کر اللہ کا پیغام پہنچایا۔گلیوں میں،بازاروں میں،میلوں میں اور منڈیوں میں آپ نے ہر جگہ یہی دعوت دی۔یَآ اَیُّهَا النَّاسُ قُوۡلُوۡا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفۡلِحُوۡا۔اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہہ دو،فلاح پا جاؤ گے۔یہ دعوت حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کے واسطے سے لوگوں تک آگے بھی پہنچائی۔یہ دعوت بالواسطہ ہو گئی۔صحابہ کے بعد

تابعین، تبع تابعین، بزرگانِ دین، عالمان دین، مفسرین اور مفکرین رحمۃ اللہ علیہم اس دعوت کو دوسروں تک پہنچا کر رسالت کا حق ادا کر رہے ہیں۔ بہر حال فرمایا کہ ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو بلند آواز سے پکار کر کہہ رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ۔ اس دعوت کے جواب میں ہم نے کہا فَاٰمَنَّا پس ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور عرض کرتے ہیں رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو معاف فرما دے۔ یہاں پر ذنوب کا لفظ ہے اور اس سے مراد بڑے بڑے گناہ ہیں، جن سے معافی کی درخواست کی جا رہی ہے وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا اور مٹا دے ہم سے ہماری چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں۔ یعنی بڑے چھوٹے سارے ہی گناہ معاف فرما دے۔ بلکہ ان کی بجائے ہمارے نامہ اعمال میں نیکیاں درج فرما دے، جیسا کہ اللہ نے بعض مقامات پر ارشاد فرمایا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ اللہ تعالیٰ ان کی کوتاہیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ہم بھی ایسی ہی درخواست کرتے ہیں۔ فرمایا، صاحب بصیرت لوگوں کی اگلی دعا یہ ہوتی ہے وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۳﴾ اے مولا کریم! ہمیں وفات بھی نیک لوگوں کے ساتھ دے۔ مرنے سے پہلے اور بعد نیک لوگوں کی رفاقت اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ سورہ نساء میں فرمایا کہ جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيۡقًا۔ اللہ کے انعام یافتہ لوگ منجملہ نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کے ساتھ ہوں گے، اور یہ بہت اچھی رفاقت ہے (جسے نصیب ہو جائے) یہ ایسی چیز ہے جس کے لیے انبیاء (علیہم السلام) بھی دعائیں مانگتے رہے۔ جیسے یوسف (علیہ السلام) نے دعا کی فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَنۡتَ وَلِيّٖ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ تَوَفَّنِىۡ مُسۡلِمًا وَّاَلۡحِقۡنِىۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ۔ مجھے اسلام پر موت دنیا اور صالحین کی رفاقت نصیب کرنا میرا انجام نیک لوگوں کے ساتھ ہو۔

یہاں پر ابرار کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ابرار کا معنی نیک، صالح اور فرمانبردار ہے۔ یہ لفظ ”بر“ کی جمع ہے، جس کا مفہوم نیکوکار اور پرہیزگار لوگ ہے۔ قرآن مجید میں نیک لوگوں اور اللہ کے مقرب

بندوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے جیسے اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۔ ایسے لوگ جو ہمیشہ نیکی پر توجہ رکھتے ہیں ۔نیکو کاروں کی صحبت یا اچھی سوسائٹی کی ضرورت اس زندگی میں بھی ہے، اچھے اور نیکی والے وہی لوگ ہوں گے جن کے ذہن اچھے اور جن کی تربیت اچھی ہوئی ہے ۔مقصود یہ ہونا چاہئے کہ ایمان والے تقوی والے، طہارت والے اور صداقت والے لوگوں کی سوسائٹی نصیب ہو، مگر آج ایسی مجلس کہاں ملے گی ۔ ہر طرف دھوکے، فریب، فراڈ، شرک اور بدعت کا زور ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اخلاق ہمیشہ ماحول سے سیکھا جاتا ہے ۔جب ہمارا ماحول ہی درست نہیں ہے ۔ہماری گلیوں اور بازاروں میں گالی گلوچ لہو ولعب، عیاشی اور فحاشی کا دور دورہ ہے ۔بچے گلیوں میں آوارہ پھر رہے ہیں ۔تو اچھی تربیت کیسے ہوگی اور اچھی سوسائٹی کہاں سے آئے گی ۔قرآن پاک کہتا ہے کہ مومن غافل نہیں ہوسکتا، وہ ماحول کو درست رکھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر ماحول خراب ہوگیا تو معاشرہ بگڑ جائے گا۔اور پھر آنے والی نسل کی درستگی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

عقلمند لوگوں کا منتہائے مقصود

رَبَّنَا	اے ہمارے رب	وَاٰتِنَا	اور تو ہمیں دے
مَا	(وہ) جس کا	وَعَدْتَّنَا	تو نے ہم سے وعدہ کیا
عَلٰى رُسُلِكَ	اپنے رسولوں کے ذریعے	وَلَا تُخْزِنَا	اور نہ ہمیں رسوا کرنا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن	اِنَّكَ	بلاشبہ تو
لَا تُخْلِفُ	نہیں خلاف ورزی کرتا	الْمِيْعَادَ	وعدے کی ۔(194)

فرمایا عقلمند لوگوں کی منتہائے مقصود یہ دعا ہوتی ہے رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ اے ہمارے پروردگار! ہمیں وہ کچھ عطا کر جو تو نے اپنے رسولوں کی زبان پر وعدہ کیا ہے اور وہ وعدہ یہ ہے ۔اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۔ہم اپنے رسولوں اور اہل ایمان کی دنیا میں بھی مدد فرمائیں گے، انہیں فتح ونصرت اور

غلبہ عطا کریں گے اور آخرت میں بھی جنت اور درجات عالیہ کا وعدہ ہے۔اللہ کی مخلوق میں غور وفکر کرنے والے اہل خرد یہ بھی عرض کرتے ہیں۔عقل نقصان سے محفوظ رکھتی ہے،اور مذموم قول وفعل سے روکتی ہے،اور نامناسب ٹامک ٹویاں مارنے سے بچاتی ہے،انسان کے پاس عقل سے بڑھ کر ہدایت پانے اور بری چیزوں سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔کسی بات کو فوراً سمجھ جانا عقلمندی کی علامت ہے،علم حاصل کرنے سے مزید عقلمندی آتی ہے،اور زندگی کے تجربات مزید نکھار پیدا کرتے ہیں،شریعت عقلمندی کا مجموعہ ہے،اور دین عقل کیلئے روشنی کا مرتبہ رکھتا ہے۔عقل شریعت پر ہی قائم رہے تو سیدھی رہتی ہے؛ جبکہ شریعت اور شرعی مقاصد عقل سے ہی سمجھے جاسکتے ہیں۔اے مولا کریم وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا ہمیں یقین ہے اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ بیشک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم فرماتے ہیں کہ منتہائے کار دو ہی باتیں ہیں اور وہ یہ کہ انسان آخرت میں کامیابی کے مقام پر یعنی جنت میں پہنچ جائے اور خدا کے غضب کے مقام دوزخ سے بچ جائے۔اور یہ مقصود حاصل کرنے کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔اول یہ کہ انسان ایمان،توحید اور اطاعت کو اختیار کرلے اور دوسرا یہ کہ انسان معاصی سے بچا رہے۔ بہرحال ان آیات میں انسان کو اس کی زندگی کا مقصد یہ بتلایا کہ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرے اور دنیا میں اس طرح زندگی گزارے جس سے اسے اخروی نجات حاصل ہوجائے۔ساتھ ہی ساتھ اسے یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ وہ محض اپنے نیک اعمال پر تکیہ نہ کرے بلکہ اپنے اللہ سے گناہوں کی بخشش بھی طلب کرتا رہے اور بھلائی کے لیے دعائیں بھی مانگتا رہے۔

مرد وزن کے قرآنی حدود اور اسلام کے نظامِ عفت کا اِجمالی خاکہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
فَاسْتَجَابَ لَھُمْ رَبُّھُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ
بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ
سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ
مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

مرد وزن کے اعمالِ صالحہ پر برابر کا اجر وثواب

فَاسْتَجَابَ	تو قبول کی (دعا)	لَھُمْ	ان کی
رَبُّھُمْ	ان کے رب نے	اَنِّیْ	یہ کہ میں
لَآ اُضِیْعُ	نہیں ضائع کرتا	عَمَلَ	عمل
عَامِلٍ	کسی عمل کرنے والے کا	مِّنْکُمْ	تم میں سے
مِّنْ ذَکَرٍ	مرد (ہو)	اَوْ اُنْثٰی	یا عورت
بَعْضُکُمْ	بعض تمہارا	مِّنْۢ بَعْضٍ	بعض سے ہے (یعنی تم ایک ہی ہو)
فَالَّذِیْنَ	چنانچہ وہ لوگ جنہوں نے	ھَاجَرُوْا	ہجرت کی
وَاُخْرِجُوْا	اور وہ نکال دیئے گئے	مِنْ دِیَارِھِمْ	اپنے گھروں سے

وَاُوْذُوْا	اور ستائے گئے	فِیْ سَبِیْلِیْ	میری راہ میں
وَقٰتَلُوْا	اور لڑے	وَقُتِلُوْا	اور مارے گئے
لَاُکَفِّرَنَّ	تو میں ضرور دور کروں گا	عَنْهُمْ	ان سے
سَیِّاٰتِهِمْ	ان کی برائیاں	وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ	اور یقیناً میں انہیں داخل کروں گا
جَنّٰتٍ	ایسے باغوں میں	تَجْرِیْ	(کہ) بہتی ہیں
مِنْ تَحْتِهَا	ان کے نیچے سے	الْاَنْهٰرُ	نہریں
ثَوَابًا	(بطور) ثواب کے	مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	اللہ کی طرف سے
وَاللّٰهُ	اور اللہ	عِنْدَهٗ	اسی کے پاس ہے
حُسْنُ	اچھا	الثَّوَابِ	ثواب۔(195)

ارشاد ہوتا ہے فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ان کی دعاؤں کو قبول کرلیا۔جب ان لوگوں نے غور وفکر کے نتیجے میں دعوت ایمان پر لبیک کہا، اللہ کا ذکر کیا اور اس کے سامنے گڑ گڑا کر دعائیں کیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا اور فرمایا اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بیشک میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔فرمایا جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت، میں اس کا عمل ضائع نہیں کرتا۔یہاں پر مرد وزن کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ جو بھی نیک عمل کرے گا، بدلہ پائے گا۔ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے۔کہ انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ حضور نیکی کے کاموں میں مردوں کا ذکر تو کثرت سے آتا ہے مگر عورتوں کا ذکر اس کثرت سے نہیں آتا۔ایک دوسری روایت کے مطابق بعض عورتیں حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا حضور! ﷺ بہت سے اعمال صرف مردوں کے لیے مخصوص ہیں جیسے، اذان، جہاد وغیرہ تو اس لحاظ سے مرد عورتوں سے اجر میں بڑھ گئے۔عورتوں کو تو بہت کم حصہ ملا۔نبی (علیہ السلام) نے فرمایا۔ایسا نہیں ہے۔بلکہ عورتوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ویسا ہی بدلہ ملے گا جیسا مردوں کو۔اللہ کے قانون میں

اس بارے میں کوئی تفریق نہیں۔ مرد وزن دونوں یکساں ہیں۔ البتہ ان کے عمل کی نوعیت مختلف ہے۔ مرد میدان جنگ میں جہاد کرتا ہے اور عورت اس کی خدمت کرتی ہے۔ تو دونوں کو برابر برابر ثواب ملے گا۔ بعض مشقت طلب کام ہیں جو صرف مردوں کے ذمہ ہیں اور بعض کام صرف عورتوں کے سپرد ہیں۔ اور بعض کام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، حسن سلوک حقوق العباد اور حقوق اللہ مرد و زن دونوں کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ لہذا جس طرح مردوں کو اجر ملے گا۔ اسی طرح عورتوں کو بھی ملے گا۔ بعض عورتوں نے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت طلب کی تو حضور ﷺ نے فرمایا۔ تمہارا حج ہی جہاد کے برابر ہے محرم کے ساتھ حج کرو، یہ تمہارے لیے کافی ہے غرضیکہ عورت اور مرد میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں ہوگا۔

مرد اور عورت کے اپنے اپنے دائرۂ عمل

مرد اور عورت گو، زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں لیکن دونوں کا دائرۂ عمل الگ الگ ہے۔ اس فرق کا اظہار دونوں کو ایک ہی نوع کے دو افراد بنانے کے باوجود مختلف انداز کا وجود عطا کرنے میں پوشیدہ ہے۔ ایک کے وجود کو نوعِ انسانی کی پیدائش میں اضافہ کرنے کے لیے خصوصی تربیت دی گئی ہے، اور دوسرے کے وجود کو جسمانی محنت و مشقت اور بیرونی معاشرتی تگ و دو کے لیے خصوصی بناوٹ دی گئی ہے۔ قدرت کے اس خصوصی انداز کو نہ ہم نظرانداز کر سکتے ہیں، نہ ہم بدل سکتے ہیں اور نہ عبث قرار دے کر کارخانۂ حیات میں تقسیمِ کار کے اصول کو نظرانداز کر سکتے ہیں۔ مرد و عورت کے لیے الگ نوعیت کے جسم کی بناوٹ اور ان کی فطرت میں الگ نوعیت کے رجحانات قدرت کی تخلیق کے مقصد کو بیان کرنے کے لیے بہت کافی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قدرت نے دونوں کے لیے الگ دائرۂ کار تجویز کیا ہے۔ اس جداگانہ دائرۂ کار کی تقسیم کو نظرانداز کر کے ہم قدرت کے انتظام کے خلاف دوسرے راستے اختیار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو قوی بنایا ہے اور اس کے ذمہ کام بھی مشقت طلب لگائے ہیں۔ اسی طرح عورت بحیثیت صنف نازک نسبتاً آسان کام کرنے کی اہل ہے۔ مرد محنت مزدوری کرتا ہے، مشقت کرتا ہے اور گزر اوقات کے لیے کما کر لاتا ہے۔ عورت اپنے گھر کی

چار دیواری میں بچوں کی پرورش اور دیگر امور خانہ داری کی ذمہ دار ہے اب فساد وہاں پیدا ہوتا ہے، جب مرد وزن ایک ہی دائرہ کار میں نظر آنے لگتے ہیں۔عورتوں کے حقوق کی آڑ میں انگریز نے جو پروپیگنڈا کیا ہے۔اس سے مشرقی ممالک بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ہر مقام پر مرد وزن کے شانہ بشانہ چلنے کی وجہ سے معاشرہ میں خرابیاں پیدا ہورہی ہیں۔جس کا نتیجہ بے حیائی اور فحاشی کی صورت میں نکلے گا۔اس غلط رجحان نے اذہان کو شیطان کی جولان گاہ بنادیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مرد وزن کے باہمی اختلاط سے نسل انسانی کو پیدا فرمایا اور دونوں کے لیے خصوصی احکام نازل فرمائے اور اس امر کا خاص اہتمام فرمایا کہ ہر ایک (مرد ہو یا عورت) اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر مصروف عمل ہو، تاکہ معاشرہ پاکیزہ رہے، کسی کو بھی اپنے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی۔موجودہ دور کی معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کا اصل سبب یہ ہے کہ مرد وعورت میں سے ہر ایک نے اسلام کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر کے خالص حیوانی زندگی کو اپنا نصب العین بنالیا، اگر اسلام کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کا خیال رکھا جاتا تو ایسا خوشگوار ماحول اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا جس میں ہر ایک کو سکون واطمینان کی زندگی نصیب ہوتی، گویا دنیا نمونہ جنت بن جاتی۔فسق وفجور اور معاصی وجرائم کی کثرت اور روز افزوں ترقی میں مرد وزن کے آزادانہ اختلاط کا بہت حد تک دخل ہے۔عورتوں کا کام گھر کی دیکھ بھال ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق بہت سے احکام سورہ نساء، سورہ طلاق، سورہ تحریم وغیرہ میں بیان فرمادیے ہیں۔جن سے ان کے دائرہ کار کا پتہ چلتا ہے، لہٰذا ان کی بھلائی اپنے دائرہ کار میں رہنے سے ہی ہے۔اس سے تجاوز شر وفساد کا موجب ہوگا۔

بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ کا مطلب

فرمایا بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ بعض تمہارے بعض سے ہیں۔مرد عورتوں سے ہیں اور عورتیں مردوں سے ہیں۔یعنی ایک دوسرے کی جنس سے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ایک جنس انسانی سے پیدا فرمایا ہے۔دونوں کا ایک ہی باپ اور ایک ہی سلسلہ نسب ہے۔البتہ دونوں کی صنف میں تفریق پیدا کی ہے۔ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت بنادیا۔دونوں کے دائرہ ہائے کار

الگ الگ مقرر فرمائے اور پھر معاشرے کی تہذیب وترقی کا انحصار اپنے اپنے امور کی انجام دہی پر رکھ دیا۔ جب تک عورت اور مرد اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر اپنے اپنے فرائض انجام نہیں دیں گے تمدن کی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ غرضیکہ مرد و زن کی جنس تو ایک ہے مگر ان کی صنف الگ الگ ہے بَعۡضُكُمۡ مِّنۢ بَعۡضٍ ۚ کا یہی مطلب ہے۔

حضانت کا مفہوم

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ کہ بعض کام ایسے ہیں جنہیں صرف عورتیں ہی انجام دے سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کا مزاج ہی ایسا بنا دیا ہے کہ تکلیف پر تکلیف اٹھانے کے باجود اولاد کی حضانت کی ذمہ دار ہے اور اسے خوشی سے انجام دیتی ہے۔ (حضانت کا لغوی اور شرعی مفہوم بچے کی پرورش، دیکھ بھال اور نگہداشت سے عبارت ہے) بلکہ اکثر مشاہدہ میں آیا ہے کہ اگر کسی وجہ سے بچے کی پیدائش کا سلسلہ شروع نہ ہو سکے تو عورت بے چین ہو جاتی ہے۔ اور پھر پیدائش کے بعد بچے کی پرورش اور دیکھ بھال عورت کی فطرت میں داخل ہے یہ کام مرد انجام نہیں دے سکتا، کیونکہ اللہ نے اس کا دائرہ کار مختلف بنایا ہے۔ عورتیں اگر دیندار، سمجھدار اور اپنے کام کی بجا آوری کماحقہ انجام دیں۔ تو ان کے تربیت یافتہ بچے ایک اچھی سوسائٹی کی بنیاد رکھیں گے۔ اور اس طرح جو تمدن پیدا ہوگا، وہ اعلیٰ درجے کا ہوگا۔ بچے کو سب سے پہلا درس ماں ہی دیتی ہے اور بچہ کلمہ طیبہ ماں ہی کی زبان سے سیکھتا ہے گو ایمان کی دولت انسان کو ماں کے ذریعے نصیب ہوتی ہے۔ اچھی ماں کی اچھی تربیت انسان کی زندگی پر مثبت اثر ڈالے گی اور اس کے برخلاف اگر ماں کی تربیت بے دینی پر مشتمل ہوگی، تو اولاد بھی ویسی ہی ہوگی۔ حضور ﷺ کا فرمان مبارک ہے کہ دنیا کی سب سے اچھی نعمت اَلْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ یعنی نیک عورت ہے۔ اور معاشرے کے بناؤ بگاڑ میں اس کا بنیادی حصہ ہے۔

قرآن کریم میں اللہ کی راہ میں ہجرت کی فضیلت

اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا جن لوگوں نے ہجرت کی۔اسلام میں ہجرت کی فضیلت، اہمیت اور فوائد بہت زیادہ ہیں؛ یہ اللہ کی راہ میں قربانی، دین کی حفاظت اور اسلام کی سربندی کا ذریعہ ہے۔قرآن وسنت میں ہجرت کرنے والوں کے لیے عظیم درجے، دنیا کی بھلائی اور آخرت میں مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے بعض اوقات اہل ایمان اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ خدا کا نام نہیں لے سکتے اور اس سلسلے میں بعض اوقات مال اور اہل و عیال کی قربانی دینی پڑتی ہے۔نئی جگہ پر ماحول مختلف ہوتا ہے۔آب وہوا کی تبدیلی کی وجہ سے انسان طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔زباندانی کا مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے۔حسب خواہش خوراک میسر نہیں آتی۔لہذا ہجرت کرنا بڑا اذیت ناک کام ہے۔مگر مجبوراً کرنا پڑتا ہے فرمایا وہ لوگ جنہوں نے خود ہجرت کی اور وہ بھی وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ جو اپنے گھروں سے زبردستی نکالے گئے۔مال واسباب پر قبضہ کرلیا گیا۔بیوی بچوں کو روک لیا گیا۔کتنی تکلیف دہ صورت حال ہے۔حضور ﷺ کے صحابہ کرام کو یہ تمام تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔مدینہ جا کر آب وہوا میسر نہ آئی، بیمار ہوئے۔سفر کی تکالیف برداشت کیں۔اسی لئے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔اِنَّ شَأْنَ الْهِجْرَةِ شَدِيْدٌ ہجرت کا معاملہ بڑا مشکل ہے اور جو شخص اس میں ثابت قدم ہو کر نکلے اس کے لیے اجر بھی عظیم ہے۔حضور ﷺ نے خود دعا فرما اَللّٰهُمَّ اَمْضِ لِاَصْحَابِي هِجْرَتَهُمْ، اے اللہ! میرے صحابہ کی ہجرت کو پورا اور قائم فرما اور پھر جب کوئی شخص دوسرے مقام پر ہجرت کرلیتا ہے۔تو اس کو واپس اپنے پہلے مقام پر جانے کی اجازت نہیں ہے۔جو لوگ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔وہ حج کے لیے بھی مکہ آتے تھے، تو حج کے بعد تین دن سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی، وجہ یہ ہے۔کہ اس مقام پر فوت ہو کر دفن ہونا بھی ٹھیک نہیں۔فرمایا وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ اور جنہیں میرے راستے میں تکلیف دی گئی، وہ کون سی تکلیف ہے جو کافروں، مشرکوں اور

اہل کتاب نے مسلمانوں کو نہیں پہنچائی۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا، تپتی ہوئی ریت پر لٹایا گیا، مالی نقصان پہنچایا گیا اور پھر سب سے بڑی دینی تکلیف دی گئی۔ اسلام کو استہزاء کا نشانہ بنایا گیا۔ قرآن پاک کی تکذیب کی گئی اور حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کی گئی۔ یہ تکلیف جسمانی اذیت سے بھی سوا ہے۔ اسی لیے تو حضور ﷺ نے دعا فرمائی۔ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ مُصِيبَتَنَا فِي دِينِنَا اے اللہ! دین کے معاملے میں ہمیں اذیت نہ پہنچے۔ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ گذشتہ رکوع میں گزر چکا ہے کہ اے اہل ایمان! تمہیں مالوں اور جانوں کے ذریعے آزمایا جائے گا اور تمہیں اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے اذیت ناک باتیں سننا پڑیں گی۔ اور اگر ان تکالیف پر صبر کرو گے اور تقوے کا راستہ اختیار کرو گے تو یہ چیز دین میں مطلوب و مقصود ہے اور باعث فوز و فلاح ہے۔ اور پھر فرمایا کہ تم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں وَقٰتَلُوْا جنہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد بالسیف کیا۔ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر نکلنا بڑا مشکل کام ہے اور اس سے کوئی دنیاوی غرض نہ ہو بلکہ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ اس لیے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، اس کا دین غالب آئے اور قرآن پاک کا دستور جاری ہو۔ فرمایا جو لوگ کفن بردوش نکلے وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا اور شہید بھی کیے گئے۔ انہوں نے اللہ کی راہ میں جان جیسی قیمتی متاع قربان کر دی۔ اس سے بڑی قربانی کیا ہو سکتی ہے۔

ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ میں ان کی خطاؤں کو ضرور معاف کر دوں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ شہید کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرنے سے قبل اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ حضور نبی کریم (علیہ السلام) نے ارشاد فرمایا کہ اسلام، ہجرت اور حج تین عمل ایسے ہیں کہ ان کے انجام دینے پر يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ۔ اللہ تعالیٰ سابقہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ البتہ ایک چیز پھر بھی اس کے ذمہ رہتی ہے اور وہ حقوق العباد ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف فرما دیتا ہے مگر بندوں کے حقوق اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک صاحب حق خود نہ معاف کرے۔ ایک شخص نے حضور

ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر میں خدا کی راہ میں اس طرح مارا جاؤں مُقْبِلًا غَيْرَ مُدْبِرٍ بغیر پشت پھیرے بہادری کے ساتھ لڑوں اور پھر جان قربان کردوں، تو کیا میرے تمام گناہ معاف کردیے جائیں گے؟ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا ہاں۔ یہ سن کر جب وہ شخص واپس جانے لگا نبی کریم ﷺ نے پھر بلایا اور ارشاد فرمایا کہ باقی گناہ تو سارے ہی معاف ہوجائیں گے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ سوائے قرضہ کے۔ یہ حقوق العباد میں سے ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، جبرائیل نے ابھی آ کر مجھے بتایا ہے کہ شہادت سے قرضہ معاف نہیں ہوگا۔ فرمایا ایسے لوگوں کے گناہ معاف کردوں گا۔ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ اور میں ان کو ایسے بہشتوں میں داخل کروں گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جنت بڑا عزت کا مقام ہے۔ بڑی اعلیٰ اور ارفع جگہ ہے۔ جہاں باغات، کوٹھیاں اور محلات ہوں گے، جن کی تفصیلات قرآن پاک میں مختلف مقامات پر ذکر ہوئی ہیں۔ فرمایا یہ سب چیزیں ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو ایمان لائے، اللہ کا ہر حالت میں ذکر کرے، دعائیں کرے مشقت کے کام انجام دے، جہاد میں حصہ لے۔ دین کو قائم کرے، اس کا بدلہ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ فرمایا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾ بیشک اللہ کے ہاں بہت ہی اچھا بدلہ ہے۔ ایسا بدلہ صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے لہٰذا اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنی چاہئے۔ اور ہمیشہ اس کی وحدانیت پیش نظر رہنی چاہئے۔

قرآنی احکام اور حقیقتِ دنیا

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

دنیا کی زیب وزینت اور اس کی حقیقت

لَا يَغُرَّنَّكَ	نہ آپ کو دھوکے میں ڈالے	تَقَلُّبُ	چلنا پھرنا
الَّذِيْنَ	اُن لوگوں کا جنہوں نے	كَفَرُوْا	کفر کیا
فِي الْبِلَادِ	شہروں میں		

دنیا جس میں ہم رہتے سہتے ہیں، جس کی محبت میں ہم غرق ہیں، جس کی خوبی صورتی اور چمک دمک سے ہم متاثر ہیں، جس کو حاصل کرنے کے لیے ہم دن دیکھتے ہیں نہ رات، سردی دیکھتے ہیں نہ گرمی، بارش دیکھتے ہیں اور نہ طوفان جانتے ہیں۔ اس دنیا کی حقیقت وحیثیت کیا ہے؟ یہ کب تک رہے گی؟ اس کی عمر کیا ہے؟ اللہ کی نگاہ میں اس کی قدر ومنزلت کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ کفار کا مختلف شہروں میں آنا جانا کہیں آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے۔ فرمایا آپ دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ جو اللہ

تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں اور معاصی میں مبتلا ہیں، وہ اس دنیا میں خوشحالی کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ بہترین مکانوں میں رہائش پذیر ہیں۔ اعلی سواریاں حاصل ہیں، کارخانے ہیں، مربعے ہیں، مال و دولت کی فراوانی ہے۔ مگر ایمان سے خالی ہیں۔ نیکی سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان نہیں رکھتے، نہ عاقبت کی انہیں کوئی فکر ہے۔ اس سے پہلے درس میں مومنوں کے گناہ بخشنے اور ثواب عظیم کا وعدہ فرمایا، حالانکہ وہ فقر و فاقہ کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے بالمقابل کفار نہایت عیش و نعمت میں تھے، انھیں دیکھ کر بعض اوقات مسلمان غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے اور مختلف خیالات کی دنیا میں چلے جاتے، لہٰذا ان آیات میں مسلمانوں کا ذہن صاف کرنے کے لیے کفار کا انجام بیان فرمایا اور مسلمانوں کو تسلی دی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نیکی کے معاملہ میں مومن کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا، اسے اس نیکی کا بدلہ دنیا میں بھی دیتا ہے اور آخرت میں بھی اور کافر جو نیکیاں اللہ کے لیے کرتا ہے اس کا بدلہ اسے دنیا ہی میں پورا دے دیا جاتا ہے، پھر جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی باقی نہیں ہوگی کہ اس کا بدلہ اسے دیا جائے۔" [مسلم، صفات المنافقین، باب جزاء المؤمنین۔۔۔: 2808] مقصد یہ ہے کہ شہروں میں کفار کے تجارتی کاروبار، ان کی خوش حالی اور مال و دولت کی فراوانی کو دیکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں کسی قسم کا حزن وغم نہیں آنا چاہیے، نہ ان کو ناامیدی کا شکار ہونا چاہیے، نہ منافقین کا سا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ جو سختی اور خوف کے وقت پکار اٹھتے ہیں: (مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا) [الأحزاب: 12] "پیغمبر نے تو ہم سے محض فریب اور دھوکے کا وعدہ کیا ہے۔" کفار کی دنیوی خوشحالی سے کفر کے حق ہونے پر استدلال کرنا چاہیے، یہ چند روزہ زندگی کا قلیل سا سامان اور عارضی بہار ہے، مرنے کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ اس کے مخاطب بظاہر تو رسول اللہ ﷺ ہیں مگر مراد امت ہے۔

مَتَاعٌ قَلِيۡلٌ کا مفہوم اور تشریح

مَتَاعٌ	(یہ) فائدہ ہے	قَلِيۡلٌ	تھوڑا سا
ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ	پھر ان کا ٹھکانہ	جَهَنَّمُ	دوزخ ہے
وَبِئۡسَ	اور (وہ) برا	الۡمِهَادُ	بچھونا ہے (آرام کرنا)

فرمایا: مَتَاعٌ قَلِيۡلٌ فرمایا دنیا کا سارا ساز و سامان جو اس زمین پر بسنے والے ایک ایک فرد کے پاس موجود ہے، اور وہ خزانے جو پہاڑوں کی تہوں میں موجود ہیں اور بیش قیمت موتی جو سمندروں میں پائے جاتے ہیں، مکان، کوٹھیاں، کاریں، کارخانے، زر و جواہرات، مع دنیات غرضیکہ دنیا کی ہر چیز ایک جگہ پر اکٹھی کر دی جائے، تو پھر بھی یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مَتَاعٌ قَلِيۡلٌ تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے۔ یہ معمولی سامان ہے جو اللہ نے لوگوں کے استعمال کے لیے دے رکھا ہے ہے۔ حضور نبی (علیہ السلام) کے فرمان کے مطابق پوری دنیا کے مال و دولت کی مثال آخرت کے مقابلے میں ایسی ہے جو اللہ نے لوگوں کے استعمال کے لیے دے رکھا۔ حضور نبی (علیہ السلام) کے فرمان کے مطابق پوری دنیا کے مال و دولت کی مثال آخرت کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے کوئی شخص سمندر میں انگلی ڈبو کر نکال لے۔ انسان جس مال و متاع کی موجودگی پر اکڑ رہا ہے۔ اس کی حیثیت اتنی بھی نہیں جتنا پانی کسی انگلی کو لگ سکتا ہے۔ اب تو لوگوں کی عمریں چھوٹی ہوگئیں ہیں اور اس تھوڑے وقت میں انسان کیا کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ پہلے لوگوں نے بڑی لمبی لمبی عمریں پائیں اور اس طرح انہوں نے مال و دولت بھی زیادہ اکٹھا کیا۔ حضرت نوح (علیہ السلام) اور حضرت ادریس (علیہ السلام) کا زمانہ بلکہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دور تک لوگوں کی عمریں طویل تھیں پھر کم ہونا شروع ہوگئیں۔ اس وقت لوگوں پر بڑھاپا بھی طاری نہیں ہوتا تھا۔ اب بڑھاپا آنے لگا ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے پہلے لوگوں کے بال بھی سفید نہیں ہوتے تھے۔ سب سے پہلے آپ ہی کے بالوں میں سفیدی آئی۔ غرض!

اب تو پوری دنیا پر بڑھاپا طاری ہوگیا ہے، ابتدائے دنیا سے لے کر جتنا بھی مال و متاع ہے آخرت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ لہذا آپ کافروں کی طرف دیکھ کر کسی مغالطے میں نہ پڑ جائیں کہ وہ محبوب خدا ہیں جو کچھ بھی ان کے پاس ہے بالکل حقیر چیز ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی ایک سپر مارکیٹ کی طرح ہے، اس میں گھومیں پھریں، جو چاہیں خریدیں، جتنا چاہیں خریدیں، بے شک پوری ٹرالی بھرلیں، لیکن اس بات کو یاد رکھیں کہ محاسب (کیشیئر) کے پاس بھی جانا ہے، جتنا سامان لیا ہے اس کا حساب دینا ہے، یہی مثال دنیا کی ہے، جو کچھ بھی یہاں کریں گے، جائز و ناجائز، حلال و حرام، خیر و شر، اللہ کی فرماں برداری اور نافرمانی، اس دنیا کے ختم ہو جانے کے بعد آخرت میں اللہ احکم الحاکمین، جو خیر الحاسبین ہے، کے پاس جانا ہے اور پوری زندگی کا حساب دینا ہے۔ جو اس دنیا میں ختم ہو جائے گا۔ اور پھر جب وہ آخرت کی منزل میں قدم رکھیں گے ثُمَّ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴿۱۹۷﴾ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے جس کی طرف جا رہے ہیں۔ یعنی اللہ کے دین کی مخالفت کے باوجود کفار کے تجارتی قافلے یمن سے شام تک جاتے اور معقول منافع کماتے اور پھر عیش و عشرت سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں تو اس چند روزہ عیش و آرام سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ ان پر مہربان ہے۔ کیونکہ آخرت میں ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ لہذا کسی کو اس فریب میں نہ پڑنا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں کے وقتی غلبہ سے مسلمان متاثر نہ ہوں اور اس کو عند اللہ مقبولیت کی علامت اور کامیابی نہ سمجھیں خلاصہ یہ ہے کہ آخرت سے غفلت ہلاکت و بربادی ہے، دنیا تو بڑی دل کش اور حسین و جمیل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں ہمیں پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ ہمیں آزمائے اور ہمارا امتحان لے اور دیکھے کہ ہم کیا کرتے ہیں، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شخص دنیا کی فریبی اور عورتوں کے مکر و دھوکے سے اجتناب کرے، اس لیے کہ یہ شیطان کا جال ہیں اور ایسے لوگوں سے بھی دور رہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے منھ موڑ کر صرف دنیاوی زندگی کے حرص میں

رہتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں سمجھ بوجھ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اَہلِ تقویٰ کے لئے انعامات اور بشارتیں

لٰكِنِ الَّذِيْنَ	لیکن وہ لوگ جو	اتَّقَوْا	ڈرتے رہے
رَبَّهُمْ	اپنے رب سے	لَهُمْ	ان کے لیے
جَنّٰتٌ	باغات ہیں	تَجْرِيْ	بہتی ہیں
مِنْ تَحْتِهَا	ان کے نیچے	الْاَنْهٰرُ	نہریں
خٰلِدِيْنَ	وہ ہمیشہ رہیں گے	فِيْهَا	اُن میں
نُزُلًا	(بطور) مہمان نوازی کے	مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	اللہ کے پاس سے
وَمَا	اور جو	عِنْدَ اللّٰهِ	اللہ کے پاس ہے
خَيْرٌ	(وہ) بہترین ہے	لِّلْاَبْرَارِ	نیک لوگوں کے لیے۔

فرمایا لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ مگر وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے رہے۔ شرک وکفر سے محفوظ رہے۔ معاصی سے بچتے رہے ان کے دلوں میں خدا کا خوف جاگزیں رہا اور اسی خوف کی وجہ سے اللہ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز نہیں کیا، دنیا میں حلال وحرام کا امتیاز کیا۔ نیکی اور بدی کو پہچانا، اپنے ایمان کی حفاظت کی، اسی چیز کا نام تقوی ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے تقوی کا راستہ اختیار کیا فرمایا لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ان کے لیے باغات ہیں۔ جن کے سامنے نہریں بہتی ہیں۔ جنت کی نعمتوں کی جو تفصیلات قرآن پاک نے مختلف مقامات پر بیان کی ہیں وہ ایسی چیزیں ہیں جو انسان عام طور پر اپنے تصور میں لا سکتا ہے۔ مثلاً دنیا میں آرام وآسائش کے لیے اچھا مکان، اچھی بیوی جو اچھے اخلاق واطوار کی حامل ہو۔ قرآن پاک نے انہیں اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کا نام دیا ہے۔ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً۔ یعنی پسندیدہ مکانوں کا ذکر کیا ہے۔ اور اسی طرح اچھی رفاقت کا تذکرہ آتا ہے جیسے گذشتہ درس میں گزر چکا ہے مَعَ الْاَبْرَارِ۔ نیک لوگوں کی رفاقت کی دعائیں انبیاء (علیہم السلام) بھی کرتے رہے۔ اس کے علاوہ انسان اچھا لباس بھی پسند کرتا ہے اس کی

موافقت سے جنت کے پاکیزہ لباس کا تذکرہ بھی آتا ہے آخرت کا مال ومتاع اور آرام وآسائش اس دنیا کے مقابلے میں لامحدود ہوگا۔اسی طرح شراب طہور، عسل مصفی، دودھ کی نہروں اور غیر آسن پانی کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ سب چیزیں اہل جنت کو حاصل ہوں گی جن کا صحیح تصور ہم اس وقت نہیں کرسکتے، تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام یافتہ بندوں کے لیے جن انعامات کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی حد تک ہمارے تصور میں آسکتی ہیں۔اسی لیے فرمایا کہ متقی لوگوں کے لیے باغات ہوں گے جن کے سامنے مصفی پانی کی نہریں بہتی ہوں گی۔ان نہروں کا پانی کبھی خراب نہیں ہوگا اور اگر جنتی چاہیں گے تو یہ نہریں بغیر کسی رکاوٹ کے زمین کے اوپر چل رہی ہوں گی۔فرمایا متقین اس جنت میں کسی محدود عرصہ کے لیے نہیں جائیں گے بلکہ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اس میں ہمیشہ ہمیشہ سکونت پذیر رہیں گے اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہاں سے انہیں نکالا نہیں جائیگا۔اللہ تعالیٰ یہ بھی فرمائیں گے کہ تم مقام رضوان میں پہنچ چکے ہو۔اب میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔

اللہ کی طرف سے مہمانداری

فرمایا یہ ساری نعمتیں، نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اللہ کی طرف سے مہمانداری ہوگی۔نزل۔اس اچھی سے اچھی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مہمان کی آمد پر سب سے پہلے پیش کی جاتی ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی مہمانداری میں اعلیٰ ترین چیزیں پیش کی جائیں گی جن میں مادی نعمتوں کے علاوہ تقرب الٰہی اور تجلیات الٰہی جیسی عظیم نعمتیں بھی شامل ہوں گی۔نزل کو مہمانداری کے معانی میں عام عربی بول چال میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔نزل کا معنی مہمانداری ہے۔جو اللہ تعالیٰ جنتیوں کے لیے پیش کریں گے۔ظاہر ہے کہ جن خوش قسمت لوگوں کا میزبان خود خدا ہوگا، ان کو کتنی عزت اور کتنا شرف حاصل ہوگا۔

نیکوکاروں کے لیے بہتر اجر

فرمایا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ جو کچھ اللہ کے پاس ہے یعنی اس کی اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں بہتر ہیں نیکوکاروں کے لیے ابرار کا لفظ پہلے بھی گزر چکا ہے یہ بر کی جمع ہے اور مراد وہ نیک

لوگ ہیں جن کی نگاہ ہمیشہ انجام پر رہتی ہے اور نیکی کرنا ان کا شعار ہوتا ہے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے، اعلیٰ ادنیٰ کے ساتھ نیکی کرتے ہیں۔ بڑوں کا حق ادا کرتے ہیں، اولاد اور دیگر عزیز و اقارب کے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ والدین کی خدمت کرتے ہیں برابر والوں سے حسن سلوک کرتے ہیں۔ دوست احباب اور پڑوسیوں سے میل ملاپ رکھتے ہیں، غربا و مساکین کے ساتھ مطلوبہ سلوک روا رکھتے ہیں، غرض وہ لوگ ہر وقت اور ہر ایک کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں۔ فرمایا اللہ کے پاس جو کچھ انعامات ہیں وہ ان نیک لوگوں کے لیے بہتر اجر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کے گروہ میں شامل ہونے کا مستحق بنائے۔

ان دو آیات میں ایک مسلمان اور ایک کافر کی دنیوی اور اخروی زندگیوں کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک کافر کی دنیا کی یہ چند روزہ زندگی عیش و آرام سے گزرتی ہے۔ (حالانکہ عملاً ایسا نہیں ہوتا اسے بھی دنیا میں کئی طرح کے غم اور تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں) لیکن آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ وہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے، اور مسلمان کی یہ چند روزہ زندگی، دکھ، مصائب، پریشانی اور تنگدستی میں گزرتی ہے۔ (حالانکہ عملاً ایسا نہیں ہوتا، اسے بھی اس دنیا میں خوشی اور خوشحالی کے لمحات میسر آتے ہی رہتے ہیں) لیکن آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے لیے ہر طرح کی نعمتیں ہی نعمتیں اور عیش و عشرت کی زندگی ہو تو بتلائیے کہ ان دونوں میں سے کون فائدہ میں رہا؟ لہذا محض دنیوی زندگی کا ہی تقابل کر کے دھوکہ میں نہ آنا چاہیئے۔ ان کے برعکس جو تقویٰ اور خدا خوفی کی زندگی گزار کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ گو دنیا میں ان کے پاس خدا فراموشوں کی طرح دولت کے انبار اور رزق کی فراوانی نہ رہی ہوگی، مگر وہ اللہ کے مہمان ہوں گے جو تمام کائنات کا خالق و مالک ہے اور وہاں ان ابرار (نیک لوگوں) کو جو اجر وصلہ ملے گا، وہ اس سے بہتر ہوگا جو دنیا میں کافروں کو عارضی طور پر ملتا ہے۔ اللہ ہمیں اہل تقویٰ بنا دے اور اپنے محبوب کی پیاری امت کو عمل اور اخلاص کی توفیق و دولت عطا فرمائے اور سب مشکلات دور فرمائے۔ آمین

دین پر ثابت قدمی اور استقامت ضروری

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ
خٰشِعِیْنَ لِلّٰہِ ۙ لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ
رَبِّھِمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا
وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

تین قسم کے افراد کے لیے دوہرا اجر

وَاِنَّ	اور بلاشبہ	مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ	اہل کتاب میں سے
لَمَنْ	البتہ (وہ بھی ہے) جو	یُّؤْمِنُ	ایمان لاتا ہے
بِاللّٰہِ	اللہ پر	وَمَآ اُنْزِلَ	اور جو نازل کیا گیا
اِلَیْکُمْ	تمہاری طرف	وَمَآ اُنْزِلَ	اور جو نازل کیا گیا
اِلَیْھِمْ	ان کی طرف	خٰشِعِیْنَ	عاجزی کرتے ہیں
لِلّٰہِ	اللہ کے لئے	لَا یَشْتَرُوْنَ	نہیں وہ خریدتے (لیتے)
بِاٰیٰتِ اللّٰہِ	اللہ کی آیات کے بدلے	ثَمَنًا	مول
قَلِیْلًا	تھوڑا	اُولٰٓئِکَ	یہ لوگ

لَهُمْ	ان کے لیے	اَجْرُهُمْ	ان کا اجر ہے
عِنْدَ رَبِّهِمْ	ان کے رب کے ہاں	اِنَّ اللّٰهَ	بلا شبہ اللہ
سَرِيْعُ	بہت جلد	الْحِسَابِ	حساب لینے والا ہے۔

فرمایا وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اہل کتاب میں سے بعض ایسے ہیں لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ اور اس چیز پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ اور جو ان کی طرف اتاری گئی۔ کچھ اہل کتاب ایسے ہیں کہ جو تورات اور انجیل پر بھی ایمان رکھتے تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کا نزول فرمایا تو اس پر بھی ایمان لے آئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ تین آدمی ایسے ہیں جو دوہرے اجر کے مستحق ہیں۔ پہلا شخص وہ مسلمان غلام ہے جو اللہ کا حق بھی ادا کرتا ہے۔ اس کے حکم کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اور پھر اپنے دنیوی آقا کا حق بھی ادا کرتا ہے۔ اس کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا، فرمایا اس کے لیے اللہ کے ہاں دوہرا اجر ہے۔ اس اجر کا حقدار دوسرا وہ شخص ہے جو اپنی لونڈی کی اچھی تربیت کرتا ہے، پھر اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیتا ہے اور تیسرا وہ شخص بھی دوہرے اجر کا مستحق ہے جو پہلے کسی دوسرے نبی اور دوسری کتاب پر ایمان رکھتا ہے اور پھر حضور ﷺ کا زمانہ پا کر آپ ﷺ پر اور قرآن پاک پر ایمان لے آتا ہے۔

قریبی دور کے نو مسلم

اس قسم کے لوگ ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں۔ بعض انصاف پسند لوگوں کو ہمیشہ دوہرا اجر حاصل ہوتا رہا ہے۔ ہمارے قریبی زمانہ انیسویں اور بیسویں صدی میں ایسے کئی خوش نصیب ہمارے سامنے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کے جد امجد برہمن تھے۔ اللہ نے ایمان نصیب فرمایا۔ مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کے والد اولا ہندو تھے، زرگری کا کام کرتے تھے، اللہ نے ایمان بخشا۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی سکھ تھے۔ وہ خود ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے اور اعلیٰ مقام پایا۔ یہاں آپ کے ضلع میں پروفیسر محبوب الٰہی سکھ مذہب رکھتے تھے۔ اللہ نے ایمان بخشا۔ اسلامیہ ہائی

سکول کے ٹیچر ابراہیم صاحب کے والد اور مولانا احمد علی کے والد اکٹھے مسلمان ہوئے۔اسیران مالٹا میں سے مولانا عزیرگل کی بیوی انگریز تھی، وہ بھی ایمان لائی اور تیس سال تک آپ کے عقد میں رہی۔ابھی چند سال پہلے فوت ہوئی ہے۔بڑی عبادت گزار خاتون تھیں۔تحفۃ الہند کے مصنف ہندو تھے۔پٹیالے کے رہنے والے تھے۔شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی جماعت کے آدمیوں سے متاثر ہو کر ایمان لائے۔آپ نے اسلام کے حقائق اور شرک کی تردید میں بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔قریبی دور میں اسلام قبول کرنے والی معروف عالمی شخصیات میں کلیرنس سیڈورف، کیون لی اور جینیفر گروٹ شامل ہیں۔یہ تمام افراد مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے اپنی مرضی سے اسلام کا انتخاب کیا۔ملکم ایکس (الحاج ملک الشہباز): امریکا کے تاریخی اور معروف حقوقِ انسانی کے علمبردار، جنہوں نے اپنی زندگی کے آخری حصّے میں حقیقی اسلامی تعلیمات کو اپنایا۔کلیرنس سیڈورف: مشہور ڈچ فٹ بال کھلاڑی اور مینیجر، جنہوں نے مارچ 2022 میں اسلام قبول کیا۔کیون لی: امریکا کے معروف پروفیشنل مکسڈ مارشل آرٹس (MMA) اور UFC کے سابق ماہر، جنہوں نے اکتوبر 2021 میں اسلام قبول کیا۔اسی طرح ایک یہودی پہلا نام لیو پولڈ تھا مسلمان ہو کر محمد اسد کہلایا۔اس شخص نے مطالعہ اسلام کے لیے مصر سے بذریعہ ریل سفر کا آغاز کیا۔گاڑی میں فلسطین کے کچھ مسلمان بدو بھی ہم سفر تھے۔دوران سفر ایک بدو کسی سٹیشن پر اترا اور کھانے کے لیے دو روٹیاں لے آیا۔اس نے کھانے میں شرکت کے لیے لیو پولڈ کو بھی دعوت دی اور کہا۔بِسۡمِ اللّٰہِ عَلٰی بَرَ کَتِ اللّٰه۔تناول فرمائیں۔اس نے معذرت چاہی مگر اس بدو نے اصرار کیا کہ ہم مسلمانوں کا یہی طریقہ ہے۔کہ ہم ساتھیوں کو بھی کھانے کی دعوت دیتے ہیں، وہ شخص اس پیش کش سے بہت متاثر ہوا۔اس شخص نے بدو کے سامنے اسلام پر یہ اعتراض پیش کیا۔کہ تمہارے بقول اسلام ایک عالمگیر اور منصفانہ دین ہے مگر اس کا یہ قانون عجیب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان آدمی اہل کتاب عورت سے تو شادی کر سکتا ہے مگر ایک مسلمان عورت کسی یہودی یا عیسائی کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی۔وہ بدو باشعور تھا، فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا اور اعتراض کی وضاحت یوں کی کہ مسلمان حضرت موسیٰ

(علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سمیت تمام انبیائے کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ اور ان کی اسی طرح تکریم کرتے ہیں جس طرح نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کرتے ہیں۔اگر کوئی یہودی یا عیسائی عورت مسلمان کے گھر میں آجاتی ہے، تو وہ اس گھر میں اپنے نبی اور اس کی کتاب کے متعلق کوئی تکلیف دہ بات نہیں سنے گی بلکہ اپنے نبی کا عزت واحترام دیکھے گی۔برخلاف اس کے اگر مسلمان عورت کسی یہودی یا عیسائی کے گھر داخل ہوگی۔تو وہ اپنے نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم وتکریم کو محفوظ نہیں پائے گی۔جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ ذہنی کوفت میں مبتلا رہے گی۔لہٰذا اسلام نے کسی مسلمان عورت کو غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں دی۔اس بات نے بھی لیو پولڈ پر اثر کیا۔اور اللہ تعالیٰ نے اس کا دل ایمان کے لیے کھول دیا۔اس شخص نے اسلام کی تائید میں بڑی اچھی کتابیں لکھی ہیں: نومسلم اسکالر محمد اسد (پہلے نام لیو پولڈ وائس/ لیو پولڈ ویز) کی مشہور کتابوں میں The Message of the Qur'an، The Road to Mecca اور Islam at the Crossroads شامل ہیں۔یہ شخص مسلمانوں کی زبوں حالی کا بڑا شاکی ہے۔ماماڈیوک بھی عیسائی تھا۔ترکی میں جاسوسی کرنے کی غرض سے گیا۔اس دور کے شیخ الاسلام کی مجالس میں شمولیت اختیار کی جس کا اثر یہ ہوا کہ عیسائیت چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوگیا۔ضلع چکوال کے گاؤں میانیمیں پروفیسر غازی احمد جنہوں نے خود اسلام قبول کیا۔اس کا باپ کٹر ہندو تھا۔اسلام قبول کر کے بڑے مصائب کا شکار ہوئے والدین کی طرف سے سختیاں جھیلیں اور آخر کار دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لیے ان سے علیحدہ ہوگیا۔اللہ تعالیٰ نے علم جیسی نعمت عطا کی، اس نے ہدایہ کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں شاہی خاندان کے فرد کوئیلم نے اسلام قبول کیا۔اس نے قبول اسلام کا واقعہ خود لکھا ہے جسے طنطاوی جوہری نے تفسیر الجواہر میں نقل کیا ہے۔کوئیلم تبدیلی آب وہوا کے لیے الجزائر گیا، وہاں پر مسلمانوں کے وضوء کے طریقے سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔خود بیرسٹر تھا۔اس کے ساتھ خاندان کے مزید چالیس افراد نے ایمان قبول کیا۔انگریزوں نے اس پر عدالت میں مقدمہ دائر

کیا۔اس نے اپنے مقدمہ کی خود پیروی کی اور انگریز نامراد رہے۔غرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام غیر مسلم ایک سے نہیں ہوتے بلکہ ان میں بعض منصف مزاج بھی ہوتے ہیں۔جو حق کو قبول کر لیتے ہیں اور ایسے لوگ ہر دور میں پائے گئے ہیں۔

خشیت الٰہی

آگے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی صفات بیان فرمائی ہیں۔پہلی صفت یہ ہے کہ وہ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ اللہ کے سامنے عاجزی کرنے والے ہوتے ہیں۔خشیت الٰہی یا اخبات الی اللہ (اخبات الی اللہ کا لغوی معنیٰ اللہ کے حضور عاجزی کرنا، انکساری اپنانا اور قلبی سکون کے ساتھ اس کے سامنے جھک جانا ہے) اسلام کے چار اہم اصولوں میں سے ایک ہے۔اور ہر اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس امت سے جو چیز سب سے پہلے اٹھے گی وہ اخبات ہے۔فرمایا مسجد نمازیوں سے بھری ہوگی مگر پانچ سو آدمیوں میں سے۔حَتّٰى لَا تَرٰى فِيهَا خَاشِعًا ایک بھی صاحب خشوع وخضوع نظر نہیں آئے گا، اخبات کا اس قدر قحط واقع ہو جائیگا۔اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنا جزو ایمان ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرے گا، وہ اپنے گرد و پیش والوں کے ساتھ بھی تواضع سے پیش آئیگا۔وہ کسی بات پر اکڑ نہیں دکھائے گا حضور ﷺ نے فرمایا لَا يُبْغِي بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ تم ایک دوسرے کے ساتھ فخر و غرور کے ساتھ مت پیش آؤ، ہمیشہ انکساری اختیار کرو۔فرمایا ایسے لوگوں کی دوسری صفت یہ ہے۔لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وہ اللہ کی آیتوں کے بدلے دنیا کا حقیر مال نہیں خریدتے۔گذشتہ دروس میں کئی مقامات پر آچکا ہے۔کہ اہل کتاب اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے تھے۔یہاں فرمایا کہ بعض اچھے ہیں جو ایسا نہیں کرتے۔یہ بہت بڑی بیماری ہے، جو اہل کتاب سے مسلمانوں میں بھی آگئی ہے دھوکے فریب کی کمائی اسی قبیل سے ہے۔غلط مسائل بتا کر اس کی فیس وصول کی جاتی ہے۔یہ اللہ کی آیتوں کو بیچنے کے مترادف ہے۔

حساب میں جلدی

فرمایا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ایسے لوگوں کا اپنے پروردگار کے ہاں بہتر اجر ہے۔ بلکہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ دوہرا اجر عطا فرمائیں گے اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے قیامت قریب ہے اور ہر شخص کا حساب جلدی شروع ہونے والا ہے۔ لہذا اسے غافل نہیں رہنا چاہئے۔ تو اس کا اجر بھی جلدی عطا کرے گا اس میں کسی قسم کی دیر نہیں ہوگی۔ اچھا یا برا بدلہ جس کا کوئی شخص حقدار ہوگا۔ فوراً پالے گا۔

دین اسلام پر ثابت قدمی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوا	ایمان لائے ہو!
اصْبِرُوْا	تم صبر کرو	وَصَابِرُوْا	اور مقابلہ (میں (ڈٹے) رہو
وَرَابِطُوْا	اور جنگ کی تیاری کرو	وَاتَّقُوا اللّٰهَ	اور ڈرو اللہ سے
لَعَلَّكُمْ	تا کہ تم	تُفْلِحُوْنَ	فلاح پاؤ۔(200)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر کرو، اصْبِرُوْا" یعنی دین اسلام پر ثابت قدمی سے جمے رہو صبر' سے مراد دین کے راستہ میں پیش آنے والی مشقتوں اور صعوبتوں کو برداشت کرنا ہے" وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا صبر کرو اور مقابلے میں جمے رہو اور مورچوں میں ڈٹے رہو صَابِرُوْا" سے مراد دشمن کے مقابلہ میں صبر و استقامت اختیار کرنا ہے، دشمن سے مقابلہ کی تیاری کو مرابطہ' کہتے ہیں، اسی سے ہے: 'رَابِطُوْا 'یعنی دشمنان اسلام سے مقابلہ کے لئے ہمیشہ تیار اور مستعد رہو (رَابِطُوْا) یعنی جہاد کے لیے تیار رہنا کسی چوکی پر پہرہ دینا، مورچے پر رہنا اور اپنی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا سب کچھ شامل ہے۔ بعض فقہاء رباط کو جہاد فی سبیل اللہ سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جہاد غیر مسلموں سے کیا جاتا ہے اور رباط خود مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے۔ صبر کرو یعنی طاعات کے اختیار کرنے اور شہوات و لذات کے ترک کرنے میں اپنے نفس کو مضبوط اور ثابت قدم رکھو۔ صبر کا لغوی معنی روکنا یا ضبط کرنا ہے، لہذا صبر کی ایک دوسری صورت

نفس انسانی کو خواہشات سے روکنا ہے۔نفس ہمیشہ خواہشات کے پیچھے چلتا ہے۔اوراس کو ڈسپلن کا پابند بنانا بھی صبر ہی کی ایک قسم ہے۔صبر کی ایک قسم یہ ہے۔کہ انسان پر دین کے سلسلہ میں جس قدر مشکلات آئیں،ان کو برداشت کرے۔گویا صبر انسانی زندگی کے ہر موڑ پر کام آنے والا اصول ہے۔ کوئی نقصان ہوجائے۔جان چلی جائے،مقدمہ پیش آجائے۔ہنگامہ ہوجائے،جنگ چھڑ جائے ہر معاملے میں صبر کی ضرورت پیش آتی ہے اوراس کے بغیر انسان کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔

خلاصہ سورۃ آل عمران

سورہ آل عمران کے شروع میں یہ بتایا گیا کہ اللہ ایک ہے وہ زندہ ہے اورسب اسی کی مہربانی سے قائم وزندہ ہیں، پھر انسان کو تعلیم و ہدایت دینے کیلئے اس نے ایک آخری کتاب نازل کی،یعنی قرآن اوراس کتاب،یعنی قرآن مجید کو سمجھانے کیلئے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا۔یہ کتاب اورجن پر یہ کتاب نازل ہوئی یعنی حضرت محمد ﷺ پوری دنیا کے لیے ہدایت کا پیغام ہیں۔پھر بتایا گیا کہ دنیا تو صرف آزمائش کا گھر ہے یہاں بیشمار ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو مذہب اوراللہ سے دور کرسکتی ہیں،یعنی بیوی،بچے،مال و دولت،عزت وشوکت،عیش وآرام اورسونے چاندی کے ڈھیر۔یہی سبق دیا گیا ہے کہ یہ تمام دنیاوی چیزیں بالکل عارضی ہیں ہر وقت دھیان اس زندگی کی طرف رکھنا چاہیے جوہمیشہ کی زندگی ہے اورموت کے بعد شروع ہوتی ہے وہاں یہ سب دنیاوی چیزیں ہرگز کام نہیں آئیں گی بلکہ صرف اعمال کام آئیں گے،اس لیے ان تمام چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے قرآنی قانون اورنبی ﷺ کے فرامین سامنے رکھنے چاہئیں تب جنت ملے گی۔اس کے بعد حضرت مریم (علیہا السلام) اورحضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش،ان کے معجزت،ان کی تعلیمات اورعیسائیوں کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے،پھر آنحضرت ﷺ کا آنا،قرآن مجید اورحضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں بتایا گیا۔پھر غزوہ بدر میں کامیابی کا معجزہ،سود کی ممانعت اوراحکامات کا بیان ہے پھر غزوہ احد کا ذکر اوراس سے بیشمار مسائل کا بیان خوب تفصیل سے بتایا گیا۔آخر میں مسلمانوں کو ہدایت فرمائی گئی کہ یہود ونصاریٰ کی زندگی کے اصول

ہرگز نہ اپنائیں بلکہ صبر، سکون اور پورے خلوص ویقین سے ہر وقت اللہ رب العزت سے دعا کریں۔ دعا کا طریقہ بتایا گیا اور یہی حکم دیا گیا کہ نیکی کا راستہ ہی بہترین راستہ ہے اور جنت کی طرف یہی راستہ جاتا ہے۔ دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹے رہو۔ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور کسی سے مت ڈرو۔ سورہ آل عمران میں چونکہ غزوہ احد کا تفصیلی بیان آیا ہے اور اسکا بہت سا حصہ اسی غزوہ کے حالات پر مشتمل ہے نیکی اور اطاعت کے کاموں میں لگے رہو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ منزل مراد کو پالو گے۔ حضور ﷺ نے سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کی بڑی فضیلت بیان کی ہے فرمایا قیامت کے دن یہ دونوں سورتیں خیموں کی شکل میں آئیں گی، ان کے درمیان چمک ہوگی اور وہ اپنے پڑھنے والوں، عمل کرنے والوں اور ایمان رکھنے والوں پر سایہ فگن ہوں گی اور بندے کے حق میں سفارش کریں گی۔ ان سورتوں کو زہراوین یعنی دو روشن سورتیں کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لمبی سورتوں میں بہت سے حقائق، معارف، بنیادی اصول اور مسائل بیان فرمائے ہیں۔ دارمی شریف کی حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص جمعے کے دن سورہ آل عمران کی تلاوت کرے گا اس کے لیے فرشتے سارا دن دعائیں کرتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے۔ اور یہ آخری آیت گویا اس سورہ کا تتمہ اور لب لباب ہے جس میں مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں ہر وقت تیار رہنے کے ضمن میں جامع ہدایات دی گئی ہیں۔ فرمایا خود صبر کرو، دوسروں کو صبر کی تلقین کرو۔

خوفِ خدا/تخلیق انسانی/یتیم کی سرپرستی اور خیر خواہی

الحمد للہ وحدہ، والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ!

سورۃ النسآء کا تعارف

سورۃ النساء مدنی سورت ہے جو اجتماعی، معاشرتی اور فقہی احکام پر مبنی ہے، جس میں عورتوں کے حقوق، میراث، شادی کے مسائل، اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلو بیان کیے گئے ہیں، جن کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا ہے۔ اس سورت میں والدین، رشتہ داروں، یتیموں، اور مسافروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ منافقین، عیسائیوں اور یہودیوں کے خطرات سے مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے۔

نزول کا زمانہ: یہ سورت سن 3 ہجری کے اواخر سے سن 5 ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئی، جس میں جنگ احد کے بعد ورثاء کے مسائل اور غزوہ ذات الرقاع میں صلوٰۃ خوف جیسے واقعات شامل ہیں۔

وجہ تسمیہ: اس میں عورتوں کے حقوق، ان سے متعلق فقہی مسائل، شادی کے احکام، اور معاشرتی زندگی کے دیگر پہلو بیان کیے گئے ہیں، اسی بنا پر اسے سورۃ النساء کا نام دیا گیا ہے۔ عربی زبان میں دو لفظ ہیں، ایک رِجَال اور ایک نِسَاء رِجَال" جمع ہے" رَجُلٌ" کی جس کا معنیٰ ہوتا ہے مرد اور" نِسَاءَ" جمع ہے اِمْرَأَۃٌ کی لیکن لفظ سے نہیں ہے بلکہ دوسرے لفظ سے ہے اسے عربی زبان میں کہتے ہیں کہ بعض ایسی جمع ہیں کہ جن کا مفرد اس لفظ سے نہیں ہوتا بلکہ اور لفظ سے

ہوتا ہے۔ اگر ایک عورت ہوتو عربی میں کہتے ہیں: ”اِمْرَأَةٌ“ اور اگر کئی عورتیں ہوں ہوتو کہتے ہیں ”نِسَاء“ تو ایک لفظ رجال ہے جس کا معنیٰ ہے مرد اور ایک لفظ نساء ہے جس کا معنیٰ ہے عورتیں۔ ایک سو چودہ سورتوں میں سے ایک بھی ایسی سورۃ نہیں جس کا نام ”سورۃ الرجال“ ہو اور ایک سورۃ موجود ہے جس کا نام ”نساء“ ہے یہ میں نے ایک بہت بڑے اعتراض کا جواب دیا ہے۔ پوری دنیائے یورپ قوم کہتی ہے کہ مسلمان ”عورت“ کے حقوق کا خیال نہیں کرتے اللہ نے قرآن کریم میں پوری سورۃ عورتوں کے نام سے اتاری ہے۔ مرد کے نام سے کوئی سورۃ نازل نہیں فرمائی اس سے زیادہ حقوق کا کیا خیال کیا جاسکتا ہے؟ پوری سورۃ نازل فرمائی ہے تقریبا ڈیڑھ پارے کی اور اس سورۃ کا نام ہی سورۃ نساء ہے یعنی سورۃ کا نام ہی عورتوں کے نام سے ہے اس میں حقوق بیان فرمائے، مسائل بیان فرمائے اور اس میں زیادہ تر مسائل وہ ہیں کہ جن کا تعلق گھریلو زندگی کے ساتھ اور معاشرتی زندگی کے ساتھ ہے۔

اس سورہ مبارکہ کا نام سورۃ النساء ہے۔ سورہ بقرہ اور آل عمران کی طرح یہ بھی لمبی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے طویل ترین سورہ بقرہ ہے، پھر آل عمران اور اس کے بعد سورہ نساء کا نمبر ہے اس کی ایک سو چھتر آیتیں اور، 24 رکوع، 3940 کلمات اور 16030 حروف ہیں۔ جیسا کہ اس سورہ مبارکہ کے نام سے ظاہر ہے، اس میں عورتوں کے متعلق بہت سے احکام ہیں۔ تاہم اس سورہ میں اس کے علاوہ بھی بہت سے احکام اور حکمتیں بیان ہوئی ہیں۔ عیسائی اور ہندو عورت کو وراثت کا حق دار نہیں مانتے۔ برخلاف اس کے اسلام نے عورت کو وراثت میں حصہ دیا ہے۔ چنانچہ اس سورہ مبارکہ میں وراثت کے بہت سے احکام بیان ہوئے ہیں۔ اس سورہ مبارکہ میں معاشرتی احکام بھی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں عالمی قوانین کا ذکر بھی ہے۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے عبادات کی تفصیلات بھی بیان فرمائی ہیں چنانچہ مبادی عبادات سے لے کر تیمم، جنابت، غسل، نماز وغیرہ کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ
وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۱ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا
تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا
كَبِيْرًا ۲

اجتماعی احکام میں اہم ترین حکم تقویٰ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ	اے لوگو!	اتَّقُوْا	تم ڈرو
رَبَّكُمُ	اپنے رب سے	الَّذِيْ	وہ جس نے
خَلَقَكُمْ	تمہیں پیدا کیا	مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ	ایک جان سے

فرمایا يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔ یعنی پوری نوع انسانی حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "(قیامت کے دن) لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور کہیں گے، اے آدم! آپ انسانوں کے باپ ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔" [بخاری،] ایک جان سے مراد ابو البشر سیدنا حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ انہی سے آپ کی بیوی سیدہ حوا کو پیدا کیا گیا۔ تقریباً چار ہزار زبانیں بولنے والے کالے گورے، سرخ، گندمی غرضیکہ اس دنیا میں جتنے بھی انسان موجود ہیں۔ ان سب کی ابتدا حضرت آدم (علیہ السلام) سے ہوئی۔ سب آدم اور حوا علیہما السلام کی اولاد ہیں اور حضرت آدم ہی سب کا ملجا ہے، (مَلْجَأ ایک اسم ہے جس کے لغوی معنی پناہ گاہ، جائے پناہ، ٹھکانہ، اور سہارا کے ہیں) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس ایک ذات سے تمام مردوں اور عورتوں کو پھیلایا ہے۔

وَّخَلَقَ	اور اس نے پیدا کیا	مِنْهَا	اسی سے
زَوْجَهَا	اس کا جوڑا	وَبَثَّ	اور اس نے پھیلائے

مِنْهُمَا	ان دونوں سے	رِجَالًا	مرد
كَثِيْرًا	کثرت سے	وَّنِسَآءً ۚ	اور عورتیں
وَاتَّقُوا اللّٰهَ	اور تم اللہ سے ڈرو	الَّذِيْ	وہ کہ
تَسَآءَلُوْنَ	تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو	بِهٖ	اس کے واسطے سے
وَالْاَرْحَامَ	اور (ڈرو تم) رشتوں (کے توڑنے) سے	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	بلاشبہ اللہ ہے
عَلَيْكُمْ	تم پر	رَقِيْبًا ①	نگہبان (۱)

تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ : یعنی جس اللہ کا نام لے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اس اللہ سے ڈرو۔ "وَالْاَرْحَامَ" اس کا عطف لفظ "اللہ" پر ہے، یعنی "وَاتَّقُوا الْاَرْحَامَ" کہ قطع رحمی اور رشتہ داروں کے ساتھ بدسلوکی سے بچو۔ "الْاَرْحَامِ" کو میم کے کسرہ سے پڑھنا غلط ہے اور قواعد نحویہ کی رو سے بھی ٹھیک نہیں، ہاں معنی کے اعتبار سے صحیح ہے، یعنی جس رشتہ داری کے نام پر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ (قرطبی)

سورہ کی ابتداء اللہ تعالیٰ نے اجتماعی احکام سے کی ہے۔ اور اجتماعی احکام میں اہم ترین حکم تقویٰ ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا۔ تقویٰ اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور اس کے ساتھ عدل، احسان تعظیم شعائر اللہ اور تنظیم شعائر اللہ بھی آتے ہیں۔ تقویٰ اختیار کرنے سے تمہارے اندر حقوق کی ادائیگی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اور پھر تم عدل واحسان پر کاربند ہو جاؤ گے۔ شرعی حدود کی پابندی کرنے لگو گے اور یہ سب کچھ خوف خدا کا ثمرہ ہوگا جس کے متعلق فرمایا کہ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈر جاؤ۔ اور اس آیت میں فرمایا جا رہا ہے کہ ہمارا پیدا کرنے والا اللہ ہے جس نے حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا کے ذریعے سے دنیا میں اتنی زیادہ خلقت پیدا کی اور یہ بتا دیا کہ عورت و مرد برابر کے انسان ہیں کوئی بھی بے کار نہیں۔ یہ طریقہ اللہ رب العزت کا اپنا ہی ہے پھر پیدا کرنے کے بعد رزق بھی وہ خود ہی دیتا ہے۔ انسان کو حکم

دیتا ہے کہ آپس کے بھائی چارے کو مضبوط رکھو، رب سے ڈرو، کوئی غلط کام نہ کرو۔ کیونکہ ہر کام کو اللہ رب العزت دیکھ رہا ہے، نیکی کی راہوں پر چلنا چاہئے، تاکہ دنیا میں اور آخرت میں نجات حاصل ہو سکے۔ حدیث ہے "جو شخص اللہ کے خوف سے رویا ہو وہ آگ میں داخل نہ ہو گا"۔ (ترمذی)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو تمام روئے زمین کی مٹی سے پیدا کیا۔ فرشتے کو حکم ہوا کہ روئے زمین کی مٹی کو سمیٹ لو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پھر اس سے خمیر بنایا گیا، اسے گوندھا گیا اور اس سے آدم (علیہ السلام) کا مجسمہ تیار کیا گیا۔ پھر اس میں اللہ نے روح پھونکی جس کی تفصیل قرآن پاک میں موجود ہے۔ جس طرح زمین کے مختلف حصوں کی مٹی مختلف ہے کوئی سخت، کوئی نرم، کوئی سرخ، کوئی سفید کوئی ریتلی اور کوئی چکنی اسی طرح نسل انسانی کے افراد کے مزاج بھی مختلف ہیں، کوئی نرم مزاج، کوئی سخت مزاج، کوئی طیب اور کوئی خبیث غرض یہ کہ مٹی کا اثر کسی نہ کسی صورت میں ہر انسان میں ظاہر ہوتا ہے۔

فرمایا وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کا جوڑا حضرت حوا علیہا السلام کو ان کی پسلی سے پیدا کیا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کی ایک پسلی کو ان سے الگ کیا گیا جس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی ایک پسلی کم ہو گئی یا ویسی کی ویسی ہی رہی پسلی کا بالکل علیحدہ ہو جانا بھی ضروری نہیں کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کی مٹی لے کر آدم (علیہ السلام) کا پتلا بنایا اور زمین میں کوئی چیز کم نہیں ہوئی، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ حضرت حوا ؓ کو آدم (علیہ السلام) کی پسلی سے نکالنے کے باوجود اس پسلی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی ہو۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ایک ہی جان یعنی آدم (علیہ السلام) سے ان کا جوڑا یعنی صنف نازک کو تیار کر کے ان میں خاوند بیوی کا رشتہ قائم کر دیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ انسان کی پسلیاں ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ اور خصوصاً بالائی حصے کی پسلیاں زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ چونکہ حضرت حوا علیہا السلام پسلی سے نکالی گئیں اس لیے ہر عورت میں

ایک قسم کی فطری کمی پائی جاتی ہے۔آپ نے فرمایا اس ٹیڑھا پن کو ذہن میں رکھتے ہوئے عورت کے ساتھ نباہ کرو۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور رشتے ناطے توڑنے سے بھی۔تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ عورت کے اس ٹیڑھا پن کو کسی حد تک برداشت کرو فرمایا اگر تم اس کے ٹیڑھا پن کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی یعنی تم سے طلاق دے کر علیحدہ کر دو گے،لہٰذا اس کی کجی کو برداشت کرتے ہوئے اس سے نباہ کرو۔فرمایا مسئلہ انفرادی ہو یا اجتماعی احکام کا ہو،عبادت یا معاشرت کا معاملہ ہو،ہر صورت میں اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ① بیشک اللہ تعالیٰ تمہارا نگران ہے۔وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے کوئی اچھا کام کرو یا برا اس کی نگرانی ہر حالت میں قائم ہے۔لہٰذا محتاط رہو۔حقوق کو ادا کرتے رہو۔تقویٰ اختیار اور برائی سے بچتے رہو تاکہ آخرت کی ندامت سے بچ جاؤ۔

یتیم کس بچے کو کہتے ہیں؟ اور اس کے احکام

وَاٰتُوا	اور تم دو	الْیَتٰمٰۤى	یتیموں کو
اَمْوَالَهُمْ	ان کے مال	وَلَا	اور نہ
تَتَبَدَّلُوا	تم بدل کرلو	الْخَبِیْثَ	ناپاک کو
بِالطَّیِّبِ۪	پاک کے عوض	وَلَا	اور نہ
تَاْكُلُوْۤا	تم کھاؤ	اَمْوَالَهُمْ	ان کے مال
اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ	اپنے مالوں کے ساتھ (مل کر)	اِنَّهٗ كَانَ	بلاشبہ یہ ہے
حُوْبًا	گناہ	كَبِیْرًا ②	بہت بڑا (۲)

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ یتیم جب بالغ اور باشعور ہو جائیں تو ان کا مال ان کے سپرد کر دو۔یتامیٰ یتیم کی جمع ہے۔اور اس کا معنی ہے الگ ہونے والا صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ عربی محاورہ ہے،اصطلاح اور زبان کے مطابق جس کا باپ مرجائے وہ سن بلوغت تک یتیم کہلاتا

ہے جب لڑکا، لڑکی بالغ ہو جائیں تو وہ یتیم کی فہرست سے نکل جاتے ہیں۔

وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ خبیث سے گھٹیا چیزیں اور طیب سے عمدہ چیزیں مراد ہیں یعنی ایسا نہ کرو کہ ان کے مال سے اچھی چیزیں لے لو اور محض گنتی پوری کرنے کے لئے گھٹیا چیزیں ان کے بدلے میں رکھ دو۔"اور بدل نہ لو خبیث مال کو" خبیث سے مراد ناحق یتیم کا مال کھانا ہے (بالطیب) طیب مال سے مراد حلال مال ہے۔ خبیث کو طیب سے بدلنا یہ ہے کہ یتیم کا سرپرست یتیم کا نفیس مال خود رکھ لے اور اس کے بدلے میں اپنا گھٹیا مال یتیم کو دے دے۔ اس میں اس بات کا بھی حکم ہے کہ یتیم کے مال کی اصلاح کی جائے کیونکہ یتیم کو اس کا پورا مال حوالے کرنے کے حکم میں از خود یہ بات آجاتی ہے کہ اس مال کی حفاظت کی جائے اس کی اصلاح اور نشو ونما کا انتظام کیا جائے اور اس کو تلف ہونے کے خطرات سے بچایا جائے۔ طیب اور خبیث حلال اور حرام کے معنی میں بھی آتے ہیں، اس لیے بعض نے یہ معنی کیا ہے کہ اپنا حلال مال چھوڑ کر دوسرے کا مال مت کھاؤ جو تمہارے لیے حرام ہے۔" آیت میں "الیٰ" بمعنی "مَع" ہے، یعنی ان کے اموال کو ناجائز طریقے سے کھانے کے لیے اپنے مالوں کے ساتھ مت ملاؤ، ایسا کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ ہاں، اصلاح کی نیت سے ملانا جائز ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ اِلٰى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا اور اپنے مالوں کے ساتھ ان کے مال ملا کر کھا نہ جاؤ، بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ان گھٹیا چیزوں کو خبیث (ناپاک) اور عمدہ چیزوں کو طیب (پاک) سے تعبیر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ اس طرح بدلایا گیا مال، جو اگرچہ اصل میں تو طیب (پاک اور حلال) ہے لیکن تمہاری اس بد دیانتی نے اس میں خباثت داخل کر دی اور وہ اب طیب نہیں رہا، بلکہ تمہارے حق میں وہ خبیث (ناپاک اور حرام) ہو گیا۔ اسی طرح بد دیانتی سے ان کا مال اپنے مال میں ملا کر کھانا بھی ممنوع ہے ورنہ اگر مقصد خیر خواہی ہو تو ان کے مال کو اپنے مال میں ملانا جائز ہے۔

اس آیت میں پہلا حکم یہ ہے کہ جو یتیم بچے ہیں جن کے باپ فوت ہو گئے ہیں جو ان کی کفالت کیا کرتے تھے۔ وہ بہت چھوٹے اور نہایت کمزور ہیں اپنے مصالح کی خود دیکھ بھال نہیں

کر سکتے ۔ بنابریں اللہ رؤف ورحیم نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ان یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کریں ۔ ان کے مال کے قریب نہ جائیں مگر بھلے طریقے سے اور جب یہ بالغ اور سمجھ دار ہو جائیں تو ان کا پورے کا پورا مال ان کے حوالے کر دیں ۔ معاشرتی قباحتوں میں سے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے حقوق کی طرف توجہ دلائی ۔ یتیم کی پرورش کرنا بہت بڑی نیکی ہے ۔ چنانچہ آپ نے فرمایا میں اور یتیم کا سرپرست جنت میں اس طرح ہوں گے ۔ پھر آپ نے اپنی شہادت کی اور درمیانی انگلی ذرا کھول کر اشارہ کیا ۔ (بخاری) تاکید کی جا رہی ہے کہ یتیم کے مال میں پوری طرح امانت داری اختیار کرو ۔ کسی صورت میں بھی خیانت نہ کرو ۔ یہ مت سمجھو کہ وہ معصوم کیا جانے؟ اللہ تو نیتوں کو جانتا ہے اس لیے جیسے ہی یتیم بالغ ہو جائے پورے انصاف سے اس کو اس کے مال سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ بتاؤ اور اس کی پوری طرح مدد کرو کہ اس کا نقصان نہ ہو جائے ۔ بہرحال یتیموں کی پرورش شخصی فرض بھی ہے اور اجتماعی بھی ۔ معاشرے کے کمزور طبقات اسی مد میں آتے ہیں ۔ غریبوں، مسکینوں اور کمزوروں کو ان کا حق ادا کرنا اجتماعی ذمہ داری ہے کسی مزدور یا کسان کا حق غصب کرنا قطعی حرام ہے ۔ ہر کارخانے دار اور زمیندار پر لازم ہے کہ وہ اپنے کارندوں کے حقوق کی حفاظت کرے ۔ حضور ﷺ نے فرمایا فَأَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو ۔ یہ ہمارے دین کا اہم اصول ہے ۔ آج کل بڑے بڑے ادارے یتیموں اور مسکینوں کے نام پر فنڈ اکٹھا کر کے کھا جاتے ہیں الا ماشاء اللہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے ۔ ہر حق دار کو اس کا حق ملنا چاہیے جو رقم جس مقصد کے لیے اکٹھی ہوئی ہے ۔ اسی پر خرچ ہونی چاہیے ۔ الغرض ! فرمایا یتیموں کے مال کو بدنیتی سے کھانا بہت بڑا گناہ ہے تمہارے لیے یہ خبیث مال ہے اور قطعی حرام ہے ۔

یتیم لڑکیوں سے ناانصافی / چار عورتوں سے نکاح / اسلام کے خلاف پروپیگنڈا

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى
وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ
اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ③

مہر اور نفقات میں انصاف کا حکم

وَاِنْ خِفْتُمْ	اور اگر تم ڈرو	اَلَّا	(اس سے) کہ نہ
تُقْسِطُوْا	تم انصاف کرسکو گے	فِي الْيَتٰمٰى	یتیم عورتوں کے بارے میں
فَانْكِحُوْا	تو (ان کی بجائے) تم نکاح کرو	مَا طَابَ	ان سے جو اچھی لگیں
لَكُمْ	تمہیں	مِّنَ النِّسَآءِ	عورتوں سے
مَثْنٰى	دو دو	وَثُلٰثَ	اور تین تین
وَرُبٰعَ ۚ	اور چار چار	فَاِنْ خِفْتُمْ	پھر اگر تم ڈرو
اَلَّا	اس بات سے کہ نہ	تَعْدِلُوْا	تم انصاف کرسکو گے

فَوَاحِدَةً	تو (نکاح کرو) ایک ہی سے	اَوْ مَا مَلَكَتْ	یا جس کے مالک ہوئے
اَيْمَانُكُمْ ؕ	تمہارے دائیں ہاتھ	ذٰلِكَ اَدْنٰۤى	یہ زیادہ قریب ہے
اَلَّا	اس کے کہ نہ	تَعُوْلُوْا ③	ناانصافی کرو تم (۳)

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا: اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے۔ اس کی تفسیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح مروی ہے کہ صاحب حیثیت اور صاحب جمال یتیم لڑکی کسی ولی کے زیر پرورش ہوتی تو وہ اس کے مال اور حسن و جمال کی وجہ سے اس سے شادی تو کر لیتا لیکن اس کو دوسری عورتوں کی طرح پورا حق مہر نہ دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظلم سے روکا، کہ اگر تم گھر کی یتیم بچیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تو تم ان سے نکاح ہی مت کرو، اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کے جواب میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "بعض یتیم لڑکیاں کچھ لوگوں کی پرورش میں ہوتیں، وہ ان لڑکیوں کے مال اور جمال کی وجہ سے ان سے نکاح کر لیتے، لیکن انھیں اپنے گھر کی لڑکیاں سمجھ کر پرائے گھر کی لڑکیوں جیسا نہ تو مہر دیتے اور نہ ان کے دوسرے حقوق ویسے ادا کرتے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انھیں ایسا کرنے سے منع فرمایا کہ اگر تم یتیم لڑکیوں سے ان کے مہر اور نفقات میں انصاف نہیں کر سکتے تو ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے، جو تمہیں پسند ہوں نکاح کر لو۔ (بخاری، التفسیر، باب:)

مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ تو اور عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے۔ تمہارے لئے دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کا راستہ کھلا ہے اس آیت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور علماء نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے لیے بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں اپنے حرم میں رکھنا جائز نہیں، یہ صرف رسول اللہ ﷺ کا خاصہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سنت سے بصراحت یہ مسئلہ ثابت ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ شافعی نے جو فرمایا، اس پر علماء کا اجماع ہے۔ غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ جب

مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "ان میں سے چار کا انتخاب کرلو۔" [أحمد: 2/ 14، ح: 4630۔ ابن ماجہ، النکاح،]

زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں انصاف کا اہتمام

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ذٰلِكَ اَدۡنٰٓى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا لیکن اگر تمہیں برابری نہ کرسکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی [1] یہ زیادہ قریب ہے، کہ (ایسا کرنے سے ناانصافی اور) ایک طرف جھک پڑنے سے بچ جاؤ۔ بشرطیکہ ان کے درمیان انصاف کے تقاضے پورے کرسکو، ورنہ ایک سے ہی نکاح کرو یا اس کے بجائے لونڈی پر گزارا کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان مرد (اگر وہ ضرورت مند ہے) تو چار عورتیں بیک وقت اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں، جیسا کہ صحیح احادیث میں اس کی مزید صراحت اور تحدید کردی گئی ہے۔ نبی کریم (ﷺ) نے جو چار سے زائد شادیاں کیں وہ آپ (ﷺ) کے خصائص میں سے ہے، جس پر کسی امتی کے لئے عمل کرنا جائز نہیں۔ (ابن کثیر) یعنی ایک ہی عورت سے شادی کرنا کافی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں انصاف کا اہتمام بہت مشکل ہے، جس کی طرف قلبی میلان زیادہ ہوگا، ضروریات زندگی کا فراہمی میں زیادہ توجہ بھی اسی کی طرف ہوگی۔ یوں بیویوں کے درمیان وہ انصاف کرنے میں ناکام رہے گا اور اللہ کے ہاں مجرم قرار پائے گا۔ قرآن نے اس حقیقت کو دوسرے مقام پر نہایت بلیغانہ انداز میں اس طرح بیان فرمایا ہے وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ (سورۃ النساء: 129) "اور تم ہرگز اس بات کی طاقت نہ رکھو کہ بیویوں کے درمیان انصاف کرسکو، اگرچہ تم اس کا اہتمام کرو۔ (اس لئے اتنا کرو) کہ ایک ہی طرف نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیویوں کو بیچ ادھڑ میں لٹکا رکھو"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ شادی کرنا اور بیویوں کے ساتھ انصاف نہ کرنا نامناسب اور نہایت خطرناک ہے۔

یعنی اگر کسی کو خوف ہے کہ وہ اتنا عدل بھی نہیں کرسکتا جتنا واجب ہے کہ رات رہنے اور نان ونفقہ

میں بھی برابری نہیں کر سکتا، کیونکہ دلی محبت اور میلان وصحبت میں تو برابری ممکن ہی نہیں، عدل سے مراد سلوک و برتاؤ میں عدل ہے، دل کا جھکاؤ اگر کسی کی طرف بڑھ جائے؛ لیکن عملی رویہ اس سے متاثر نہ ہو، تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ دل کی رغبت اور میلان انسان کے دائرۂ اختیار میں نہیں، خود رسول اللہ ﷺ کے ایک ارشاد میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: خداوندا! میرا یہ فعل (عدل وانصاف) ان چیزوں میں ہے، جن کا میں مالک ہوں؛ لہٰذا ایسی باتوں کے بارے میں میری پکڑ نہ فرمائیے، جس پر آپ کا اختیار ہے، میرا اختیار نہیں۔ (نسائی، تو ایک بیوی رکھے یا لونڈیاں، یہ زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔ بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "یہ زیادہ قریب ہے کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہو جائیں اور تم فقیر نہ ہو جاؤ" اور پھر اس پر برتھ کنٹرول کی بنیاد رکھ دی ہے کہ بچے کم پیدا کرو۔ حالانکہ بچے تو لونڈیوں سے بھی پیدا ہوتے ہیں اور لونڈیوں کی تعداد بھی مقرر نہیں اور رسول اللہ ﷺ نے زیادہ بچے پیدا کرنے کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: "ان عورتوں سے نکاح کرو جو بہت بچے جننے والی اور بہت محبت کرنے والی ہوں، کیونکہ میں (قیامت کے دن) تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔" [أبو داؤد،)

"اَلَّا تَعُوْلُوْا" کا معنی

"اَلَّا تَعُوْلُوْا" کا معنی خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: "یہ زیادہ قریب ہے کہ تم ظلم نہ کرو، انصاف سے نہ ہٹو۔" [ابن حبان: 4029، عن ابن عباس ؓ] اس آیت میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ اگر کوئی یتیم بچی تمہاری ذمہ داری میں ہو تو تم انصاف سے کام لیتے ہوئے نیک نیتی سے اس سے نکاح کر لو لیکن اگر سمجھتے ہو کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو پھر نکاح نہ کرو دوسرا نکتہ جو اس آیت میں اٹھایا گیا ہے وہ ہے بیویوں کی تعداد کا ایک تو اس زمانے میں لوگ بیشمار بیویاں رکھتے تھے تو اس وجہ سے دو، تین یا چار کی اجازت دی گئی، تاکہ لوگ گناہ نہ کریں، یعنی بغیر نکاح کے عورتوں سے تعلقات نہ رکھیں۔ چار کی اجازت دینے پر بھی ایک سخت شرط رکھ دی کہ اگر تم ان سے برابری کا سلوک نہ کر سکو تو پھر ایک بیوی دو یا تین سے بہتر ہے۔ غرض جس قدر انصاف تم کر سکتے ہو اتنی ہی

بیویاں رکھو یا پھر ایک بیوی اور جو لونڈی تمہاری ملکیت میں ہے اس پر گزارہ کرلو یہ حکم اس وقت کا ہے جب لونڈی اور غلام کا رواج تھا۔ بہرحال اس آیت میں تاکید یہی کی گئی ہے کہ کبھی بھی کسی بھی صورت سے بیوی کے ساتھ زیادتی یا بے انصافی نہیں ہونی چاہئے۔ بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کی اجازت کو اللہ تعالیٰ نے انصاف کے ساتھ مشروط فرمایا ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہو کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی صورت میں تم تمام بیویوں سے انصاف نہ کرسکو گے۔ فَوَاحِدَةً تو پھر تمہارے لیے ایک بیوی ہی کافی ہے، دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر نکاح کرنا ہے تو پھر اس کے تمام تقاضے منجملہ انصاف، مہر اور حسن معاشرت وغیرہ پورے کرنا ہوں گے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان امتی کے لیے بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کی اجازت فرمادی بشرطیکہ ایسا شخص بیویوں کے درمیان انصاف کرسکے۔ مثال کے طور پر مکان، لباس، خوراک، مہر، لین دین، شب باشی وغیرہ میں مساوات کا قیام ضروری ہے۔ البتہ دلی رغبت کسی ایک طرف ہونا یہ غیر اختیاری چیز ہے۔ اور مباح ہے۔ اور اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ بیویاں رکھ کر ان کے ساتھ انصاف نہیں کریگا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ایسے شخص کا آدھا جسم فالج زدہ ہوگا اور وہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا۔

اسلام نے چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دے کر اس اباحت کو چار تک گویا محدود کردیا ہے۔ کوئی مومن بیک وقت چار سے زیادہ نکاح نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر کوئی بیوی فوت ہوگئی یا طلاق واقع ہوگئی تو اس کی بجائے اور نکاح کرسکتا ہے مگر بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ چار تک تحدید نکاح صرف امتی مسلمان کے لیے ہے۔ پیغمبر (علیہ السلام) کی ذات اس تحدید سے مستثنیٰ ہے یہ نبی کی خصوصیت ہے جسے اللہ نے سورہ احزاب میں واضح فرمادیا ہے۔ نبی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے، اس پر کوئی پابندی نہیں۔ اور یہ اجازت ہر نبی کی شریعت میں موجود رہی ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی

دو بیویاں تھیں۔حضرت نوح (علیہ السلام)،حضرت سلیمان (علیہ السلام)،حضرت داؤد (علیہ السلام) وغیرہ کی متعدد بیویاں تھیں اوراسی طرح نبی آخر الزمان ﷺ نے اپنی زندگی میں کل پندرہ نکاح کیے۔تاہم ایک وقت میں آپ ﷺ کی زیادہ سے زیادہ نو بیویاں تھیں۔مقصد یہ کہ نبی پر چار نکاح کی پابندی نہیں ہے۔مغربی اقوام نے مسلمانوں اوراسلام کے خلاف پروپیگنڈا کے ہتھیار کو موثر طور پر استعمال کیا ہے۔جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام کی ترقی کو روکنے کے لیے اور حربہ کارگر ثابت نہیں ہو رہا ہے تو انہوں نے اسلام کے مختلف مسائل کو بہانہ بنا کر اس کے خلاف پروپیگنڈا کی مہم کو تیز تر کردیا۔اس سلسلہ میں انہوں نے اسلام کے مسئلہ تعداد ازواج کو سب سے زیادہ اچھالا۔اور یہ پروپیگنڈا کیا کہ مسلمان عیاش ہیں،رشوت پرست ہیں ان کا اسلام ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔حالانکہ بات سیدھی سادھی ہے،اسلام نے تعداد ازواج کو کوئی فرض واجب قرار نہیں دیا بلکہ محض اجازت دی ہے اور وہ بھی مشروط یعنی اگر کوئی شخص جسمانی اور مالی لحاظ سے اس قدر مضبوط ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے اور پھر ان کے درمیان انصاف بھی کرسکتا ہے تو اسے اجازت ہے،لازم نہیں ہے۔انگریز جرمن اور فرانسیسی اور دنیا بھر کے یہودیوں نے تعداد ازواج کے مسئلہ میں پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی ذات کو خاص طور پر اپنے طعن کا نشانہ بنایا۔اور یہاں تک پروپیگنڈا کیا کہ مسلمانوں کا پیغمبر (نعوذ باللہ) عیاش تھا۔اس نے اپنے حرم میں بہت سی بیویاں رکھی ہوئی تھیں۔اور ہمارے نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں تحدید نکاح سے مستثنیٰ قرار دیدیا۔جہاں تک (نعوذ باللہ) عیاشی کا تعلق ہے آپ کی پوری زندگی اس الزام کے خلاف بطور شہادت موجود ہے آپ (علیہ السلام) کی تمام بیویوں میں سے ایک کے سوا کوئی بھی دوشیزہ نہیں تھی۔ ساری بیویاں معمر اور بیوہ تھیں۔کسی کا ایک خاوند فوت ہو چکا تھا اور کسی کے دو خاوند پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی زندگی کا پچیس سے پچاس سالہ دور جو شباب کا دور کہلاتا ہے اپنے سے پندرہ سال بڑی ایک بیوہ عورت کے ساتھ گزار دیا۔جب تک آپ ﷺ کی پہلی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں آپ ﷺ نے دوسرا نکاح نہیں کیا۔تو کیا آپ ﷺ کو بڑھاپے میں زیادہ بیویاں کرکے نفسانی خواہش

کی تکمیل مقصود تھی؟ ہرگز نہیں۔آپ کا تعدد ازواج محض اسلام کی ترویج وترقی کی خاطر تھا۔اسلام کو گھر گھر پہنچانا تھا۔لہٰذا آپ ﷺ نے مختلف قبائل سے رِشْتَۂِ اِزْدِوا ج قائم کر کے تبلیغ اسلام کا اہم فریضہ ادا کیا۔(ازواج اور ازدواج دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں جو اردو میں استعمال ہوتے ہیں، لیکن ان کے معنی اور گرامر میں واضح فرق ہے: 1.ازواج کا معنی: یہ لفظ" زوج" (جوڑا، شریکِ حیات) کی جمع ہے۔اردو اور عربی میں اس کا اطلاق عام طور پر بیویوں یا شریکِ حیات پر ہوتا ہے (جیسے ازواجِ مطہرات یعنی آپ ﷺ کی مقدس بیویاں۔ازدواج کا معنی: اس کا لغوی معنی جڑنا، ملاپ، جوڑا بننا یا نکاح کرنا ہے۔اسی سے" ازدواجی زندگی" کا لفظ بنتا ہے جس کا مطلب شادی شدہ زندگی ہے۔گرامر: یہ مصدر ہے (شادی کرنے یا رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا عمل)

اسلام نے چار تک نکاح کی اجازت دی ہے اور دنیا کے تمام ہی مذاہب میں تعدد ازواج کی اجازت منقول ہے، بائبل میں حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان حضرت ابراہیم علیہم السلام اور متعدد پیغمبروں کی ایک سے زیادہ بیویوں کا ذکر موجود ہے، ہندو مذہب میں شری رام جی کے والد کی ایک سے زیادہ بیوی کا ذکر ملتا ہے اور شری کرشن جی کی تو سینکڑوں بیویوں کا ذکر ملتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں جہاں کہیں قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک سے زیادہ نکاح کی ممانعت کی گئی ہے وہاں غیر قانونی تعدد ازواج کا ایسا طوفان اٹھا ہے کہ شاید شیطان بھی ان کو دیکھ کر شرماتا ہوگا، موجودہ دور کا مغربی سماج اس کی کھلی ہوئی مثال ہے؛ اس لئے اسلام نے مردانہ فطرت کی رعایت کرتے ہوئے اس کی گنجائش رکھی ہے؛ لیکن اس کو نہ واجب وضروری قرار دیا ہے، نہ مستحب ومرغوب، اور اس میں بھی یہ شرط عائد کی ہے کہ ایک سے زیادہ نکاح سنجیدہ جذبہ کے تحت کیا جائے، پہلی بیوی کو ضرر پہنچانا مقصود نہ ہو۔ایک سے زیادہ بیویوں کو مذموم فعل سمجھنے کے اس مغربی تخیل کی بنیادیں دو ہیں: پہلی بنیاد فحاشی، بدکاری، داشتائیں رکھنے کی عام اجازت اور جنسی آوارگی ہے جسے مغرب میں مذموم فعل کی بجائے عین جائز بلکہ مستحسن فعل سمجھا جاتا ہے۔اور دوسری بنیاد مادیت پرستی ہے۔جس میں ہر شخص یہ تو چاہتا ہے کہ اس کا معیار زندگی بلند ہو اور اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلائے مگر ان باتوں پر چونکہ بے پناہ اخراجات اٹھتے ہیں جو ہر انسان پورے نہیں کرسکتا، لہٰذا

وہ اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ اس کے ہاں اولاد ہی نہ ہو یا کم سے کم ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا معاشرہ تو ایک بیوی بھی بمشکل برداشت کرتا ہے اور وہ بہتر یہی سمجھتا ہے کہ بیوی ایک بھی نہ ہو اور سفاح یا بدکاری سے ہی کام چلتا رہے۔ (سفاح کا معنی ومفہوم: لفظ "سِفاح" کے عربی لغت میں دو بنیادی معنی ہیں: زنا اور بدکاری۔ پوشیدہ طور پر یا بغیر نکاح کے جنسی تعلق قائم کرنا دوسرا معنی خون ریزی، خون بہانا یا قتل وغارت کرنا) لیکن اسلام سب سے زیادہ زور ہی مرد اور عورت کی عفت پر دیتا ہے اور ہر طرح کی فحاشی کو مذموم فعل قرار دیتا ہے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کی بجائے سادہ زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے اسی لیے اس نے اقتضاءات اور حالات کے مطابق چار بیویوں تک کی اجازت دی ہے۔ اب بتائیے کہ اس مغربی تخیل اور اسلامی تخیل میں مطابقت کی کوئی صورت پیدا کی جاسکتی ہے؟

جو راستہ اسلام نے اختیار کیا ہے کہ شہوانی جذبہ چونکہ فطری جذبہ ہے لہٰذا اسے روکنا غیر فطری بات ہے۔ تاہم اسے ایسا بے لگام بھی نہیں چھوڑا گیا جس سے معاشرتی بنیادوں کے انجر پنجر ہی ہل جائیں بلکہ اسے نکاح کی شرائط سے پابند بنا دیا گیا ہے۔ اور یہ بات تو ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ شہوانی ہیجان مرد میں اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات ایک بیوی اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لہٰذا فحاشی اور بے حیائی سے اجتناب کے لیے تعدد ازواج ضروری تھا اور یہی راستہ فطری اور اسلامی ہے اور اسی راستہ کو اکثر انبیائے کرام علیہم السلام نے اختیار کیا ہے جو مختلف ادوار میں انسانی معاشرہ کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ اور اس سے ان لوگوں کے نظریہ کی تردید بھی ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں اصل حکم صرف ایک عورت سے نکاح کا ہے۔ فطرت کے اعتبار سے انسان تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ادنی درجے کے لوگ جن کی قوت باہ معمولی قسم کی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ ایک بیوی پر اکتفا کرتے ہیں۔ درمیانی قوت کے مالک لوگ دوسری بیوی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اگر وہ دوسرا نکاح نہ کریں تو گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے لہٰذا ایسے لوگوں کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت ہے اور اگر کوئی شخص جسمانی اور مالی اعلیٰ درجے کی طاقت رکھتا ہے حق وانصاف کے تقاضے پورے کرسکتا ہے تو پھر اسے چار عورتوں تک سے نکاح کی اجازت ہے تاکہ وہ اپنی فطری خواہش کی تکمیل

شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے کر سکے۔ بہر حال بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کی اجازت کو اللہ تعالیٰ نے انصاف کے ساتھ مشروط فرمایا ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہو کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی صورت میں تم تمام بیویوں سے انصاف نہ کر سکو گے فَوَاحِدَةً تو پھر تمہارے لیے ایک بیوی ہی کافی ہے، دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مہر کی اہمیت فضائل و مسائل/ اِسلام میں یتیموں کے حقوق

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِہِنَّ نِحۡلَۃً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَکُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡہُ نَفۡسًا فَکُلُوۡہُ
ہَنِیۡٓـئًا مَّرِیۡٓـئًا ۴ وَ لَا تُؤۡتُوا السُّفَہَآءَ اَمۡوَالَکُمُ الَّتِیۡ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ قِیٰمًا
وَّ ارۡزُقُوۡہُمۡ فِیۡہَا وَ اکۡسُوۡہُمۡ وَ قُوۡلُوۡا لَہُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۵ وَ ابۡتَلُوا الۡیَتٰمٰی حَتّٰۤی
اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۚ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡہُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ اَمۡوَالَہُمۡ ۚ وَ لَا
تَاۡکُلُوۡہَاۤ اِسۡرَافًا وَّ بِدَارًا اَنۡ یَّکۡبَرُوۡا ؕ وَ مَنۡ کَانَ غَنِیًّا فَلۡیَسۡتَعۡفِفۡ ۚ وَ مَنۡ
کَانَ فَقِیۡرًا فَلۡیَاۡکُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَیۡہِمۡ اَمۡوَالَہُمۡ فَاَشۡہِدُوۡا
عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیۡبًا ۶

عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دیا کرو

وَاٰتُوا	اور دو تم	النِّسَآءَ	عورتوں کو
صَدُقٰتِہِنَّ	ان کے مہر	نِحۡلَۃً ؕ	خوش دلی سے
فَاِنۡ طِبۡنَ	پھر اگر وہ خوشی سے دیں	لَکُمۡ	تم کو
عَنۡ شَیۡءٍ	کچھ	مِّنۡہُ	اس میں سے
نَفۡسًا	دل سے	فَکُلُوۡہُ	تو تم کھالو اسے

هَنِيٓـًٔا	رچتا	مَّرِيٓـًٔا ۴	پچتا(۴)

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۴ اورعورتوں کوان کے مہر راضی خوشی دے دو، ہاں اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے شوق سے خوش ہو کر کھالو۔یعنی اگر عورتیں تمہیں کسی چیز سے خوش کر دیں۔اپنی خوشی سے مقرر مہر میں سے آدھا، چوتھائی دوتہائی یا کم وبیش معاف کر دیں تو یہ تمہارے لیے جائز ہے۔عورت کو حق حاصل ہے کہ چاہے تو سارے کا سارا مہر بھی خاوند کو ہبہ کر دے اس کو ابراء کہتے ہیں۔ مگر عورت کو معاف کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔اس طرح آپ دنیوی قانون سے تو بچ سکتے ہیں مگر اللہ کے ہاں معاف نہیں ہو گا اس معاملہ میں عورت پر نہ دباؤ ڈالنا چاہیے اور نہ اسے الجھانا چاہیے وہ ازخود سارا یا کچھ حصہ معاف کر دے تو اس صورت میں فرمایا فَكُلُوْهُ پس اس کو کھاؤ، کھانے سے مراد محض کھانا ہی نہیں بلکہ استعمال کرنا ہے۔

حضور ﷺ نے زکوٰۃ اور قربانی کے متعلق بھی فرمایا کہ ان کو تاوان نہ سمجھو۔یہ عبادت ہے اور قرب الٰہی کا ذریعہ ہے لہٰذا یہ تمہارے ذمہ لازم ہے۔اسے خوشی سے ادا کیا کرو، مہر بھی ایک قسم کا عطیہ ہے جو کسی چیز کا معاوضہ نہیں ہوتا۔نہ ہی یہ کسی چیز کی بیع ہے بلکہ بیوی کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا معاملہ ہے۔مہر ادا کرنے سے انسان عورت کے اعضائے مستورہ کا مالک نہیں بن جاتا۔البتہ عقد نکاح کی وجہ سے اسے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوتی ہے۔بہر حال اللہ نے عورتوں کے حق میں یہ مہر مقرر کیا ہے۔اسے خوش دلی سے ادا کرنا چاہیے یہ معاشرت کے اعتبار سے بھی ضروری ہے۔نکاح کے وقت ایک خاص رقم شوہر کی حیثیت کے مطابق مقرر کی جاتی ہے جو شوہر بیوی کو ادا کرتا ہے اس کو مہر کا مقرر کرنا کہتے ہیں۔اس کے لیے حکم ہے کہ جو بھی مہر کی رقم تم نے مقرر کی ہے وہ بڑی خوشی سے ادا کر دو چاہے بیوی مطالبہ کرے یا نہ کرے۔اللہ تعالیٰ نے نکاح میں مقرر کردہ مہر کو خوش دلی سے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔اور یہ حکم ہر نکاح کے ضمن میں ہے۔خواہ یتیم لڑکی سے ہوا ہو یا عام عورت سے مہر محض ایک نمائشی، فرضی اور رسمی چیز نہیں کہ بوقت عقد قلیل یا کثیر مقدار میں طے کر لیا جائے اور بس؟

مہر عورت کا مالی حق ہے اور اس کا قرض ہے اور جس طرح دوسروں کے قرض کی ادائیگی لازمی اور ضروری سمجھی جاتی ہے، اسی طرح بعینہ عورت کے حق مہر کی ادائیگی لازم اور ضروری ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مہر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مال کا ذکر کیا ہے۔ نکاح میں مہر اگرچہ فرض ہے مگر بوقت نکاح اس کا تذکرہ ضروری نہیں۔ نکاح ایجاب و قبول کا نام ہے، لہٰذا جانبین کی رضامندی سے مہر کے بغیر بھی نکاح ہو جاتا ہے، تاہم اسے یہاں میاں بیوی بعد میں بھی مقرر کر کے لے دے سکتے ہیں۔ مقررہ مہر میں کمی بیشی کی بھی اجازت ہے اگر زیادہ مقرر کی ہے تو باہمی رضامندی سے کم بھی کیا جاسکتا ہے۔ یا کم ہے تو اسے زیادہ بھی کیا جاسکتا ہے تاہم احناف کے مطابق مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہونی چاہیے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ وزن کے حساب سے ایک درہم تین ماشہ ایک رتی کی برابر ہوتا ہے، اس لحاظ سے دس درہم ساڑھے اکتیس ماشے بنتے ہیں۔ ایک تولہ بارہ ماشے کا ہے۔ لہٰذا مہر کی کم از کم مقدار دو تولے ساڑھے سات ماشے چاندی کے برابر ہوئی۔ اس لئے اتنی ہی چاندی کی مقدار کے برابر کرنسی ہو۔ لہٰذا فقہ حنفی کے مطابق کم از کم مہر کی مقدار یہ ہے البتہ زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ ہر زمانے میں چاندی کے نرخ میں کمی بیشی سے مہر کا تعین سکہ رائج الوقت کے مطابق کیا جاسکتا ہے جو کہ ساڑھے اکتیس ماشے چاندی کی قیمت کے برابر ہونا چاہیے۔ اگر کسی نکاح میں اس سے کم مہر مقرر ہوا ہو تو اسے بعد میں پورا کر لینا چاہیے۔

اسلام میں یتیم و نادار بچوں کی کفالت

وَلَا تُؤۡتُوا	اور نہ دو تم	السُّفَهَآءَ	بے وقوفوں کو
اَمۡوَالَكُمُ	اپنے مال	الَّتِيۡ	وہ جن کو
جَعَلَ اللّٰهُ	بنایا ہے اللہ نے	لَكُمۡ	تمہارے لیے
قِيٰمًا	گزران کا سبب	وَّارۡزُقُوۡهُمۡ	اور تم انہیں کھلاؤ
فِيۡهَا	اس میں سے	وَاكۡسُوۡهُمۡ	اور انہیں پہناؤ
وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ	اور تم کہو ان سے	قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۵	بات معقول (۵)

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ اور بیوقوفوں کو اپنے مال نہ سپرد کرو۔ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا مال کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گزران کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے، ہاں انہیں اس مال سے کھلاؤ پلاؤ، وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا، میں فیہا کے لفظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یتیموں کی ضروریات پوری کرنے میں سرپرستوں کو کشادہ دلی سے کام لینا چاہیے۔ خسیس اور مکھی چوس سرپرستوں کا سارویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ عربی میں جب کہیں گے کہ ارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ تو اس کے معنی ہوں گے ان کو فراخی سے کھلاؤ پہناؤ۔ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا اور انہیں معقولیت سے نرم بات کہو۔ اس آیت میں چھوٹے بچوں کے بارے میں حکم ہے کہ اپنا مال جو زندگی گزارنے کا ذریعہ ہے۔ نادان بچوں کے حوالے مت کرو۔ جن میں یتیم سب سے پہلے آتے ہیں، بلکہ ان کو طریقہ سلیقہ سے کھلاؤ پلاؤ۔ اچھی طرح پرورش کرو مگر پرورش کا ایک اہم حصہ نیکی کی ہدایت اور بہترین تعلیم ہے۔ اس سے ہرگز غفلت نہ کرو۔ معاشرہ میں رہنے والے قبیلے، خاندان اور برادریاں گو بہ طور شاخت ایک دوسرے سے ممتاز ہوتی ہیں، ان کی رہائش، ان کا معاش اور ان کا تمدن جدا گانہ ہوتا ہے؛ تاہم بحیثیت معاشرت سبھی ایک ہوتے ہیں۔ غم اور خوشی میں شریک ہونا ان کا اخلاقی فریضہ ہوتا ہے۔ حوادث زمانہ کے تھپیڑے کھائے ہوئے لوگوں کی دیکھ بھال اور ان کی ضروریات کی تکمیل کو وہ اپنی سماجی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور کم وبیش سماج کے لوگ اس ذمہ داری کو اس لیے بھی نبھاتے ہیں کہ وہ ان کے لیے گراں بار نہیں ہوتے؛ لیکن آج کے دور کا سب سے بڑا مسئلہ سماج کے یتیم بچوں کی کفالت ہے۔ معاشرہ کے صاحب حیثیت اور متمول حضرات کے بھی قدم اس موڑ پر آ کر رک جاتے ہیں؛ کیوں کہ ان کے سامنے یتیموں کا صرف پیٹ بھرنا ہی ایک ضرورت نہیں؛ بلکہ ان کی مکمل نگہداشت، تعلیم وتربیت اور ساری ضروریات کی تکمیل ایک لمبے عرصہ کی متقاضی ہوتی ہے۔ یہی سوچ کر گویا ہر ایک اپنے کو بری الذمہ قرار دیتا ہے، جس کے نتیجہ میں ان بچوں کی زندگیاں یوں ہی ضائع ہو جایا کرتی ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ مال تو ذریعہ قیام زندگی ہے اگر کسی نادان کے ہتھے چڑھ جائے گا تو وہ فضول،

ناجائز یا گناہ کے کاموں میں اجاڑ دے گا اور اس کے برے اثرات تمام معاشرہ پر پڑیں گے۔ حقوق ملکیت جو کسی شخص کو اپنی املاک پر ہوتے ہیں اتنے غیر محدود نہیں کہ اگر وہ اس چیز کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو تب بھی اس کے حقوق سلب نہ کیے جاسکیں۔ اور اگر یتیم کا مال تجارت پر لگایا جاسکتا ہو تو اسے تجارت پر لگایا جائے اور منافع سے اس کی خوراک اور پوشاک کے اخراجات پورے کیے جائیں سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ یتیموں کا مال تجارت پر لگایا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ زکوٰۃ ہی ان کے مال کو کھا جائے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ یتیموں کے مال بھی اگر حد نصاب کو پہنچ جائیں تو ان پر بھی زکوٰۃ لاگو ہوگی اور دوسری یہ کہ جہاں تک ممکن ہو یتیموں سے اور ان کے اموال سے خیر خواہی ضروری ہے۔ یعنی یتیم بچوں میں جب تک شعور و آگہی نہ پیدا ہو جائے، اس وقت تک مال جیسی قیمتی چیز جو انسان کے لئے گذر بسر کا ذریعہ ہے، ان کے حوالہ نہ کی جائے؛ بلکہ اسی میں سے اس کی ضروریات پوری کی جائیں، بھلی بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مال تمہارا ہی ہے، جب تم سمجھ دار ہو جاؤ گے تو مال تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا۔

اسلام میں یتیموں کی پرورش اور نگہداشت کا تصور

وَابْتَلُوا	اور تم جانچ پرکھ کرو	الْيَتٰمٰى	یتیموں کی
حَتّٰٓى	یہاں تک کہ	اِذَا بَلَغُوا	جب وہ پہنچ جائیں
النِّكَاحَ ۚ	نکاح (کی عمر) کو	فَاِنْ	پھر اگر
اٰنَسْتُمْ	تم پاؤ	مِّنْهُمْ	ان میں
رُشْدًا	سمجھداری	فَادْفَعُوْٓا	تو سونپ دو
اِلَيْهِمْ	ان کی طرف	اَمْوَالَهُمْ ۚ	ان کے مال
وَلَا تَاْكُلُوْهَآ	اور نہ تم کھاؤ ان کو	اِسْرَافًا	حد سے بڑھ کر
وَّبِدَارًا	اور جلدی کرتے ہوئے	اَنْ	اس سے کہ
يَّكْبَرُوْا	وہ (یتیم) بڑے ہو جائیں گے	وَمَنْ كَانَ	اور جو کوئی ہو

غَنِيًّا	مالدار	فَلْيَسْتَعْفِفْ	تو چاہیے کہ وہ بچے
وَمَنْ كَانَ	اور جو کوئی ہو	فَقِيرًا	فقیر
فَلْيَأْكُلْ	تو چاہیے کہ وہ کھالے	بِالْمَعْرُوفِ ط	دستور کے موافق
فَإِذَا	پھر جب	دَفَعْتُمْ	تم سونپو
إِلَيْهِمْ	انہیں	أَمْوَالَهُمْ	ان کے مال
فَأَشْهِدُوا	تو گواہ ٹھہرالو	عَلَيْهِمْ ط	ان پر
وَكَفَىٰ بِاللَّهِ	اور کافی ہے اللہ	حَسِيبًا ۶	خوب حساب لینے والا

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔اس میں ہر ایک کے حقوق کا خیال رکھا گیا ہے۔اللہ پاک نے کسی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا۔ ہر ایک کے لیے ایسے اسباب و ذرائع مہیا کر دیے ہیں کہ وہ آسانی کے ساتھ اللہ کی زمین پر رہ کر اپنی زندگی کے ایام گزار سکے۔یتیم و نادار اور لاوارث بچوں کے بھی معاشرتی حقوق ہیں۔ان کی مکمل کفالت ان کے حقوق کی پاسداری ہے اور اس سے منہ موڑ لینا ان کے حقوق کی پامالی ہے۔ارشاد ہوتا ہے کہ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى اور یتیموں کو آزماتے رہو۔ان کا امتحان لیتے رہو۔اور امتحان اسی صورت میں ہوگا جب ان کی تربیت کی جائے گی۔تو مقصد یہ ہے کہ جب تک یتیم اپنی جائیداد کا انتظام خود چلانے کے قابل نہیں ہو جاتے۔تم خود متولی کی حیثیت سے کام کرتے رہو اور ساتھ ساتھ ان کی مناسب تربیت بھی کرو تا کہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنا کاروبار خود سنبھال سکیں۔فرمایا انہیں آزماتے رہو حَتّٰٓى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ج حتی کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں یعنی بالغ ہو جائیں فَإِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا اور پھر تم معلوم کرلو کہ اب وہ سمجھ بوجھ سے کام لینے لگے ہیں۔ان میں اچھے برے اور نفع نقصان کی تمیز پیدا ہوگئی ہے وہ کاروبار چلا سکتے، دکان چلا سکتے ہیں یا کارخانے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں یا کھیتی باڑی کر سکتے ہیں تو فَادْفَعُوٓا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ج ان کے مال ان کے سپرد کر دو۔تا کہ وہ اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور اپنا کام آپ سنبھالیں۔فرمایا وَلَا تَأْكُلُوهَآ إِسْرَافًا اور نہ کھاؤ یتیموں کے مال کو

اسراف کرتے ہوئے۔اسراف حد سے بڑھنے کو کہتے ہیں اور یہاں مقصد یہ ہے کہ جس مال کے متولی ہو اس کو جائز طریقے سے استعمال نہ کرو، ایسے ناجائز طریقے استعمال نہ کرو جن سے یتیم کا مال ضائع ہوتا ہو۔ یہ اسراف ہے وَّبِدَارًا اور جلدی کرتے ہوئے بھی مال کو خرچ نہ کرو اور اس خیال سے اَنۡ یَّكۡبَرُوۡا ؕ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔لہٰذا یتیموں کے سن بلوغت سے پہلے پہلے خوب خرچ کرلو، اس کے بعد تو مال ان کو واپس کرنا ہی ہے اور پھر ہمارا تصرف ختم ہو جائے گا۔مبادرت جلدی کو کہتے ہیں اور انسان سے جو کام جلدی میں سرزد ہو جاتا ہے اسے بھی مبادرۃ کہتے ہیں فرمایا اس قسم کا غلط خیال دل میں لاکر یتیم کے مال کو بے دریغ اڑانا درست نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یتیم کا متولی اس کے مال میں سے اپنی ذات کے لیے کچھ لے سکتا ہے یا نہیں۔جو شخص یتیم کے مال کی حفاظت کرتا ہے اسے کاروبار میں لگاتا ہے اس کی جائیداد کی دیکھ بھال کرتا ہے، اپنا وقت اور استعداد لگاتا ہے، اسے کس حد تک معاوضہ حاصل کرنے کی اجازت ہے اس سوال کے جواب میں اللہ رب العزت نے فرمایا: وَمَنۡ كَانَ غَنِيًّا فَلۡيَسۡتَعۡفِفۡ ۚ جو کوئی غنی یعنی مالدار ہے، وہ یتیم کے مال سے اجتناب کرے، اپنی پیش کردہ خدمات کا کچھ معاوضہ نہ لے۔مقصد یہ کہ اگر ایسا شخص اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی جائز ضرورت اپنے مال سے پوری کرسکتا ہے تو پھر وہ یتیم کی سرپرستی کا معاوضہ وصول نہ کرے۔البتہ وَمَنۡ كَانَ فَقِيۡرًا جو کوئی فقیر ہے۔اس کا ذاتی اثاثہ اتنا نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر کے اخراجات برداشت کرسکے اور اسے اپنا وقت اور استعداد یتیم کے مال کے انصرام میں لگانا پڑتا ہے۔تو اس کو اجازت ہے فَلۡيَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ کہ وہ دستور کے مطابق یتیم کے مال سے اپنا معاوضہ لے سکتا ہے۔ بالمعروف سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی خدمات کا جائز اور بقدر ضرورت معاوضہ لے۔محض یتیم کا مال سمجھ کر سے ناجائز طور پر ہضم کرنے کی کوشش نہ کرے۔اگر ایسا کرے گا تو عنداللہ ماخوذ ہوگا۔اس کی تفسیر میں مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ عام قانون سمجھ میں آتا ہے کہ یہ حکم صرف یتیم کے مال کے سلسلے میں ہی نہیں ہے۔بلکہ اس کا اطلاق ہر قومی و ملکی

ادارے کی خدمات کے سلسلے میں بھی ہوتا ہے۔اس حکم کے تحت حکومت کے ادارے خصوصاً محکمہ اوقاف، تعلیمی اور انتظامی دفاتر ،مساجد اور مدارس آتے ہیں۔ان اداروں میں کام کرنے والے لوگوں کو محض جذبہ خدمت کے تحت فرائض انجام دینے چاہئیں۔جن لوگوں کے پاس اپنا ذاتی اثاثہ موجود ہو جس سے وہ اپنی اور گھر بار کی جائز ضروریات پوری کر سکتے ہو،انہیں ان اداروں میں کام کرنے کا کوئی معاوضہ وصول نہیں کرنا چاہیے۔البتہ جن کارکنان کی گزراوقات کا اور کوئی ذریعہ نہ ہو۔انہیں بیت المال میں سے مناسب معاوضہ حاصل کرنا جائز ہے اس میں حسب ضرورت کرایہ مکان،سفرخرچ وغیرہ وصول کیا جاسکتا ہے۔تاہم جائز ضرورت سے زیادہ کھیل تماشے،ریڈیو،ٹیلی ویژن،فرنیچر،فریج، قالین وغیرہ فضول خرچی میں شامل ہوں گے۔فرمایا فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ جب تم ان کے مال واپس کرو فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ تو ان پر گواہ بنالو۔مقصد یہ ہے کہ لین دین فریقین صرف اپنے طور پر ہی انجام نہ دے لیں بلکہ ایسا کام گواہوں کے روبرو ہونا چاہیے تاکہ اگر کسی وقت کوئی تنازعہ پیدا ہوجائے تو اس سے نمٹنا آسان ہو۔فرمایا کہ جب تم یتیموں کو ان کا مال واپس کرو،تو اس پر گواہ قائم کرلو بلکہ یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب یتیموں کے متولی کی حیثیت سے ان کے مال کو قبضہ میں لو،تو اس وقت بھی یہ لین دین گواہوں کی موجودگی میں کرو اور پھر ان کے سن بلوغت کو پہنچنے پر جب واپس کرنے لگو تب گواہوں کے روبرو ایسا کرو۔تاکہ سب کو علم ہو جائے کہ کسی متولی یا سرپرست نے کس قدر مال حاصل کیا تھا اور اب کتنا واپس کر رہا ہے۔اس سے واضح ہو جائے گا کہ یتیم کے مال میں کس قدر کمی بیشی ہوئی ہے۔اور یہی چیز سرپرست کی دیانتداری کی ضمانت ہوگی۔ لین دین میں دیانت داری کا قانون بتلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی اگر تم قانون کی پابندی سے گریز کرو گے تو یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔تم کسی نہ کسی طرح دنیا کے قانون کی نظر سے تو بچ سکتے ہو مگر یاد رکھو وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ⑥ تمہارا حساب لینے کے لیے تمہارا اللہ کافی ہے۔جب اس کے دربار میں حاضر ہو گے تو پھر وہاں کوئی حیلہ بہانہ نہیں چل سکے گا۔وہاں پائی پائی کا حساب دینا ہوگا۔عام طور پر مال و دولت انسان کی کمزوری ہے۔اس کی چمک دمک دیکھ کر لوگ جائز

وناجائز کی تمیز کھو بیٹھے ہیں ۔تنخواہ، وظیفہ، بھتہ، الاؤنس وغیرہ کے مختلف ناموں سے روپیہ اکھٹا کیا جاتا ہے ۔معاملہ تعلیم کا ہو یا تبلیغ کا فتویٰ نکاح کا ہو یا طلاق کا، جب انسان کے دل میں دولت کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے تو تقویٰ کی پونجی ختم ہو جاتی ہے ۔پھر ایمان کا جنازہ نکل جاتا ہے، دیانت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور انسان لالچ کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے ۔اس وقت انسان بھول جاتا ہے کہ اس کا مواخذہ بھی ہونے والا ہے اور کسی نے اس کا حساب بھی لینا ہے وَ کَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ۶ مگر یاد رکھو! اللہ کافی ہے حساب لینے والا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اہل ایمان کو اللہ اطاعت کرنے اور شریعت اسلامیہ کی پابندی کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

عورتوں اور بچوں کا میراث میں حصہ /یتیم کا مال کھانا کبیرہ گناہ ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ
الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ کَثُرَ ؕ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا ⑦ وَاِذَا حَضَرَ
الْقِسْمَۃَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنُ فَارْزُقُوْھُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا
مَّعْرُوْفًا ⑧ وَلْیَخْشَ الَّذِیْنَ لَوْ تَرَکُوْا مِنْ خَلْفِھِمْ ذُرِّیَّۃً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَیْھِمْ ۪
فَلْیَتَّقُوا اللّٰہَ وَلْیَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ⑨ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا
اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ نَارًا ؕ وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ⑩

خواتین کے وراثتی حقوق: اسلام اور قانون کا تقاضا

لِلرِّجَالِ	مردوں کے لیے	نَصِیْبٌ	حصہ ہے
مِّمَّا	اس میں سے جو	تَرَکَ	چھوڑ جائیں
الْوَالِدٰنِ	ماں باپ	وَالْاَقْرَبُوْنَ ۪	اور قرابت دار
وَلِلنِّسَآءِ	اور عورتوں کے لیے (بھی)	نَصِیْبٌ	حصہ ہے

مِّمَّا	اس میں سے جو	تَرَكَ	چھوڑ جائیں
الْوَالِدٰنِ	ماں باپ	وَالْاَقْرَبُوْنَ	اور قرابت دار
مِمَّا	اس (متروکہ) سے کہ	قَلَّ	تھوڑا ہو
مِنْهُ	اس میں سے	اَوْ كَثُرَ ؕ	یا زیادہ
نَصِيْبًا	اس حال میں کہ وہ حصہ ہے	مَّفْرُوْضًا ۞	مقرر کیا ہوا

فرمایا: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مردوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور قریب ترین رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ چاہے وہ (ترکہ) تھوڑا ہو یا زیادہ، نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

زمانہ جاہلیت میں عورتوں اور بچوں کو وراثت سے حصہ نہ دیتے تھے، اِس آیت میں اُس رسم کو باطل کیا گیا۔ بلکہ عورت خود ورثہ شمار ہوتی تھی۔ اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے عورت کو اس ذلت کے مقام سے نکال کر وراثت میں حصہ دار بنا دیا۔ تقریباً اسی قسم کا قانون ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے وہ بھی بڑے بیٹے کو ہی وارث بناتے ہیں۔ انگریزوں میں بھی کم وبیش یہی قانون رائج ہے۔ مگر ایسے تمام قوانین غلط اور ظالمانہ ہیں جن میں ساری اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک نہ کیا گیا ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے وراثت کا وہ قانون نازل فرمایا جو حق وانصاف پر مبنی ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیٹے کو میراث دینا اور بیٹی کو نہ دینا صریح ظلم اور قرآن کے خلاف ہے دونوں میراث کے حقدار ہیں اور اس سے اسلام میں عورتوں کے حقوق کی اہمیت کا بھی پتا چلا۔ چنانچہ جہالت کے قانون کے تحت عورتوں کو محروم رکھنا ہرگز قرین انصاف نہیں، بلکہ ان کے ساتھ صریحاً ظلم ہے۔ اور پھر اس میں چھوٹے بڑے کا بھی کوئی فرق نہیں۔ بیوی کا حصہ موجود ہے۔ بیٹا خواہ بڑا ہو یا چھوٹا برابر کا حصے دار ہے۔ اسی طرح ہر عمر کی بیٹیاں بھی اپنا حصہ وصول کرنے کی حق دار

ہیں۔عمر میں چھوٹا بڑا ہونے کی بناء پر وراثت کے حصہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔باپ کی وفات کے وقت ایک دن کے بچے کو بھی برابر کا حصہ ملے گا، بلکہ جو بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہے وہ بھی وراثت میں برابر کا شریک ہے۔شریعت اسلامیہ نے عورت مرد یا چھوٹے بڑے کی تمام تفریق ختم کر دی ہے۔غرضیکہ: اس آیت سے میراث کے چند اُصول معلوم ہوئے، اول: یہ کہ متروکہ تھوڑا ہو یا زیادہ، ورثہ کے درمیان سب کی تقسیم عمل میں آئے گی، دوسرے: میراث میں مردوں کی طرح عورتوں کو بھی حصہ ملے گا، عورتوں کو میراث سے محروم رکھنا درست نہیں، تیسرے: مردوں میں بالغ اور نابالغ کی تفریق نہیں، بالغ ہو یا نابالغ، دونوں برابر کے حقدار ہیں، چوتھے: میراث کے حق دار اُقرب' یعنی قریب ترین رشتہ دار ہوں گے، قریب ترین رشتہ دار کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار محروم ہوں گے، بیٹے موجود ہوں تو پوتے پوتیاں، بیٹیاں موجود ہو تو نواسے نواسیاں حقدار نہیں ہوں گے، پانچویں: میراث کے حقدار ہونے کا تعلق قرابت داری سے ہے، نہ کہ مالدار اور غریب ہونے سے، اس لئے قریب ترین رشتہ دار چاہے مالدار ہوں، دور کے رشتہ دار کو چاہے وہ زیادہ غریب اور محتاج ہوں، محروم کر دیں گے۔ ہر وارث اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ حصہ وصول کرنے کا حقدار ہے۔

مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وراثت تقسیم نہیں ہوتی۔نہ مسلمان کافر کا وارث بن سکتا ہے اور نہ کافر مسلمان کی وراثت میں سے حصہ لے سکتا ہے۔اگر باپ مسلمان ہے اور بیٹا عیسائی، مرزائی یا کسی طرح مرتد ہو گیا ہے تو وہ باپ کی وراثت سے محروم ہو گیا ہے اسی طرح بیٹا مسلمان ہے اور باپ کافر ہے تو پھر بیٹا کافر باپ کی وراثت نہیں لے سکتا۔حضرت علی اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہما مسلمان تھے مگر ان کے دو دوسرے بھائی کافر تھے۔ باپ کی وفات پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کافر باپ کی جائیداد سے حصہ لینے کے مجاز نہیں لہٰذا باپ کا مکان کافر بھائیوں طالب اور عقیل نے لے لیا۔اگرچہ بعد میں فتح مکہ کے موقع پر عقیل بھی مسلمان ہو گئے تھے تاہم یہ طے شدہ قانون شریعت ہے کہ مومن اور کافر کے درمیان وراثت نہیں چلتی۔اسی طرح قاتل مقتول کا وارث نہیں بن سکتا۔بیٹا باپ کو قتل کر دے یا بھتیجا ایسے چچا کو قتل کر دے جس کی وراثت اس کو پہنچ سکتی تھی تو اس

قتل کی وجہ سے وہ مقتول کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔اس آیت کریمہ سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ ترکہ کا مال بہر حال تقسیم ہونا چاہیے مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ تھوڑا ہو یا زیادہ سب کا سب تقسیم ہو جانا چاہیے ۔ترکہ میں نقدی ہو یا سامان ، مکان ہو یا زمین ، برتن ہوں یا کپڑے ،کسی کمپنی کے حصص (SHARES) ہوں یا کارخانہ ہر چیز ف ورثا میں بانٹ دینی چاہیے ۔اگر وراثت تمام وارثان میں بقدر حصہ تقسیم نہیں ہوگی ،تو ارتکاذ دولت پیدا ہو جائے گی (ارتکازِ دولت کا لغوی معنی دولت کا ایک جگہ جمع ہونا یا چند مخصوص ہاتھوں میں سمٹ جانا ہے،معاشی اصطلاح میں ارتکازِ دولت سے مراد یہ ہے کہ معاشرے کے وسائل ،سرمائے اور دولت کا بڑا حصہ چند افراد ،خاندانوں یا طبقوں کے پاس محدود ہو جائے ، جب کہ اکثریت بنیادی ضروریات اور مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو ،اسلام اسے معاشرے کے امن ،توازن اور معیشت کے لیے ایک ناسور اور معاشی بحران کی بڑی وجہ قرار دیتا ہے ۔)اور یہ چیز اسلام کی روح کے منافی ہے ۔جس مالک الملک نے انسانوں کو ارتکازِ زر کی اجازت نہیں دی ،اس نے اپنے براہ راست قبضہ قدرت کی چیزوں کو اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ کوئی ادنیٰ واعلیٰ ان سے محروم نہیں رہتا ،مثلاً ہوا ،فضا ،سورج ، چاند ،ستارے ،بارش ،دریا ،سمندر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کو اس نے مخلوق میں کسی کے قبضے میں نہیں دیا ۔تمام انسان ،جانور ، پرندے اور کیڑے مکوڑے ان چیزوں سے براہ راست مستفید ہوتے ہیں ۔سانس لینے کے لیے ہوا کی ہر جاندار کو ضرورت ہے ۔سورج ، چاند اور ستاروں کی روشنی سب کی ضرورت ہے ، پانی بھی تمام جانداروں کی بنیادی ضرورت ہے ،لہٰذا اللہ نے یہ چیزیں ہر ایک کے لیے فری مہیا کی ہیں ۔اسی طرح دولت بھی چند ہاتھوں میں محدود ہو کر نہیں رہنی چاہیے ۔جب تک دولت کا دوران (circulation) صحیح طریقے سے ہوتا رہے گا تو دنیا میں توازن قائم رہے گا ،ورنہ یا تو نظام سرمایہ داری آجائے گا یا پھر ردعمل کے طور پر سوشلزم آئے گا ، حالانکہ یہ دونوں نظام ملعون ہیں ۔یہاں یہ چیز بھی یاد رہے کہ تقسیم وراثت صرف والدین اور اولاد کے درمیان ہی ضروری نہیں بلکہ شریعت کے مطابق جسے بھی حصہ پہنچتا ہے خواہ وہ چچا ہو یا تایا یا اس کے بیٹے یا بھائی یا دادا یا پوتا ترکہ کا مال لازماً

تقسیم ہونا چاہیے کسی حصے دار کا حصہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

شریعت اِسلامی کے تمام احکام کی بنیاد عدل پر

وَاِذَا	اور جب	حَضَرَ	حاضر ہوں
الۡقِسۡمَةَ	تقسیم کے وقت	اُولُوا الۡقُرۡبٰی	رشتے دار
وَالۡيَتٰمٰی	اور یتیم	وَالۡمَسٰكِيۡنُ	اور مساکین
فَارۡزُقُوۡهُمۡ	تو تم دو انہیں	مِّنۡهُ	کچھ اس (مقسوم) میں سے
وَقُوۡلُوۡا	اور تم کہو	لَهُمۡ	ان سے
قَوۡلًا	بات	مَّعۡرُوۡفًا⑧	معقول (۸)

فرمایا وَاِذَا حَضَرَ الۡقِسۡمَةَ اُولُوا الۡقُرۡبٰی وَالۡيَتٰمٰی وَالۡمَسٰكِيۡنُ اور جب (میراث کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار، یتیم اور مسکین لوگ آجائیں، فَارۡزُقُوۡهُمۡ مِّنۡهُ وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دو، اور ان سے مناسب انداز میں بات کرو۔ شریعت اِسلامی کے تمام احکام کی بنیاد عدل پر ہے، عدل سے مراد ہے صلاحیت کے اعتبار سے ذمہ داریوں کی اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے حقوق کی تعیین، عدل کا تقاضہ کبھی مساوات اور برابری کا ہوتا ہے اور کبھی کمی بیشی کے ساتھ تقسیم کا، اسلام کا قانون میراث بھی اسی اُصول پر مبنی ہے۔ ان آیات میں پانچ حکم دیئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ جاہلیت کے زمانے کی رسم ختم کر کے مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی وراثت کا حصہ دار بنایا گیا۔ دوسرا میراث چاہے کم ہو یا زیادہ تقسیم کرنا ضروری ہے۔ تیسرا چھوڑا ہوا مال چاہے رقم ہو، جائیداد ہو، زرعی زمین ہو، باغات ہوں، مل یا فیکٹری ہو غرض کسی بھی صورت میں مرنے والے کا چھوڑا ہوا مال تقسیم ضرور کیا جائے۔ چوتھا میراث کا مسئلہ اس وقت ہوتا ہے جب مرنے والا کچھ چھوڑ جائے۔ پانچواں اور آخری حکم یہ ہے کہ جب مرنے والے کے قریبی رشتہ دار موجود ہوں تو پھر دور کے رشتہ دار حصہ لینے کے حق دار نہ ہوں گے۔ اور ترکہ کی تقسیم کے وقت اگر کچھ محتاج، یتیم اور فقیر قسم کے لوگ یا دور کے رشتہ دار آجائیں تو از راہ احسان

انہیں بھی کچھ نہ کچھ دے دیا کرو۔ یہ حکم بہ طور استحباب کے ہے، کہ جو لوگ وارث نہ ہوں، اگر تقسیم کے موقعہ پر کچھ ان کو بھی دے دیا جائے تو بہتر ہے اور بھلی بات کہنے سے مراد یہ ہے کہ اگر ان کو نہ دیا جائے تو خوش اُسلوبی سے معذرت کر دی جائے، یا وہ زیادہ کا مطالبہ کرنے لگیں تو ان کو محبت سے سمجھا دیا جائے، بدکلامی بہر حال نہ کی جائے۔ یعنی تنگ دلی یا تنگ ظرفی سے کام نہ لو اور اگر ایسا نہ کر سکو تو کم از کم انہیں نرمی سے جواب دے دو۔ مثلاً یہ کہہ دو کہ یہ مال یتیموں کا ہے۔ یا یہ کہ میت نے ایسی کوئی وصیت نہیں کی تھی۔ وغیرہ، وغیرہ۔

عورت کا حق میراث اور اسلام

وَلْيَخْشَ	اور چاہیے کہ ڈریں	الَّذِيْنَ	وہ لوگ کہ
لَوْ تَرَكُوْا	اگر چھوڑ جائیں وہ	مِنْ خَلْفِهِمْ	اپنے پیچھے
ذُرِّيَّةً	اولاد	ضِعٰفًا	کمزور
خَافُوْا	تو (کیسے) وہ خوف کھاتے	عَلَيْهِمْ ص	ان پر
فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ	تو چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈریں	وَلْيَقُوْلُوْا	اور چاہیے کہ وہ کہیں
قَوْلًا	بات	سَدِيْدًا ۹	سیدھی

فرمایا وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِ اور وہ لوگ (یتیموں کے مال میں خرد برد کرنے سے) ڈریں جو اگر اپنے پیچھے کمزور بچے چھوڑ کر جائیں تو ان کی طرف سے فکر مند رہیں گے۔ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا لہذا وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی سیدھی بات کہا کریں۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیوی اپنی دو بیٹیوں کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی۔ یہ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بچیاں ہیں ان کا باپ جنگ احد میں شہید ہو گیا ہے بچیوں کے چچا (سعد بن ربیع کے بھائی) نے سعد کے سارے ترکہ پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ اور مال کے بغیر ان کا نکاح بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ

نے فرمایا اللہ تعالیٰ خود اس معاملہ میں فیصلہ فرمائے گا۔ پھر میراث کی آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نے سعد کے بھائی کو بلایا اور فرمایا کہ ترکہ میں سے دو تہائی تو سعد کی بچیوں کو دو اور آٹھواں حصہ ان کی والدہ کو۔ باقی جو بچے (یعنی 4 2 حصوں میں سے صرف 5 حصے) وہ تمہارا ہے (ترمذی، ابواب الفرائض)

یتیم کس قدر بے بس اور قابل رحم ہوتا ہے؟ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے اسی لیے اللہ رب العزت نے فرمایا کہ اس بات کا اندازہ کرنا ہو تو خیال کرو اگر خود تمہارے اپنے بچے یتیم ہو جائیں تو تم پر کیا گزرے گی؟ اس بات کو سوچ کر یہ ذہن میں بٹھا لو کہ کبھی کسی یتیم پر کسی صورت سے بھی ظلم و زیادتی نہ کرو گے ان کا مال ظلم و زیادتی سے کھا لینا تو انتہائی بری اور قابل سزا بات ہے یہ ایسے ہی ہے کہ جیسا آگ سے اپنے پیٹ بھر لیے جائیں۔ صرف یہی نہیں، بلکہ انکو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ان کو مرنے کے بعد جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ اللہ رب العزت کا ہے جو نہ تو جھوٹ ہو سکتا ہے اور نہ بدل سکتا ہے۔ اٹل اور یقینی فیصلہ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یتیم کے ساتھ ایمانداری برتو اور مہربانی سے پیش آؤ ورنہ سخت سزا پاؤ گے۔ (۲) اس آیت میں یتیموں کے حقوق کی طرف نہایت اثر انگیز انداز میں متوجہ کیا گیا ہے، کہ اگر تم اپنے بچوں کو چھوڑ کر دنیا سے گذرتے تو اس وقت ان بچوں کے بارے میں تمہارے جو جذبات ہوتے، ہر یتیم بچہ کے بارے میں تمہارے اندر وہی جذبہ ترحم ہونا چاہیئے، درست بات کہنے، میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اگر متوفی اپنے مرنے کے وقت کوئی ایسی وصیت کرنا چاہے، جو ان بچوں کے لئے نقصان دہ ہو، تو اس کو صحیح مشورہ دیا جائے اور ایسے ارادہ سے اس کو باز رکھا جائے۔

سات ہلاک کرنے والے گناہ

اِنَّ الَّذِيْنَ	بلاشبہ وہ لوگ جو	يَاْكُلُوْنَ	کھاتے ہیں
اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى	مال یتیموں کے	ظُلْمًا	ظلم سے
اِنَّمَا	(تو) بلاشبہ	يَاْكُلُوْنَ	وہ کھاتے ہیں

فِيۡ بُطُوۡنِهِمۡ	اپنے پیٹوں میں	نَارًا ؕ	آگ
وَسَيَصۡلَوۡنَ	اورعنقریب وہ داخل ہوں گے	سَعِيۡرًا ۱۰	دہکتی آگ میں

فرمایا اِنَّ الَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا اِنَّمَا يَاۡكُلُوۡنَ فِيۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا یقین رکھو کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، وَسَيَصۡلَوۡنَ سَعِيۡرًا اور انہیں جلد ہی ایک دہکتی آگ میں داخل ہونا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو۔ صحابہ علیہم الرضوان نے پوچھا وہ کون سے ہیں؟ فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔ جادو۔ جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے اسے ناحق قتل کرنا۔ سود کھانا۔ یتیم کا مال کھانا۔ لڑائی میں پیٹھ پھیر جانا۔ اور پاکدامن بھولی بھالی مومن عورت پر تہمت لگانا۔ (بخاری) فرمایا جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ڈال رہے ہیں۔ آج تو خوب مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن یہی مال آگ کی صورت میں ان کے پیٹوں سے برآمد ہوگا۔ اور پھر وسیصلون سعیراً وہ لوگ جہنم میں داخل ہو جائیں۔ انہیں اس وقت معلوم ہوگا کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں آرام کی خاطر انہوں نے یتیم کا حق غصب کیا اور اب ہمیشہ کے لیے جہنم رسید ہو کر دائمی سزا میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

وصیت اور وراثت کے احکام ومسائل/ وراثت کے احکام قرآن مجید کی روشنی میں

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ
اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ
لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ
وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ
فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪

میراث کی تقسیم کے ابتدائی مراحل

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ	تمہیں وصیت کرتا ہے اللہ	فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ	تمہاری اولاد کی بابت
لِلذَّكَرِ	مرد کیلئے ہے	مِثْلُ	مثل
حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ	دوعورتوں کے حصے کی	فَاِنْ كُنَّ	پھر اگر ہوں
نِسَآءً	(صرف) عورتیں (ہی دو یا)	فَوْقَ	زیادہ

اثْنَتَيْنِ	دو سے	فَلَهُنَّ	تو ان کے لیے ہے
ثُلُثَا	دو تہائی	مَا	(اس میں سے) جو
تَرَكَ ج	وہ چھوڑ گیا	وَإِنْ كَانَتْ	اور اگر ہو
وَاحِدَةً	ایک ہی (لڑکی)	فَلَهَا النِّصْفُ ط	تو اس کے لیے ہے آدھا

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ اور اگر (صرف) عورتیں ہی ہوں، دو یا دو سے زیادہ، تو مرنے والے نے جو کچھ چھوڑا ہو، وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ انہیں اس کا دو تہائی حصہ ملے گا۔

اس آیت میں تفصیل سے مختلف رشتہ داروں کی میراث کے احکام بیان کئے گئے ہیں، اولاد کے حق میراث کے سلسلہ میں تین حالتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک یہ کہ مرنے والے کے لڑکے بھی ہوں اور لڑکیاں بھی، اس صورت میں لڑکوں کا حصہ بہ مقابلہ لڑکیوں کے دوگنا اور لڑکیوں کا لڑکوں کے مقابلہ آدھا ہوگا، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ شریعت نے ماں باپ، اولاد اور بیوی کے نفقہ وکفالت کی ذمہ داری مردوں پر رکھی ہے نہ کہ عورتوں پر، پس چوں کہ ان کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں؛ اس لئے ان کا حق بھی زیادہ رکھا گیا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ صرف بیٹیاں ہوں، اور بیٹیاں دو سے زیادہ ہوں، تو متروکہ کا دو تہائی دونوں بیٹیوں کو مل جائے گا، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بیٹیاں صرف دو ہوں تو ان کا بھی یہی حکم ہے، (ابوداؤد: عن جابر بن عبداللہ، کتاب الفرائض) تیسری صورت یہ ہے کہ ایک بیٹی ہو، تو وہ کل متروکہ کے آدھے کی حقدار ہوگی چوتھی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ صرف لڑکے ہوں، ایک یا ایک سے زیادہ، ایسی صورت میں وہ دوسرے حصہ داروں کا حق دینے کے بعد کل متروکہ کے حقدار ہوں گے۔

والدین، اولاد اور بیوہ میں وراثت کی تقسیم

وَلِأَبَوَيْهِ	اور اس کے ماں باپ کے لیے	لِكُلِّ وَاحِدٍ	ہر ایک کے لیے

مِّنۡهُمَا	ان دونوں میں سے	السُّدُسُ	چھٹا حصہ ہے
مِمَّا	اس میں سے جو	تَرَكَ	وہ چھوڑ گیا
اِنۡ كَانَ لَهٗ	اگر ہے اس کی	وَلَدٌ ۚ	اولاد
فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ	پھر اگر نہ ہو	لَّهٗ وَلَدٌ	اس کی اولاد
وَّوَرِثَهٗۤ	اور اسکے وارث ہوں	اَبَوٰهُ	اسکے ماں باپ ہی
فَلِاُمِّهِ	تو اس کی ماں کیلئے ہے	الثُّلُثُ ۚ	تیسرا حصہ
فَاِنۡ كَانَ	پھر اگر ہوں	لَهٗۤ اِخۡوَةٌ	اس کے (ایک سے زیادہ) بھائی بہن
فَلِاُمِّهِ	تو اس کی ماں کا ہے	السُّدُسُ	چھٹا حصہ

فرمایا: وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ اور مرنے والے کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا، بشرطیکہ مرنے والے کی کوئی اولاد ہو، اور اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ اور اس کے والدین ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں تہائی حصے کی حق دار ہے۔ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ ہاں اگر اس کے کئی بھائی ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔

آیت کریمہ کے اس ٹکڑے میں والدین کے حصوں کا ذکر ہے، اس میں تین صورتیں بیان کی گئی ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ مرنے والا صاحب اِولاد ہو، ایسی صورت میں ماں باپ میں سے ہر ایک کو اس کے متروکہ کا چھٹا حصہ ملے گا، یعنی متروکہ کا ایک تہائی ماں باپ دونوں میں مساوی تقسیم ہو گا، دوسری صورت یہ ہے کہ مرنے والے کی اولاد نہ ہو اور کوئی بھائی بھی نہ ہو یا صرف ایک بھائی ہو تو متروکہ کا ایک تہائی حصہ ماں کو ملے گا اور ورثہ میں تقسیم کے بعد جو کچھ بچ رہے وہ باپ کو، تیسری صورت یہ ہے کہ مرنے والے کو اولاد تو نہ ہو؛ لیکن ایک سے زیادہ بھائی ہوں، اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، اور تقسیم کے بعد جو کچھ بچ رہے وہ باپ کو واضح ہو کر اگر مرنے والے نے ماں باپ کو بھی چھوڑا ہو اور بیوی کو بھی، تو بیوی کا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ کا ایک تہائی ماں کو اور باقی باپ کو

ملے گا، کتب فقہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

قرض کی ادائیگی تقسیم وراثت پر مقدم ہے

مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ	وصیت کے بعد	يُّوۡصِيۡ	(کہ) وہ وصیت کر جائے
بِهَآ	اس کی	اَوۡ دَيۡنٍ ؕ	یا قرض کے (بعد)
اٰبَآؤُكُمۡ	تمہارے باپ	وَاَبۡنَآؤُكُمۡ	اور تمہارے بیٹے
لَا تَدۡرُوۡنَ	نہیں تم جانتے	اَيُّهُمۡ	ان میں سے کون
اَقۡرَبُ	زیادہ قریب ہے	لَكُمۡ	تمہارے لیے
نَفۡعًا ؕ	باعتبار نفع کے	فَرِيۡضَةً	(یہ حصے) مقرر ہیں
مِّنَ اللّٰهِ ؕ	اللہ کی طرف سے	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	بلاشبہ اللہ ہے
عَلِيۡمًا	خوب جاننے والا	حَكِيۡمًا ⑪	بڑا حکمت والا (۱۱)

مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٖ يُّوۡصِيۡ بِهَآ اَوۡ دَيۡنٍ (اور یہ ساری تقسیم) اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد ہوگی جو مرنے والے نے کی ہو، یا اگر اس کے ذمے کوئی قرض ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد، میت کے متروکہ مال میں سے تجہیز وتکفین کے بعد اس کا قرض ادا کیا جائے گا، اگر قرض کی ادائیگی کے بعد کچھ باقی بچتا ہے تو وہ ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ لہٰذا مرحوم کے مال میں سے اولاً قرض خواہوں کا قرض ادا کیا جائے، اور قرض خواہوں کا فی الوقت علم نہ ہو تو اعلان کر دیا جائے کہ مرحوم کے ذمہ جن جن لوگوں کا قرض ہے وہ مرحوم کے ورثاء سے رابطہ کرلیں۔ قرض کی ادائیگی کے بعد باقی مال ورثاء میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔ اگر قرض کی ادائیگی میں سارا مال خرچ ہو جائے تو ورثاء کے لیے کچھ نہیں ہوگا، پھر اگر قرض خواہ باقی ہوں تو اس صورت میں بقیہ قرض کی ادائیگی ورثاء پر لازم نہیں، البتہ اگر ورثاء مرحوم کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتے ہوئے اپنی جانب سے ان کا قرض ادا کر دیں تو عند اللہ امید ہے کہ مرحوم قرض کے معاملہ سے بری ہو جائیں گے۔ نیز چوں کہ مرحوم نے نماز، روزوں سے متعلق فدیہ کی وصیت نہیں کی تو شرعاً ورثاء پر ان کی نماز، روزوں کا فدیہ

ادا کرنا لازم نہیں، البتہ اگر ورثاء از خود باہمی رضامندی سے مرحوم کے مال میں سے یا اگر مرحوم کا مال نہ ہو تو اپنی جانب سے ان کی نماز، روزوں کا فدیہ ادا کر دیں تو امید ہے کہ مرحوم آخرت کی باز پرس سے بچ جائیں گے۔ ایک نماز کا فدیہ ایک صدقہ فطر کے برابر ہے، اسی طرح ایک روزے کا فدیہ بھی ایک صدقہ فطر کے برابر ہے۔ اور روزانہ وتر کے ساتھ چھ نمازیں ہیں تو ایک دن کی نمازوں کے فدیے چھ ہوئے، اور ایک صدقہ فطر تقریباً پونے دو کلو گندم یا اس کا آٹا یا اس کی قیمت ہے۔ فدیہ کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا مصرف ہے یعنی مسلمان فقیر جو سید اور ہاشمی نہ ہو اور صاحب نصاب بھی نہ ہو۔ فقط واللہ اعلم۔ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا تمہیں اس بات کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں ہے کہ تمہارے باپ بیٹوں میں سے کون فائدہ پہنچانے کے لحاظ سے تم سے زیادہ قریب ہے؟ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا یہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے حصے ہیں، یقین رکھو کہ اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔

یعنی حصۂ میراث کی تقسیم دین (قرض یا ادھار جو کسی چیز کے بدلے میں کسی پر واجب ہو) کی ادائیگی اور وصیت کی تکمیل کے بعد ہے، قرض کی ادائیگی وصیت پر بھی مقدم ہے چوں کہ دین کے تقاضا کرنے والے خود موجود ہوتے ہیں، ورثہ کے لئے اس میں کوتاہی برتنا دشوار ہوتا ہے، وصیت جس کے حق میں کی گئی ہو، تبرع ہونے کی وجہ سے اس کے مطالبہ میں شدت بھی نہیں ہوتی (تبرع کا لغوی معنیٰ: بغیر کسی معاوضے، اجرت یا بدلے کے اپنی خوشی سے کسی کو کوئی چیز دینا، بخشنا یا عطا کرنا۔ اصطلاحی مفہوم: شریعت اور لغت میں "تبرع" سے مراد یہ ہے کہ کوئی مکلف (عاقل و بالغ) شخص نیکی، ثواب، احسان یا بھلائی کی نیت سے اپنا مال یا کوئی منفعت (فائدہ) بغیر کسی دنیوی عوض یا شرط کے کسی دوسرے کے سپرد کر دے، خواہ وہ فوراً ہو یا بعد میں۔) بہر حال یہ بھی ضروری نہیں کہ جس کے حق میں وصیت کی گئی ہے، وہ اس سے واقف بھی ہو، اس لئے وصیت کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے، وصیت کے سلسلہ میں حدیث میں دو اہم اُصول بتائے گئے ہیں: ایک یہ کہ وارث کے حق میں وصیت کا اعتبار نہ ہوگا، (سنن ترمذی) دوسرے:

وصیت زیادہ سے زیادہ ترکہ کے ایک تہائی ہی میں جاری ہو سکتی ہے، (مسلم، باب الوصیۃ بالثلث، حدیث نمبر: ۴۲۱۴) میت اگر اس سے زیادہ کی وصیت کر جائے تو ایک تہائی مال ہی میں وصیت جاری ہوگی، اس سے زیادہ میں جاری نہیں ہوگی، سوائے اس کے کہ تمام ورثہ اس کے جاری کئے جانے پر رضامند ہوں، اگر بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو تو وہ بھی دین میں داخل ہے اور میراث کی تقسیم سے پہلے میّت کی بیوہ کا مہر نکال دینا ضروری ہے۔

اسلام میں وراثت کا انحصار تین چیزوں پر ہے۔ پہلا نسب، دوسرا نکاح اور تیسرا ولاء جو کہ ولاء کی پہلی قسم سے مختلف ہے۔ نسب کا قانون یہ ہے کہ جو رشتہ دار میت کے زیادہ قریب ہوگا۔ وراثت پر اس کا حق فائق ہوگا۔ قریبی عزیز کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار کو حصہ نہیں ملتا۔ وراثت کا دوسرا سبب نکاح ہے، جب ایک مرد اور ایک عورت رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی وراثت کے حق دار بن جاتے ہیں تاوقتیکہ طلاق کے ذریعے علیحدگی اختیار نہ کر لیں۔ اگر خاوند فوت ہو جائے تو بیوی کو حصہ ملتا ہے اور اگر بیوی فوت ہو جائے تو خاوند وراثت میں حق رکھتا ہے گویا وراثت کا مدار نکاح پر بھی ہے۔ وراثت کا تیسرا سبب ولاء ہے، اور وَلاءایسی قرابت کو کہتے ہیں جس کی وجہ آزادی کا وہ پروانہ ہے جو غلام کو دیا جاتا ہے۔ اور یہ دو قسم سے ہے۔ پہلی ولاء اعباق ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کر دے۔ اور غلام کی وفات کے وقت اس کا کوئی حقیقی رشتہ دار موجود نہ ہو تو غلام کی وراثت اس آزاد کرنے والے شخص کو پہنچتی ہے۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے بریرہ کو خریدنے (اور آزاد کرنے) کا ارادہ کیا تو بریرہ کے گھر والوں نے ولاء (میراث) کی شرط رکھی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ولاء (میراث) کا حق اسی کو حاصل ہے جو قیمت ادا کرے یا آزاد کرنے کی نعمت کا مالک ہو“ موجودہ زمانے میں ولاء کی دو صورتوں میں سے ولاء اعتقاق تو ختم ہو چکی ہے۔ اب نہ کوئی غلام ہے اور نہ اس کی آزادی کی نوبت آتی ہے لہٰذا یہ سبب اب بالکل بند ہو چکا ہے البتہ دوسری قسم ولاء موالات کی اب بھی گنجائش ہے۔ اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لے اور اس کا مولیٰ بن جائے۔ پھر اس کی وفات کے وقت اس کا کوئی حقیقی مسلمان رشتہ دار موجود نہ ہو تو اس کی

وراثت اس کے مولیٰ کو ملے گی، گویا اس وقت وراثت کے تین سبب نسب نکاح اور موالات ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا علم تین ہیں اور ان کے سوا جو کچھ ہے وہ فضل ہے۔ آیات محکمات کا علم، سنت قائمہ اور انصاف کے ساتھ ورثہ کی تقسیم۔ (دار قطنی، ابن ماجہ) قرضہ کی ادائیگی: قرضہ کی ادائیگی کا ذکر اگرچہ وصیت کے بعد مذکور ہے تاہم میت پر قرضہ کے بوجھ کے متعلق احادیث صحیحہ میں جو وعید آئی ہے اس کی بنا پر امت کا اجماع ہے کہ تقسیم میراث کے وقت سب سے پہلے قرضہ کی ادائیگی ضروری ہے۔ اگر بیوی کا حق مہر ادا نہ ہوا ہو تو وہ بھی قرضہ ہے اگر میت پر حج فرض ہو چکا ہو مگر کسی وجہ سے کر نہ پایا ہو۔ یا اس نے منت مانی ہو تو اس قسم کے اخراجات تقسیم میراث اور وصیت پر عمل سے پہلے نکالے جائیں گے۔ اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو کسی وراثت تقسیم کرنے سے قبل کرنا ضروری ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں قانون یہ ہے کہ سب سے پہلے مرنے والے کے مال میں سے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا جائے۔ اس کام پر اخراجات اعتدال کے ساتھ ہونے چاہئیں۔ میت کا مال سمجھ کر فضول خرچی نہیں کرنی چاہیے۔ کفن کے لیے مناسب کپڑا اور دوسری اشیاء ضرورت خریدی جائیں۔ قبر کھودنے کا انتظام ہو جس کی مزدوری میت کے مال سے ادا کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ اگر مرنے والے کے ذمے کوئی قرض ہے تو ادا کیا جائے۔ تیسرے نمبر پر اگر میت نے کوئی وصیت کی ہے تو اسے پورا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ہر مسلمان کو کل مال کے ایک تہائی کے برابر وصیت کرنے کی اجازت دی ہے، اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی وصیت کی گئی ہے تو اسے پورا کیا جائے گا اور اس کے بعد باقی ماندہ مال وراثت حق داران میں تقسیم کیا جائے گا۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کو بڑے غور سے سمجھ لینا چاہیے کیونکہ اس سے زندگی کا ایک بہت بڑا مسئلہ وابستہ ہے، لہٰذا سب سے پہلے مرنے والے کے چھوڑے ہوئے مال میں سے کفن دفن کا خرچہ بڑے مناسب طریقہ سے کیا جائے۔ اس کے بعد اگر مرنے والے نے قرض دینا ہو تو اس کے مال میں سے اس کا قرض ادا کیا جائے گا۔ اگر پورا مال ہی قرضہ میں چلا گیا تو ٹھیک ہے وارثوں کو کچھ نہ ملے گا اور اگر قرضہ ادا کرنے کے بعد مال بچ جائے تو اس میں سے ایک تہائی میت کی وصیت کے مطابق دیا جا سکتا ہے۔ باقی جو بچ جائے اس کو قرآن کے اصول کے مطابق وارثوں میں تقسیم کر دیا

جائے جس خلاصہ یہ ہے: پہلا اصول تو یہ ہے کہ مرد کو عورت سے دوگنا حصہ ملے گا۔ اگر صرف دو لڑکیاں ہوں تو ان کا کل حصہ دو تہائی ہوگا اور ہر ایک کو تہائی حصہ ملے گا۔ پھر لڑکیاں دو سے خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں ان کا مجموعی حصہ ترکے کا دو تہائی ہی رہے گا۔ باقی ایک تہائی دوسرے ورثا کو ملے گا۔ اگر لڑکی ایک ہی ہو تو کل ترکے کا نصف حصہ ملے گا اور باقی آدھے میں دوسرے ورثا ہوں گے، لیکن اگر کوئی عزیز نہ ہو تو پھر باقی آدھا بھی اسی کو ملے گا۔ اگر بیٹی کوئی نہ ہو صرف بیٹا ہی ہو خواہ ایک ہو یا زیادہ تمام میراث انہیں ہی ملے گی۔ والدین کے لیے تین صورتیں ہیں۔ 1 اگر میت کی اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ 2 اگر میت کی اولاد نہ ہو صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو ماں کو ایک تہائی اور باپ کو دو تہائی حصہ ملے گا۔ 3 اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں۔ خواہ وہ حقیقی ہوں یا صرف ماں یا صرف باپ کی طرف سے ہوں اور اولاد نہ ہو تو اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ اور باقی باپ کو ملے گا۔ بھائی بہن کو کچھ نہ ملے گا، اگر صرف ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ماں کو ایک تہائی ملے گا۔ اور باپ کو دو تہائی ملے گا۔ یہ اس صورت میں ہے کہ میت کی شادی نہیں ہوئی وگرنہ تقسیم کی دوسری صورت ہوگی۔ میت کے ترکے کی تقسیم سوسائٹی میں خوشحالی، اقتصادی استحکام، اور معاشرتی انصاف کو فروغ دینے میں مثبت کردار ادا کرتی ہے. یہ وارثوں کو مالی تحفظ فراہم کرتی ہے، ان میں خوشحالی پھیلاتی ہے، اور غربت وافلاس کو کم کرنے میں مدد کرتی ہے. اس کے علاوہ، یہ خاندانی تعلقات کو مضبوط بناتی ہے اور معاشرے میں امن وامان قائم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے میت کے ترکہ کی تقسیم اور ٹھیک تقسیم ہی سوسائٹی کی بہتری کے لیے فائدہ مند ہے، اس لیے اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کی سختی سے پابندی کرنی چاہیئے۔ اللہ جل شانہ کی حکمت اور علم بے انتہا، وسیع اور مکمل ہے نہ کوئی انسان اس کی برابری کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی حکمتوں کو جان سکتا ہے۔ اللہ رب العزت کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں بہترین زندگی گزارنے کے لیے بنے بنائے اصول اور قانون بیان کر دیئے اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم سختی سے ان کی پابندی کریں اور دنیا وآخرت میں بھلائیاں حاصل کریں۔ میراث سے متعلق دینی تعلیمات کو اُجاگر کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہاں فوتگی کے موقع پر پوری پابندی اور احتیاط کے ساتھ ان احکام کو علمائے کرام سے پوچھ پوچھ کر زندہ

کرتا رہے۔اللہ تعالیٰ پوری اُمت ِمسلمہ کو اپنی دینی تعلیمات کی صحیح قدردانی کرتے رہنے کی توفیق سعید نصیب فرمائیں۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں پورے دین پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور میراث کے حوالے سے پائی جانے والی غفلتوں سے درگزر فرما کر اس کے ازالے کی ہمت عطا فرمائے، آمین۔

کلالہ کی میراث/ بہن بھائیوں کی تین قسمیں/ احکام کے مطابق تقسیم نہ کرنے والے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ
فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا
تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ
اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ
شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ
اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ ⑫ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ
جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑬ وَمَنْ
يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ
مُّهِيْنٌ ۧ ⑭

کلالہ کا مفہوم اور تقسیم کا طریقہ

وَلَكُمْ	اور تمہارے لیے	نِصْفُ	آدھا ہے
مَا تَرَكَ	(اس) کا جو چھوڑ گئیں	اَزْوَاجُكُمْ	تمہاری بیویاں
اِنْ لَّمْ يَكُنْ	اگر نہ ہو	لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ	ان کی اولاد
فَاِنْ كَانَ	پھر اگر ہو	لَهُنَّ وَلَدٌ	ان کی اولاد
فَلَكُمُ	تو تمہارے لیے ہے	الرُّبُعُ	چوتھا حصہ
مِمَّا	اس سے جو	تَرَكْنَ	وہ چھوڑ گئیں
مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ	بعد وصیت کے	يُّوْصِيْنَ	(کہ) وہ وصیت کر جائیں
بِهَآ	اس کی	اَوْ دَيْنٍ ؕ	یا قرض کے (بعد)
وَلَهُنَّ	اور ان (بیویوں) کے لیے ہے	الرُّبُعُ	چوتھا حصہ
مِمَّا	اس سے جو	تَرَكْتُمْ	تم چھوڑ جاؤ
اِنْ لَّمْ يَكُنْ	اگر نہ ہو	لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ	تمہاری اولاد
فَاِنْ كَانَ	پھر اگر ہو	لَكُمْ وَلَدٌ	تمہاری اولاد
فَلَهُنَّ	تو ان (بیویوں) کے لیے ہے	الثُّمُنُ	آٹھواں حصہ
مِمَّا	اس سے جو	تَرَكْتُمْ	تم چھوڑ جاؤ
مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ	وصیت کے بعد	تُوْصُوْنَ	(کہ) تم وصیت کر جاؤ
بِهَآ	اس کی	اَوْ دَيْنٍ ؕ	یا قرض کے (بعد)

فرمایا: وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ اور تمہاری بیویاں جو کچھ چھوڑ کر جائیں، اس کا آدھا حصہ تمہارا ہے، بشرطیکہ ان کی کوئی اولاد (زندہ) نہ ہو۔ اور اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد جو انہوں نے کی ہو، اور ان کے قرض کی ادائیگی

کے بعد تمہیں ان کے ترکے کا چوتھائی حصہ ملے گا۔وصیت دو قسم سے ہے یعنی فرض اور مستحب۔اگر کسی شخص کے ذمہ قرض واجب الادا ہے یا کوئی اور لین دین کا معاملہ ہے تو اس پر فرض ہے کہ وہ وصیت کر جائے کہ اس کا قرضہ اس کے مال سے ادا کیا جائے۔اسی طرح اگر کسی کی نمازیں رہ گئیں ہیں۔زکوٰۃ بقایا ہے کچھ روزے رہ گئے ہیں تو اس پر بھی لازم ہے کہ وہ وصیت کرے کہ اس کے مال میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے یا نمازوں کا فدیہ دے دیا جائے۔ایسی صورت میں وصیت کرنا فرض ہوتا ہے۔اگر نہیں کرے گا تو اللہ کی پکڑ ہوگی۔وصیت کی دوسری قسم مستحب ہے جو کہ مرنے والا اپنے کل مال کے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی کے برابر کرسکتا ہے۔وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّكُمۡ وَلَدٌ فَاِنۡ كَانَ لَكُمۡ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ تُوۡصُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ اور تم جو کچھ چھوڑ کر جاؤ اس کا ایک چوتھائی ان (بیویوں) کا ہے،بشرطیکہ تمہاری کوئی اولاد (زندہ) نہ ہو۔اور اگر تمہاری کوئی اولاد ہو تو اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد جو تم نے کی ہو،اور تمہارے قرض کی ادائیگی کے بعد ان کو تمہارے ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔یعنی جس میں بیویوں کے حق میراث اور اس کی تقسیم کے ضابطے بیان کیے گئے ہیں۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر شوہر کا انتقال ہو جائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو،تو بیویوں کو کل ترکے کا چوتھا (۱/۴) حصہ ملتا ہے۔ اور اگر شوہر کی اولاد (بیٹا یا بیٹی،خواہ اس بیوی سے ہو یا کسی اور سے) موجود ہو،تو بیویوں کا حصہ گھٹ کر آٹھواں (۱/۸) رہ جاتا ہے۔یہ تقسیم قرض کی ادائیگی اور وصیت نافذ کرنے کے بعد کی جاتی ہے

وَاِنۡ كَانَ	اور اگر ہو	رَجُلٌ	وہ مرد
يُّوۡرَثُ	(کہ) وراثت لی جارہی ہے (اس کی)	كَلٰلَةً	کلالہ
اَوِ امۡرَاَةٌ	یا عورت ہو (ایسی ہی)	وَّلَهٗۤ	اور اس کا
اَخٌ	ایک بھائی ہے	اَوۡ اُخۡتٌ	یا ایک بہن
فَلِكُلِّ وَاحِدٍ	تو ہر ایک کے لیے	مِّنۡهُمَا	ان دونوں میں سے
السُّدُسُ ۚ	چھٹا حصہ ہے	فَاِنۡ كَانُوۡۤا	پھر اگر ہوں وہ

اَكۡثَرَ مِنۡ ذٰلِكَ	زیادہ اس سے	فَهُمۡ	تو وہ
شُرَكَآءُ	شریک ہوں گے	فِي الثُّلُثِ	تہائی حصے میں
مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ	وصیت کے بعد	يُّوۡصٰى	(کہ) وصیت کر دی جائے
بِهَآ	اس کی	اَوۡ دَيۡنٍ ۙ	یا قرض کے (بعد)
غَيۡرَ مُضَآرٍّ ۚ	بشرطیکہ نہ نقصان پہنچانے والا ہو وہ	وَصِيَّةً	(یہ) وصیت ہے
مِّنَ اللّٰهِ ؕ	اللہ کی طرف سے	وَاللّٰهُ	اور اللہ
عَلِيۡمٌ	خوب جاننے والا	حَلِيۡمٌ ؕ⑫	بڑا بردبار ہے (۱۲)

فرمایا: وَاِنۡ كَانَ رَجُلٌ يُّوۡرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امۡرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ اور اگر وہ مرد یا عورت جس کی میراث تقسیم ہونی ہے، ایسا ہو کہ نہ اس کے والدین زندہ ہوں، نہ اولاد، اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن زندہ ہو تو ان میں سے ہر ایک چھٹے حصے کا حق دار ہے۔ یعنی کلالہ وہ شخص ہے جس کے نہ والدین ہوں نہ دادا دادی، اور نہ اولاد اور نہ پوتے پوتیاں۔ خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت وہ کلالہ ہے البتہ اس کے بہن بھائی ہو سکتے ہیں۔ بہن بھائی بھی تین قسم کے ہوتے ہیں (1) عینی یا حقیقی یا سگے بھائی جن کے والدین ایک ہوں۔ (2) علاتی یا سوتیلے بہن بھائی جن کی مائیں الگ الگ اور باپ ایک ہو (3) اخیافی یعنی ایسے سوتیلے بہن بھائی جن کی ماں ایک ہو اور باپ الگ الگ ہوں۔ اس آیت میں جن بہن بھائیوں کا ذکر ہے وہ بالاتفاق اخیافی یعنی ماں کی طرف سے بھائیوں کا ہے۔ فَاِنۡ كَانُوۡۤا اَكۡثَرَ مِنۡ ذٰلِكَ فَهُمۡ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ۙ غَيۡرَ مُضَآرٍّ اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے، (مگر) جو وصیت کی گئی ہو اس پر عمل کرنے کے بعد اور مرنے والے کے ذمے جو قرض ہو اس کی ادائیگی کے بعد، بشرطیکہ (وصیت یا قرض کے اقرار کرنے سے) اس نے کسی کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔ یعنی جس میں وہ دو سے زیادہ ہونے پر ایک تہائی (ثلث) میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، بشرطیکہ یہ تقسیم میت کے قرض کی ادائیگی اور جائز وصیت کے بعد ہو،

اور اس میں کسی وارث کو نقصان نہ پہنچایا گیا ہو۔ مرنے والے کے لئے جائز نہیں کہ وہ محض ورثہ کو نقصان پہنچانے کی نیت سے کسی کے لئے وصیت کر جائے، یا کسی کا دَین باقی ہونے کا جھوٹا اقرار کرے؛ تاکہ ورثہ کو کم ملے اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا جاسکے، ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ یہ سب کچھ اللہ کا حکم ہے، اور اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا، بردبار ہے۔

میراث اور وصیت کے احکام ذکر کرنے کے بعد اخیر میں خاص طور پر متنبہ فرمایا گیا کہ یہ احکام من جانب اللہ ہیں، طبیعت قبول کرے یا نہ کرے، اس پر عمل کرنا واجب ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ خوب واقف اور آگاہ ہیں کہ کس کا کیا حصہ ہونا چاہئے؟ اس آیت میں میاں بیوی کی میراث کو بیان کیا گیا ہے حکم ہے کہ خاوند کو بیوی کے ترکہ میں سے آدھا ملے گا اس صورت میں کہ بیوی کی کوئی بھی اولاد نہ ہو۔ لیکن اگر بیوی کی کوئی بھی اولاد ہو موجودہ خاوند سے یا پہلے خاوند سے تو اس صورت میں مرد کو ترکہ میں سے ایک چوتھائی ملے گا۔ یہ ضروری ہے کہ میراث تقسیم کرنے سے پہلے میت کا قرض ادا کر دیا جائے اور وصیت پوری کر دی جائے۔ اسی طرح عورت کو خاوند کے ترکہ میں سے چوتھائی حصہ ملے گا جب کہ مرد کی کوئی اولاد نہ ہو۔ لیکن اولاد ہونے کی صورت میں آٹھواں حصہ ملے گا۔ یہاں بھی ضروری ہے کہ پہلے قرض اور وصیت پوری کر دی جائے۔ عورت کا مہر بھی قرض میں ہی شمار کیا جائے گا۔ ہر قسم کا مال ترکہ میں شمار ہوگا۔ زیورات، قیمتی دھاتیں، حویلی باغ یا زرعی زمین ہو۔ اسی طرح کلالہ کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ کلالہ کا مطلب ہے جس کے والدین اور اولاد، دادا، دادی اور پوتے، پوتیاں نہ ہوں۔ یہاں ایسے بھائی بہن کی میراث کا ذکر ہے جو صرف ماں میں شریک ہوں۔ حکم یہ ہے کہ باپ اور بیٹے کے ہوتے ہوئے بہن بھائی کو کچھ نہیں ملے گا اور اگر والدین اور اولاد نہ ہو تو پھر بہن اور بھائی کو میراث ملے گی۔ اس آیت میں ماں میں شریک بہن بھائی کا ذکر ہے۔ اگر مرنے والے کے ماں، باپ، بیٹا، بیٹی کچھ نہ ہو اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن اخیافی ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اخیافی بہن اور بھائی کا حصہ برابر ہے۔ دوسرے دو قسم کے بھائی بہن، یعنی عینی اور علاتی ان دونوں کو اولاد کی طرح حصہ ملے گا۔ شرط یہ ہے کہ میت کے والدین اور اولاد نہ ہو۔ اول حصہ دار عینی بھائی یا بہن ہے دوم حصہ دار علاتی ہوں گے عینی کے نہ ہونے

پر۔ اگر اخیافی بھائی یا بہن ایک سے زیادہ ہوں تو مال کا ایک تہائی ملے گا قرض ادا کرنا پہلے ضروری ہے اسی طرح وصیت کا پورا کرنا بھی ضروری ہے مگر اس میں ایک شرط ہے وہ یہ کہ وصیت میں دوسروں کو نقصان نہ پہنچایا گیا ہو، یعنی یا تو ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کی گئی ہو یا پھر جان بوجھ کر ایسی وصیت کی گئی ہو کہ جس سے جائز حقدار محروم کر دیئے گئے ہوں، لیکن اگر وارث اس کو قبول کرلیں تو پھر جائز ہے۔ پورے رکوع میں پانچ میراثوں کا بیان دیا گیا ہے۔ بیٹا، بیٹی، ماں، باپ، خاوند، بیوی، اخیافی بھائی بہن، ان سب کو حصہ دار کہتے ہیں۔ جب بھی میراث کی تقسیم کا ذکر ہوا تو تاکیداً کہا گیا کہ پہلے میت کا قرض ادا کرو، پھر جائز وصیت پوری کرو، پھر باقی بچے ہوئے مال کو اللہ کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق تقسیم کر دو۔ اللہ رب العزت خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ کس نے وراثت کی تقسیم میں ایمانداری کی اور کس نے ناانصافی یا نافرمانی کی؟ ایک اور قسم کا وارث بھی ہوتا ہے جو عصبہ کہلاتا ہے۔ (اسلامی قانونِ وراثت کی اصطلاح میں عصبہ وہ وارث ہے جس کا شریعت میں کوئی حصہ (قرآن وحدیث کے ذریعے) متعین نہیں ہوتا، اصطلاحی معنی میت کے وہ قریبی رشتہ دار جن کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، لیکن جب وہ اکیلے ہوں تو پورے ترکہ (موروثی مال) کے اکیلے حق دار بن جاتے ہیں، اور اگر کوئی "اصحابِ فرائض" (مقررہ حصوں والے ورثا) موجود ہوں تو اُن کا حصہ دینے کے بعد بچ جانے والا تمام مال عصبہ کو مل جاتا ہے۔) الغرض! عصبہ کا مطلب ہے وہ مرد جس کا میت سے عورت کے واسطے سے رشتہ نہ ہو اور اس کے چار درجے ہیں۔ 1 بیٹا اور پوتا۔ 2 باپ اور دادا۔ 3 بھائی اور بھتیجا۔ 4 چچا اور چچا کا بیٹا یا اس کا پوتا۔ اگر میت کا اصل حصہ داروں میں سے کوئی بھی نہ ہو تو تمام ترکہ عصبہ کو ملے گا ورنہ تمام حصہ داروں کو دینے کے بعد جو بچ جائے وہ عصبہ کو ملے گا۔ کچھ نہ بچے تو کچھ نہ ملے گا اور اگر عصبہ میں کئی لوگ ہوں تو پھر میت کے قریب ترین کو پہلے دیا جائے گا مثلاً پوتے سے پہلے بیٹا، بھتیجے سے پہلے بھائی اور سوتیلے سے پہلے سگا حصہ دار ہوگا۔ ان چاروں کے علاوہ اولاد میں اور بھائیوں میں مرد کے ساتھ عورت بھی عصبہ ہوتی ہے۔ آخر میں اللہ رب العزت کی دو صفات بیان کی گئی ہیں۔ علیم علم رکھنے والا اور حلیم انتہائی بردبار، یعنی وہ خوب جانتا ہے کہ انسان کی بھلائی اور بہتری کس اصول اور قانون میں ہے اور نرم خو اس لیے کہ اللہ نے جو بھی قوانین میراث کے

بارے میں بتائے ہیں ان پر عمل کرنا بالکل آسان ہے ذرا بھی مشکل نہیں۔

اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ	یہ اللہ کی حدیں ہیں	وَمَنْ	اور جو کوئی
يُّطِعِ اللّٰهَ	اللہ کی اطاعت کرے گا	وَرَسُوْلَهٗ	اور اس کے رسول کی
يُدْخِلْهُ	(تو) وہ اسے داخل کریگا	جَنّٰتٍ	ایسے باغوں میں کہ
تَجْرِيْ	چلتی ہیں	مِنْ تَحْتِهَا	ان کے نیچے
الْاَنْهٰرُ	نہریں	خٰلِدِيْنَ	وہ ہمیشہ رہیں گے
فِيْهَا ط	ان میں	وَذٰلِكَ	اور یہ ہے
الْفَوْزُ	کامیابی	الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾	بہت بڑی (۱۳)

فرمایا: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں، وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، وہ اس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ایسے لوگ ہمیشہ ان (باغات) میں رہیں گے، وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ اور یہ زبردست کامیابی ہے۔ان آیات میں وراثت کے کچھ اصول بیان کئے گئے ہیں اور ان پر سختی سے عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ یہ احکامات اور قانون مسلم ملت کو بیشمار جھگڑوں، فساد اور بے سکونی سے بچا سکتے ہیں۔ یہ تو صرف انسان کی بہتری کے لیے مقرر کئے گئے ہیں خود اللہ رب العزت کو تو اس میں کوئی فائدہ نہیں مگر ان آیات میں بہت سخت الفاظ میں خبردار کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بھی وجہ سے ان قوانین میں ردوبدل کرے گا تو اس کو رب العالمین جہنم کا عذاب ضرور دے گا اور یہ عذاب ہمیشہ کے لیے دیا جائے گا۔جیسا کہ کئی دفعہ بتایا جا چکا ہے کہ جہنم کا عذاب بڑا ہی شدید عذاب ہے۔مگر ساتھ ہی ان لوگوں کے لیے خوش خبری کا پیغام بھی دیا گیا ہے کہ جو شخص وراثت کی مقرر کی ہوئی حدوں، یعنی قانون اور اصول پر سختی سے عمل کرے گا اس کو دنیا میں بھی خوشی اور سکون ملے گا اور آخرت میں اس کو

جنت میں داخل کیا جائے گا جہاں ہر قسم کا آرام، سکون اور عیش ہی عیش ہوگا اور یہ بہترین ٹھکانہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دیا جائے گا۔ اللہ رب العزت ہماری مدد فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو قرآن و حدیث پر سختی سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں دنیا و آخرت میں بھلائی عطا کرے۔

میراث کے معاملہ میں کوتاہیاں

وَمَنْ	اور جو کوئی	يَّعْصِ اللّٰهَ	اللہ کی نافرمانی کرے گا
وَرَسُوْلَهٗ	اور اس کے رسول کی	وَيَتَعَدَّ	اور تجاوز کرے گا
حُدُوْدَهٗ	اس کی حدوں سے	يُدْخِلْهُ	(تو) وہ داخل کرے گا اس کو
نَارًا	آگ میں	خَالِدًا	وہ ہمیشہ رہے گا
فِيْهَا ۠	اس میں	وَلَهٗ	اور اس کے لیے ہے
عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۱۴		عذاب رسوا کن (۱۴)	

فرمایا: وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرے گا، اسے اللہ دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ اور اس کو ایسا عذاب ہوگا جو ذلیل کر کے رکھ دے گا۔ قانون میراث کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد قرآن مجید نے اس طرف متوجہ کیا ہے کہ یہ قوانین اللہ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں، ان سے تجاوز کرنا جہنم کو دعوت دینا ہے؛ اس لئے اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہئے، آج کل بعض حضرات لڑکیوں کو اور بیوہ ماں کو میراث کا حق نہیں دیتے، یہ صریحاً زیادتی اور سخت گناہ کا باعث ہے۔ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دارالعلوم دیوبند نے "مفید الوارثین" میں لکھا ہے کہ: "اللہ تعالیٰ کے واضح اور صریح حکم کو پس پشت ڈال کر ایک کافرانہ رسم پر عمل کرنا کوئی معمولی خطا نہیں ہے، نہایت سرکشی اور اعلیٰ درجے کا جرم ہے، بلکہ کفر تک پہنچ جانے کا اندیشہ ہے" آج ہم نے جہاں شریعت کے دیگر علوم سے غفلت برتی ہوئی ہے، وہاں پر علم میراث سے عوام تو عوام، خواص بھی ناواقف ہیں۔ یاد رہے کہ میراث کا علم شریعت میں نہ صرف مطلوب ہے، بلکہ اس کی بہت

زیادہ اہمیت بھی ہے، حضور اقدس ﷺ نے اسے نصف علم قرار دیا ہے۔ بہت سارے دیندار کہلانے والے لوگ جو نماز، روزہ اور دیگر اسلامی احکام کے پابند تو ہوتے ہیں، ان کو ادھر اُدھر بہت ساری باتیں، قصے، کہانیاں تو یاد رہتی ہیں، لیکن میراث کا کوئی ایک مسئلہ بھی ان کو معلوم نہیں، یہ انتہائی درجہ غفلت کی بات ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس غفلت سے محفوظ رکھے۔ یہ تفاصیل جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے میراث کے ضمن میں کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں جن پر رکنا، ان سے تجاوز نہ کرنا اور ان میں کوتاہی سے بچنا فرض ہے۔ یہ چند عام صورتیں بیان کر دی گئیں ورنہ میراث کی اتنی صورتیں بن جاتی ہیں کہ اس کی تفصیل کا یہ مختصر سا درس متحمل نہیں، اس سے ہٹ کر کوئی صورت پیش آئے تو مستند علمائے کرام اور مفتیان عظام سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

سزائے رجم/توبہ کس کی قبول ہے اور کس کی نہیں؟

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ
فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ
لَهُنَّ سَبِيْلًا ۱۵ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا
عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۱۶ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ
بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا
حَكِيْمًا ۱۷ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ
الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا
لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۱۸

زنا کی شرعی حد

وَالّٰتِيْ	اور وہ جو	يَاْتِيْنَ	کریں
الْفَاحِشَةَ	بے حیائی (کا کام)	مِنْ نِّسَآئِكُمْ	تمہاری عورتوں میں سے
فَاسْتَشْهِدُوْا	تو تم گواہ ٹھہرالو	عَلَيْهِنَّ	ان پر
اَرْبَعَةً	چار (مرد)	مِّنْكُمْ ۚ	اپنے میں سے

فَإِنْ	پھر اگر	شَهِدُوا	وہ گواہی دیں
فَأَمْسِكُوهُنَّ	تو انہیں بند رکھو	فِي الْبُيُوتِ	گھروں میں
حَتّٰى	یہاں تک کہ	يَتَوَفّٰهُنَّ	انہیں ختم کردے
الْمَوْتُ	موت	أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ	یا بنادے اللہ
لَهُنَّ	ان کے لیے	سَبِيلًا ⑮	کوئی راستہ (۱۵)

فرمایا: وَالّٰتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کریں، فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ ان پر اپنے میں سے چار گواہ بنا لو۔ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ: چونکہ زنا کی سزا نہایت سخت ہے، اس لیے اس پر گواہی بھی زیادہ مضبوط رکھی۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جو چیز شمار کی جارہی ہے، وہ مذکر ہو تو عدد مؤنث ہوتا ہے، اس لیے "اربعہ" کی وجہ سے ترجمہ "چار مرد" کیا ہے۔ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ چنانچہ اگر وہ (ان کی بدکاری کی) گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں روک کر رکھو۔ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا یہاں تک کہ انہیں موت اٹھا کر لے جائے، یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ پیدا کردے۔ اس آیت میں منکوحہ عورتوں کے ارتکاب زنا سے متعلق تین احکام دیئے گئے ہیں، اول: یہ کہ زنا کے ثبوت کے لئے کم سے کم چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے، دوسرے: یہ چاروں مرد گواہ ہونے چاہئیں، عورتوں کی گواہی اس جرم میں معتبر نہیں ہے، تیسرے: اگر ان گواہوں کی گواہی سے ان کا زنا کرنا ثابت ہوجائے تو فی الحال ان کی سزا یہ ہے کہ اس عورت کو مرنے تک گھر میں قید رکھا جائے، اس کے ساتھ قرآن نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ! ان کے لئے کوئی راستہ متعین کردے' اس کا مطلب یہ ہے کہ بدکاری پر قید کی یہ سزا ابھی عارضی طور پر مقرر کی گئی ہے، جب اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی مستقل سزا مقرر کردیں، تو پھر اس کے مطابق ان پر سزا جاری کی جائے گی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مستقل سزا بھی مقرر فرمادی اور وہ یہ کہ اگر زناکار غیر شادی شدہ ہو، چاہے مرد ہو یا عورت، تو اسے سو کوڑے مارے جائیں، (النور: ۲) اور شادی شدہ مرد و

عورت کے زنا کی سزا یہ ہے کہ اسے سنگسار کر دیا جائے، بکثرت حدیثوں میں اس کا ذکر موجود ہے، اور عہد نبوی وخلافت راشدہ میں بھی اور اس کے بعد بھی اسلامی حکومتوں میں شادی شدہ زانی کے حق میں اس سزا کا تعامل رہا ہے۔ (دیکھئے: مسلم، باب حد الزنا، حدیث نمبر: ۴۴۱۴)

مردوں اور عورتوں کے درمیان ربط ہی معاشرے کی بنیاد بنتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس ابتدائی ربط کو قانون کا پابند فرما دیا ہے۔ اگر مرد وزن کا یہ ربط قانون کے تابع عقد نکاح کے ذریعے قائم ہوگا تو آگے نسل بھی ٹھیک ہوگی۔ انسانی اخلاق درست ہوگا انسانی سوسائٹی پاکیزہ ہوگی اور سوسائٹی کے تمام افراد اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے اور اگر یہ اولین ربط ہی لاقانونیت کا شکار ہوگیا۔ ربط کی ابتدا نکاح کی بجائے فحاشی سے شروع ہوئی تو پھر انسانی سوسائٹی تباہ و برباد ہو جائے گی۔ نسل بگڑ جائے گی انسان کا اخلاق تباہ ہو جائے گا۔ دنیا میں ذلت کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آخرت میں سخت رسوائی ہوگی۔ چنانچہ اس ربط کو خراب کرنے والا عمل قابل تعزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سوسائٹی سے عیاشی اور زنا جیسے قبیح فعل کے خاتمے کے لیے ابتدائی طور پر یہ تعزیر لگائی۔ احکام وراثت کے بعد اب دوسری معاشرتی برائیوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن میں سرفہرست زنا اور فحاشی ہے۔ زنا کے لیے گواہیوں کا نصاب چار مردوں کی گواہی ہے اور یہ سب عاقل، بالغ اور قابل اعتماد ہونے چاہئیں۔ ان کڑی سزاؤں کے ساتھ چار گواہوں کا نصاب مقرر کرنے میں غالباً حکمت الٰہی یہ ہے کہ اگر کوئی ایک آدھ شخص کسی کو زنا کرتے دیکھ بھی لے تو اس برائی کو ظاہر کرنے یا پھیلانے کی ہرگز کوشش نہ کرے۔ زنا کے گواہ دراصل خود مجرم کی حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے ہیں اور اگر خدانخواستہ زنا کے گواہوں میں سے کسی ایک کی گواہی بھی نامکمل رہے یا مشکوک ہو جائے تو زانی بچ جائے گا اور گواہوں پر قذف کی حد پڑ جائے گی۔ اس لیے زنا کی گواہی کے لیے جانا اور گواہی دینا بذات خود بڑا خطرناک کام ہے۔

ہم جنس پرستی کی سزا

وَالَّذٰنِ	اور وہ دو مرد جو	يَاْتِيٰنِهَا	کریں یہی (بے حیائی کا کام)
مِنْكُمْ	تم میں سے	فَاٰذُوْهُمَا ۚ	تو انہیں ایذا دو

فَاِنۡ	پھر اگر	تَابَا	وہ دونوں توبہ کریں
وَاَصۡلَحَا	اور دونوں اصلاح کرلیں	فَاَعۡرِضُوۡا	تو درگزر کرو
عَنۡهُمَا ؕ	ان دونوں سے	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	بلاشبہ اللہ ہے
تَوَّابًا	بہت توبہ قبول کرنے والا	رَّحِيۡمًا ⑯	نہایت رحم کرنے والا (١٦)

فرمایا: وَ الَّذٰنِ يَاۡتِيٰنِهَا مِنۡكُمۡ فَاٰذُوۡهُمَا اور تم میں سے جو دو مرد بدکاری کاارتکاب کریں، ان کو اذیت دو، وَ الَّذٰنِ یہ تثنیہ کا صیغہ ہے اور مراد ہے دو مرد يَاۡتِيٰنِهَا مِنۡكُمۡ جو تم میں سے بے حیائی کا کام کرتے ہیں یعنی زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہاں والَّذَانِ سے مراد اغلام یا لواطت لی گئی ہے یعنی ایسی بدفعلی جو دو مرد آپس میں کرتے ہیں۔ اور ان پر بھی حد نہیں بلکہ تعزیر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم جنسی کے جرم پر زنا کی حد نہیں لگے گی بلکہ ان کے لیے قاضی کی صوابدید کے مطابق تعزیر ہوگی۔ فرماتے ہیں کہ ہم جنسی کو زنا کا مصداق نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ زنا ایسا فعل ہے جو کسی مقام پر جا کر رک جاتا ہے مثلاً اگر زانی مرد اور زانیہ عورت اس فعل کے ارتکاب کے بعد آپس میں یا کسی دوسری جگہ نکاح کرلیں تو یہ فعل رک جائے گا مگر لواطت ایسا فعل ہے جس کی حرمت ہمیشہ قائم رہتی ہے اس لیے ہم جنسی زنا سے زیادہ شدید جرم ہے اور اس پر سخت تعزیر ہونی چاہیے۔ اگر کوئی عادی مجرم ہے تو اسے کسی اونچے مینار سے گرا کر ہلاک کر دیا جائے یا اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ جرم کی نوعیت کے اعتبار سے اسے قید میں ڈالا جاسکتا ہے یا کوڑے لگائے جاسکتے ہیں بہرحال یہ حاکم وقت کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ کیا سزا تجویز کرتا ہے۔ فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَا اگر وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے درگزر کرو۔ یعنی اگر وہ توبہ کرلیں اور اس برائی سے پرہیز کریں تو اب ان سے تعرض نہ کیا جائے، اور ان پر طعن و تشنیع وغیرہ سے گریز کیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ حکم زنا کی سزا نازل ہونے سے پہلے کا ہے، اب قاضی کے سامنے اگر کسی کا یہ جرم ثابت ہوجائے تو محض توبہ کرلینا کافی نہیں ؛ بلکہ اس پر زنا کی سزا جاری کی جائے گی الغرض! ہم جنس پرستی زنا سے زیادہ بدتر جرم ہے سابقہ امتوں میں سے حضرت لوط علی نبینا وعلیہ السلام کی امت پر اسی قبیح

عمل کو اختیار کرنے کی وجہ سے عذاب آیا تھا ان کی بستی کو اوپر اٹھا کر زمین پر الٹ دیا گیا تھا اور پھر پتھروں کی بارش برسائی گئی تھی جس سے پوری قوم ہلاک ہوگئی تھی لہذا اس جرم کی شدت زنا سے زیادہ ہے اور اس کی سزا بھی زنا سے زیادہ سخت ہے مثلاً فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اس عمل میں مبتلاء شخص کو قاضی سخت سے سخت سزا دے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہاں تک منقول ہے کہ اس شخص کو پہاڑ سے نیچے گرا کر اس پر پتھر برسائے جائیں اس لئے کہ اللہ تعالی نے اس عمل میں مبتلاء قوم کو یہی سزا دی ہے یا آگ میں جلا دے یا اور جو سخت سے سخت سزا دینا چاہے دے سکتا ہے۔ نیز اس عمل کی اخروی سزا بھی بہت زیادہ ہے کل قیامت کے دن جب ہر شخص اللہ تعالی کے رحم و کرم کا بہت زیادہ محتاج ہوگا اس عمل کے کرنے والا اللہ تعالی کی نگاہ شفقت اور رحمت سے محروم رہے گا اِنَّ اللہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا بیشک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز آپ پر وحی نازل ہوئی اور جب وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ سے (اللہ کا حکم) سیکھ لو۔ اللہ نے ایسی عورتوں کے لیے سزا تجویز کر دی۔ شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت اگر زنا کریں تو انہیں سو کوڑے مارے جائیں۔ پھر رجم کیا جائے اور اگر کنوارہ مرد اور کنواری عورت زنا کریں تو ان کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔ (مسلم، کتاب الحدود۔ باب حد الزنا) چنانچہ اسی سلسلہ میں بعد میں سورہ نور کی یہ آیت نازل ہوئی۔ اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ یعنی زانی عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔ قرآن پاک میں یہ سزا غیر شادی شدہ مرد و زن کے لیے ہے۔ محصنٰت یعنی شادی شدہ مرد اور عورتوں کی سزا سنت کے مطابق رجم ہے۔ مجرم کو پتھر مار مار کر ختم کر دیا جائے گا۔ البتہ غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑوں کے علاوہ اگر حاکم مجاز مناسب سمجھے تو ایک سال کے لیے شہر بدر بھی کر سکتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے امام شافعی رحمہ اللہ شہر بدری کی سزا کو سو کوڑوں کے ساتھ لازم قرار دیتے ہیں یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ فعل زنا کے متعلق اگر چار عینی گواہ نہ مل سکیں تو ملزم کے اقرار پر بھی مقررہ سزا دی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی مثال حضور ﷺ کے اپنے زمانہ مبارک میں ملتی

ہے۔ماعز بن مالک سلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے جرم زنا کا چار دفعہ اقرار کیا تو آپ نے اسے رجم کی سزادی۔

خطاکاروں میں بہترین جلدی توبہ کرنے والے ہیں

اِنَّمَا	یقیناً	التَّوْبَةُ	توبہ (کا قبول کرنا)
عَلَى اللّٰهِ	اللہ کے ذمے	لِلَّذِيْنَ	انہی لوگوں کے لیے ہے جو
يَعْمَلُوْنَ	کرتے ہیں	السُّوْٓءَ	برا کام
بِجَهَالَةٍ	جہالت سے	ثُمَّ	پھر
يَتُوْبُوْنَ	وہ توبہ کر لیتے ہیں	مِنْ قَرِيْبٍ	جلدی ہی
فَاُولٰٓئِكَ	تو یہی لوگ ہیں	يَتُوْبُ اللّٰهُ	(کہ) متوجہ ہوتا ہے اللہ
عَلَيْهِمْ ؕ	ان پر (یعنی توبہ قبول کرلیتا ہے)	وَكَانَ اللّٰهُ	اور ہے اللہ
عَلِيْمًا	بہت جاننے والا	حَكِيْمًا ⑰	خوب حکمت والا (۱۷)

فرمایا اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ اللہ نے توبہ قبول کرنے کی جو ذمہ داری لی ہے وہ ان لوگوں کے لیے جو نادانی سے کوئی برائی کرڈالتے ہیں، ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ چنانچہ اللہ ان کی توبہ قبول کرلیتا ہے، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا اور اللہ ہر بات کو خوب جاننے والا بھی ہے، حکمت والا بھی۔حضرتِ سیّدُنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر انسان بہت خطا کار ہے، اور بہت خطائیں کرنے والوں میں سب سے بہتر توبہ کرنے والے ہیں۔علیٰ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرنا اللہ پر واجب ہے یا وہ ضرور توبہ قبول کرتا ہے اور یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرنا اپنے لیے واجب کرلیا ورنہ وہ تو مختار مطلق ہے۔اور دوسری قسم عدم شرط سے پیدا ہو جاتی ہے یعنی وہ لوگ جو گناہ تو نادانستہ طور پر ہی کرتے ہیں مگر معلوم ہو جانے پر توبہ میں جلدی نہیں کرتے بلکہ تاخیر

کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرنے کا اللہ نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ چاہے تو قبول کرلے اور چاہے تو نہ کرے۔ تیسری قسم اس مسلمان کی ہے جسے عمر بھر تو توبہ کا خیال نہ آیا اور اگر خیال آیا بھی تو موت کے وقت، ایسے شخص کے متعلق واضح طور پر فرما دیا کہ اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ اور چوتھی قسم جو توبہ کیے بغیر کفر ہی کی حالت میں مر گیا اس کی بھی موت کے وقت توبہ قبول نہیں ہوسکتی۔

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت فرماتا ہے کہ وہ ظلم و زیادتی کو پسند نہیں کرتا لھٰذا اگر کسی سے گناہ ہو جائے تو اسے چاہیے فوراً خلوص نیت سے اللہ سے معافی مانگ لے تو اس کی توبہ یقیناً قبول کرلی جائے گی۔ توبہ کرنے کی شرائط تین یا چار ہیں: اول اپنے کیئے پر ندامت محسوس کرے۔ دوم جس گناہ پر توبہ کی ہے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے۔ سوم دوبارہ وہ کام نہ کرنے کا عہد کرے۔ چہارم اگر اس کا تعلق کسی انسان سے ہو تو اس سے معافی مانگے یا اس کا حق واپس کرے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا، کہ انسان سے جب کوئی غلطی ہو جائے تو وہ اللہ کے سامنے نادم و شرمسار ہو، آئندہ اس برائی سے بچنے کا عزم مصمم ہو اور برائی سے اجتناب بھی ہو تو اللہ اس کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں، صرف زبان سے توبہ کے الفاظ کہہ دینا کافی نہیں۔ گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے توبہ کی قبولیت کے لیے دو باتوں کی قید لگا دی۔ ایک تو یہ کہ وہ گناہ از راہ نادانی، جہالت یا نادانستہ طور پر سرزد ہوا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اس قصوروار کو بعد میں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ اللہ کے حضور توبہ کرے اور اگر اس کے برعکس معاملہ ہو یعنی گناہ بھی دانستہ طور پر اور اللہ کے احکام پر دلیر ہو کر کیا گیا ہو یا گناہ تو نادانستہ واقع ہوا ہو مگر توبہ میں عمداً تاخیر کرتا جائے تو ایسی صورتوں میں توبہ کے قبول ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

عالم نزع سے پہلے توبہ

وَلَيْسَتِ	اور نہیں	التَّوْبَةُ	توبہ (قبول ہوتی)
لِلَّذِيْنَ	ان لوگوں کی جو	يَعْمَلُوْنَ	کرتے (رہتے) ہیں
السَّيِّاٰتِ ۚ	(کام) برے	حَتّٰٓى	یہاں تک کہ

اِذَا حَضَرَ	جب آتی ہے	اَحَدَھُمُ	ان میں سے ایک کو
الۡمَوۡتُ	موت	قَالَ	(تو) وہ کہتا ہے
اِنِّیۡ	بیشک میں نے	تُبۡتُ	توبہ کی
الۡـٰٔنَ	اب	وَلَا	اور نہ (ہی)
الَّذِیۡنَ	ان لوگوں کی جو	یَمُوۡتُوۡنَ	مرتے ہیں
وَھُمۡ کُفَّارٌ ؕ	اس حال میں کہ وہ کافر ہی ہوتے ہیں	اُولٰٓئِکَ	یہ لوگ
اَعۡتَدۡنَا	ہم نے تیار کیا ہے	لَھُمۡ	ان کیلیے
عَذَابًا	عذاب	اَلِیۡمًا ﴿۱۸﴾	بہت دردناک (۱۸)

فرمایا: وَلَیۡسَتِ التَّوۡبَۃُ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ توبہ کی قبولیت ان کے لیے نہیں جو برے کام کیے جاتے ہیں، حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الۡمَوۡتُ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت آکھڑا ہوتا ہے۔ موت کے آکھڑے ہونے سے مراد ''غرغرہ'' کی کیفیت ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے، کہ اس وقت کی توبہ قبول نہ ہوگی؛ کیوں کہ اب غیب کی حقیقتیں بندہ کی نظر کے سامنے آجاتی ہیں اور توبہ تو اللہ تعالیٰ کے غیبی نظام پر یقین رکھنے کے ساتھ نادم وشرمسار ہونے کا نام ہے۔ قَالَ اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَلَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ وَھُمۡ کُفَّارٌ تو وہ کہتا ہے کہ میں نے اب توبہ کر لی ہے، اور نہ ان کے لیے ہے جو کفر ہی کی حالت میں مرجاتے ہیں۔ حالتِ کفر میں مرنے سے مراد یہ ہے کہ جو موت کے بالکل قریب ہوں، اس کافر کا عین موت کے وقت توبہ کرنا معتبر نہیں، یا یہ مراد ہے کہ کافر اگر آخرت میں کفر سے توبہ کرے تو اللہ ایسی توبہ قبول نہ فرمائیں گے؛ کیوں کہ آخرت عمل کی دنیا نہیں ہے، جزاء وسزا کی دنیا ہے۔ اُولٰٓئِکَ اَعۡتَدۡنَا لَھُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دکھ دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ جب انسان پر نزع

کا عالم طاری ہو جائے، وہ موت کے آثار دیکھ لے اور اسے روح قبض کرنے والے فرشتے نظر آنے لگیں تو توبہ کا وقت ختم ہو چکا۔ کیونکہ اب وہ دار الامتحان سے نکل کر دار الآخرت کی سرحد پر کھڑا ہے اور توبہ ایک عمل ہے جس کا وقت گزر چکا۔ اس آیت میں دو طرح کے لوگوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو تھے تو مسلمان مگر ساری عمر گناہ کرتے کرتے ہی گزار دی اور دوسرے وہ جو کافر تھے پھر اسی کفر کی حالت میں مر گئے۔ دونوں طرح کے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

جاہلیت میں عورت ترکہ کا مال تھا / طلاق دیتے وقت عورت سے مال ہتھیانے کی کوشش

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرۡہًا ؕ وَ لَا تَعۡضُلُوۡہُنَّ
لِتَذۡہَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ ۚ وَ عَاشِرُوۡہُنَّ
بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ فَاِنۡ کَرِہۡتُمُوۡہُنَّ فَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّ یَجۡعَلَ اللّٰہُ فِیۡہِ خَیۡرًا
کَثِیۡرًا ﴿۱۹﴾ وَ اِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّکَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰہُنَّ
قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡہُ شَیۡئًا ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَہٗ بُہۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۲۰﴾ وَ کَیۡفَ
تَاۡخُذُوۡنَہٗ وَ قَدۡ اَفۡضٰی بَعۡضُکُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ وَّ اَخَذۡنَ مِنۡکُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا ﴿۲۱﴾ وَ لَا
تَنۡکِحُوۡا مَا نَکَحَ اٰبَآؤُکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً
وَّ مَقۡتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِیۡلًا ﴿۲۲﴾

فَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ، کی دو تفسیریں

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوۡا	ایمان لائے ہو!
لَا یَحِلُّ	نہیں ہے حلال	لَکُمۡ	تمہارے لیے

اَنْ تَرِثُوا	یہ کہ تم وارث ہو جاؤ	النِّسَآءَ	عورتوں کے
كَرْهًا ؕ	زبردستی	وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ	اور نہ تم انہیں روکو
لِتَذْهَبُوْا	تاکہ تم لے لو	بِبَعْضِ	کچھ (حصہ)
مَآ	اس (حق مہر) کا جو	اٰتَيْتُمُوْهُنَّ	تم نے انہیں دیا
اِلَّآ	مگر	اَنْ يَّاْتِيْنَ	یہ کہ وہ کریں
بِفَاحِشَةٍ	بے حیائی	مُّبَيِّنَةٍ ۚ	کھلی
وَعَاشِرُوْهُنَّ	اور تم ان کے ساتھ گزر بسر کرو	بِالْمَعْرُوْفِ	خوش اسلوبی سے
فَاِنْ	پھر اگر	كَرِهْتُمُوْهُنَّ	تم ان کو ناپسند کرو
فَعَسٰٓى	تو شاید	اَنْ تَكْرَهُوْا	کہ تم ناپسند کرو
شَيْـًٔا	کسی چیز کو	وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ	اور کر دے اللہ
فِيْهِ	اس میں	خَيْرًا كَثِيْرًا ⑲	بھلائی بہت (۱۹)

فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا اے ایمان والو! یہ بات تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن بیٹھو، وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ اور ان کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ تم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ لے اڑو، الا یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں، فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (کھلی ہوئی بے حیائی) کی دو تفسیریں منقول ہیں، اول: عورت کی بدزبانی اور بدکلامی، اس تفسیر کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر خود عورت بدزبان اور بدمزاج ہو اور اس کی وجہ سے شوہر مہر کا کچھ حصہ واپس لے کر طلاق دے تو اس کی گنجائش ہے، دوسری تفسیر زنا سے کی گئی ہے، اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ اگر بیوی زنا میں پکڑی جائے تو یہ بات درست ہے کہ مہر واپس لے کر اسے گھر سے نکال دیا جائے، یہ حکم اس زمانے کا ہے جب تک کہ زنا کی سزا مقرر نہیں ہوئی تھی، اب زنا کی وجہ سے کسی عورت کو مہر سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ اوران کے ساتھ بھلے انداز میں زندگی بسر کرو فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا اور اگر تم انہیں پسند نہ کرتے ہو تو یہ عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى یہ بھی ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہنے کی بات کی تکمیل ہے، یعنی اگر کسی اخلاقی کمزوری یا بدصورت ہونے کی وجہ سے تمہیں ان سے نفرت ہو جائے اور ان کو طلاق دینا چاہو تو بھی فوراً طلاق نہ دو، بلکہ بہتر طریقے سے انھیں اپنے پاس رکھو، ہوسکتا ہے کہ ان کی صحبت سے خیر کثیر، یعنی صالح اولاد حاصل ہو جائے یا مال میں برکت ہو جائے اور تمہاری نفرت محبت میں تبدیل ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی مومن اپنی مومنہ بیوی سے بغض نہ رکھے، اگر اسے اس کی کوئی ایک عادت ناپسند ہوگی تو دوسری پسند بھی ہوگی۔“ [مسلم، الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء: 1467، عن أبی ہریرہ ؓ] اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اگر نفرت کے سبب تم ان سے علیحدگی اختیار کرنا چاہو تو ہوسکتا ہے کہ اس علیحدگی میں ان کے لیے خیر کثیر مضمر ہو، مثلاً ان کو بہتر خاوند مل جائے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ عربوں میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص مرتا تو اس کی بیوی پر میت کے وارثوں کا زور چلتا تھا (وہ بھی ترکہ ہی تصور ہوتی تھی) چاہتے تو خود اس سے نکاح پڑھا لیتے، چاہتے تو کسی اور سے نکاح کر دیتے اور چاہتے تو اسے بلا نکاح ہی رہنے دیتے۔ غرض اس پر خاوند کے وارثوں کا اختیار تھا، عورت کے وارثوں کا کچھ بھی اختیار نہ تھا۔ پھر یہ آیت اتری (جس سے عورتوں کو پوری آزادی مل گئی۔) (بخاری، کتاب التفسیر)

جاہلیت کے زمانے میں یہ دستور تھا کہ مرنے والے کا مال تو اڑا ہی لیا جاتا تھا بلکہ اس کی بیوہ کو بھی اپنی ہی ملکیت سمجھ کر رکھ لیا جاتا تھا۔ یا تو خود عورت کا دیور یا جیٹھ وغیرہ اس سے نکاح کر لیتا یا کسی سے رقم لے کر اس سے بیوہ کا نکاح کروا دیا جاتا یا پھر بغیر نکاح کے ہی عمر بھر کے لیے اس کو اپنے پاس زبردستی رکھ کر اس کے تمام مال پر قبضہ کر لیا جاتا اس ظلم سے پوری طرح منع کر دیا گیا اور صاف

طور پر حکم دیا گیا کہ شوہر کے مرنے کے بعد عورت (بیوہ) کو پورا اختیار حاصل ہے جہاں چاہے رہے اور عدت پوری کرنے کے بعد جس سے چاہے نکاح کرے یا نہ کرے۔

ایک اور ظلم جو عورتوں پر ہوتا کہ اگر بیوہ کہیں نکاح کرنا چاہتی تو ورثا اس میں رکاوٹ ڈالتے، تاکہ بیوہ کا مال باہر نہ چلا جائے اس بات سے بھی سختی سے منع کیا گیا ہے۔اس آیت میں اس بات سے روکا گیا ہے کہ اگر تم بیوی کو طلاق دے دو تو مہر کی رقم اس سے واپس لینے کی تمہیں ہرگز اجازت نہیں، یا اگر تم زبردستی اس سے مہر کی رقم معاف کرواؤ یا مہر دے کر واپس لینے کیلئے عورت پر ظلم وستم کرو یہ سب ناجائز ہے، کیونکہ یہ عورت پر ظلم ہے جس کی اجازت اللہ نے دی ہے نہ رسول ﷺ نے۔ ہاں، ایک صورت میں مہر کی واپسی یا معافی کی اجازت ہے وہ یہ کہ اگر عورت صاف طور سے بدکاری یا بدچلنی کرتے ہوئے دیکھی جائے تو پھر مہر واپس لیا جائے یا معاف کروایا جائے تو جائز ہے مگر اس میں تحقیق اور انصاف کا بے حد خیال رکھا جائے، تاکہ غلطی میں کسی عورت پر ظلم نہ ہو جائے، کیونکہ اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے کسی بھی مخلوق پر ظلم کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔

آیت کے آخر میں میاں بیوی کا ایک مسئلہ اور بھی حل کر دیا گیا تاکہ معاشرے میں شر وفساد نہ پھیلے۔حکم ہے کہ مرد کو طلاق دینے میں ہرگز جلدی نہیں کرنی چاہئے۔اصلاح کے لیے طلاق کی اجازت ضرور دی گئی ہے مگر ساتھ ہی طلاق کو حلال باتوں میں سب سے ناپسندیدہ کام بھی کہا گیا ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں مردوں کو چاہیے بڑے صبر، سکون اور سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے اپنی اس بیوی کو موقع دیں۔کیونکہ ہو سکتا ہے وہی ناپسندیدہ بیوی کسی دوسرے وصف (صفت) یا فائدہ کی وجہ سے مرد کو پسند آنے لگے۔ہو سکتا ہے اللہ رب العزت نے اسی بیوی کو ہی خاوند کے لیے باعث برکت بنا رکھا ہو جو وقت گزرنے پر ظاہر ہونے لگے اور میاں بیوی کی محبت کا سبب بن جائے اور یوں ایک گھر برباد ہونے سے بچ جائے۔قربان جائیں اللہ کے قانون پر کیسی کیسی حکمتیں، کیسے کیسے فائدے انسان کے لیے بیان کئے جاتے ہیں جو خود انسان کی عقل سے باہر ہیں وہ علیم (جاننے والا) حکیم (حکمت والا) اور حلیم (نرم خو) اتنا زیادہ اتنا زیادہ ہے کہ انسان تو سوچ بھی نہیں سکتا۔

بیوی پر بہتان لگا کر اس کو طلاق دینا اور مہر کا واپس لینا قبیح عمل

وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ	اور اگر تم چاہو	اسۡتِبۡدَالَ	بدلنا
زَوۡجٍ	ایک بیوی کا	مَّكَانَ زَوۡجٍ ۙ	ایک بیوی کی جگہ
وَّاٰتَيۡتُمۡ	جب کہ تم نے دیا ہو	اِحۡدٰٮهُنَّ	ان میں سے ایک کو
قِنۡطَارًا	بہت سا مال	فَلَا	تو نہ
تَاۡخُذُوۡا	(واپس) لو تم	مِنۡهُ	اس میں سے
شَيۡـــًٔا ؕ	کچھ بھی	اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ	کیا تم لوگے اسے
بُهۡتَانًا	بہتان باندھ کر	وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ۝۲۰	اور گناہ صریح سے (۲۰)

فرمایا وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ اور اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہتے ہو وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـــًٔا اور ان میں سے ایک کو ڈھیر سارا مہر دے چکے ہو، تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا کیا تم بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے (مہر) واپس لو گے؟

عام طور پر جب کوئی مرد کسی عورت کے دام فریب میں آ کر پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہو تو پہلی بیوی کو اس نے جو کچھ دیا ہو، اس کو وصول کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈتا ہے، اس کے کردار پر یا مزاج وسلوک کے بارے میں تہمتیں لگاتا اور ظلم کا راستہ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس غیر شریفانہ طرز عمل کی مذمت فرمائی ہے۔ کسی پر بغیر تحقیق وثبوت کے الزام لگانا شرعاً کبیرہ گناہ اور حرام ہے، ازدواجی زندگی میں زوجین کا آپس میں ایک دوسرے پر اعتماد کے بغیر اس رشتے کو احسن طریقے سے نبھانا ممکن نہیں، ایک دوسرے پر بے جا شک وشبہ، بے بنیاد باتوں کو ہوا دے کر اپنے گھر کو اجاڑنا نہ شریعت کی نظر میں درست ہے، نہ دانش مندی کے موافق ہے ایسے شخص پر ندامت اور توبہ واستغفار کے ساتھ، جس پر بہتان لگایا گیا ہو، اس سے معافی مانگنا بھی لازم ہے غرضیکہ اس آیت میں مہر کے لئے 'قنطار' یعنی 'بہت سارا مال' کا لفظ فرمایا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ

زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد نہیں ہے؛ اگرچہ استطاعت سے زیادہ مہر مقرر کرنا بہتر نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار مقرر کرنی چاہی، تو ایک خاتون نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے اس سے اختلاف کیا اور آپ نے رجوع فرمالیا۔ (السنن الکبری للبیهقي، حدیث نمبر: ۱۴۱۱۴)

فرمایا کہ حق مہر یا کوئی اور دیا ہوا مال واپس لینے کے لیے یا بیوی کو ستانے کے لیے مرد کو اس حرکت کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ بہتان یا تہمت لگائے ایک پاکدامن بیوی پر۔ تہمت لگانے کا بہت بڑا عذاب اور سخت ترین سزا مقرر ہو چکی ہے تو جو بھی یہ کام کرے گا اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک تو کسی شریف، نیک اور پکے مومن کی شان کے خلاف ہے کہ دیا ہوا مال واپس لے اور دوسرے اللہ رب العزت کی پکڑ بڑی سخت اور اس کے لیے بڑا عذاب ہے، ان تمام احکامات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورت کو کس قدر محترم اور باعزت ٹھرایا ہے اور ہر صورت سے مرد کے ظلم وستم سے اس کو پوری طرح بچایا ہے۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ عورت مظلوم ہے ہاں، دوسرے مذاہب میں اب بھی ترقی یافتہ مما لک میں عورت کو مظلوم بنایا جارہا ہے۔ اور عورتوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جارہے ہیں۔

پختہ عہد سے مراد

وَ كَيْفَ	اور کیسے	تَأْخُذُوْنَهٗ	لوگے تم اسے
وَقَدْ	جبکہ تحقیق	اَفْضٰى	ملاپ کر چکا ہے
بَعْضُكُمْ	ایک تمہارا	اِلٰى بَعْضٍ	دوسرے سے
وَّاَخَذْنَ	اور ان عورتوں نے لیا ہے	مِنْكُمْ	تم سے
مِّيْثَاقًا	عہد	غَلِيْظًا ۲۱	پختہ (۲۱)

فرمایا: وَ كَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ اور آخر تم کیسے (وہ مہر) واپس لے سکتے ہو وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ جبکہ تم ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو چکے تھے وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ

مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا اور انہوں نے تم سے بڑا بھاری عہد لیا تھا؟ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا : "پختہ عہد" سے مراد عقد نکاح ہے، یعنی تمہارا یہ کہنا کہ میں نے فلاں عورت سے نکاح قبول کیا۔ "کہ تم" اسے اچھے طریقے سے آباد کرنا یا احسان کے ساتھ چھوڑ دینا"۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخر تمہاری غیرت یہ کس طرح گوارا کر سکتی ہے کہ جس کے ساتھ تم نے نکاح کر کے پکا عہد کیا ساتھ رہنے کا اور پھر صرف نکاح ہی نہیں کیا، بلکہ نکاح کے بعد تم دونوں ساتھ اکٹھے رہے اور ایک دوسرے سے پوری طرح لطف اندوز ہوئے اس سے تم دیا ہوا مال یا مہر واپس لے لو، یعنی جس عورت کی عصمت سے تم فائدہ اٹھا چکے ہو اور عقد نکاح کے ذریعہ جس سے حسن سلوک کا مضبوط عہد کر چکے ہو، کسی شریف انسان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنا دیا ہوا مہر اس سے واپس لے۔

حرمت مصاہرت

وَلَا تَنْكِحُوْا	اور نہ تم نکاح کرو	مَا نَكَحَ	جن سے نکاح کیا
اٰبَآؤُكُمْ	تمہارے باپوں نے	مِّنَ النِّسَآءِ	عورتوں سے
اِلَّا مَا	مگر جو	قَدْ سَلَفَ ؕ	پہلے گزر چکا
اِنَّهٗ كَانَ	بلاشبہ یہ ہے	فَاحِشَةً	بے حیائی (کا کام)
وَّمَقْتًا ؕ	اور ناراضی کی بات	وَسَآءَ	اور برا ہے
سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾		طریقہ (۲۲)	

فرمایا: وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اور جن عورتوں سے تمہارے باپ دادا (کسی وقت) نکاح کر چکے ہوں، تم انہیں نکاح میں نہ لاؤ، اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ البتہ پہلے جو کچھ ہو چکا وہ ہو چکا۔ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِيْلًا یہ بڑی بے حیائی ہے، گھناؤنا عمل ہے، اور بے راہ روی کی بات ہے۔ مفسرین کرام اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مطلقاً نکاح کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سوتیلی ماں کے حرام ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ باپ نے اس عورت کے ساتھ نکاح کیا تھا۔ حرمت نکاح کے لیے باپ کی طرف سے مباشرت ضروری

نہیں جب کسی شخص کے باپ نے کسی عورت سے نکاح کرلیا تو وہ عورت اس شخص کے بیٹے کے لیے ابدی حرام ہوگئی۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ آیت کریمہ میں اباؤکم یعنی باپ کا ذکر ہے۔ مگر باپ سے مراد اوپر تک پوری نسل ہے۔ یعنی نہ صرف باپ کی منکوحہ حرام ہے بلکہ دادا اور پر دادا کی منکوحہ بھی اگر ہو تو اس کے ساتھ بھی نکاح حرام ہے۔ اسی طرح نیچے کی طرف بیٹے کے حکم میں پوتا اور پڑ پوتا بھی شامل ہیں۔ جو عورت بیٹے کے لیے حرام ہے وہ پوتے اور پڑ پوتے کے لیے بھی ویسے ہی حرام ہے۔ یاد رہے کہ سوتیلی ماں حقیقی ماں کی ہی طرح محرم ہے۔ بیٹا اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ خلوت میں بیٹھ سکتا ہے اس کے ساتھ سفر کرسکتا ہے اور ماں کو اس سے پردہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ وہ حقیقی ماں ہی کی قائم مقام ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اپنے باپ کو منکوحہ کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتے البتہ جو کچھ پہلے ہو چکا وہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھا۔ اب آئندہ کے لیے ایسی عورتیں تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی ہیں۔ بہر حال ان آیات میں فرمایا گیا" کہ بے حیائی اور نشوز وعصیان کے علاوہ اگر بیوی میں کچھ اور کوتاہیاں ہوں جن کی وجہ سے خاوند اسے ناپسند کرتا ہو تو اسے جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے طلاق نہ دے بلکہ صبر اور برداشت سے کام لے، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں سے اس کے لئے خیر کثیر پیدا فرما دے۔ یعنی نیک اولاد دے دے یا اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے کاروبار میں برکت ڈال دے، وغیرہ وغیرہ۔ افسوس ہے کہ مسلمان قرآن وحدیث کی ان ہدایات کے برعکس ذرا ذرا سی باتوں میں اپنی بیویوں کو طلاق دے ڈالتے ہیں اور اس طرح اسلام کے عطا کردہ حق طلاق کو نہایت ظالمانہ طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حق تو انتہائی ناگزیر حالات میں استعمال کے لئے دیا گیا تھا، نہ کہ گھر اجاڑنے، عورتوں پر ظلم کرنے اور بچوں کی زندگیاں خراب کرنے کے لئے۔

رضاعت کے رشتے اور رضاعت کے احکام ومسائل

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ
الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ
وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ
بِهِنَّ ز فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ز وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ
الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ لا وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ط اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

رضاعت کی وجہ سے حرام ہو جانے والے رشتوں کا بیان

حُرِّمَتْ	حرام کی گئی ہیں	عَلَيْكُمْ	تم پر
اُمَّهٰتُكُمْ	تمہاری مائیں	وَبَنٰتُكُمْ	اور تمہاری بیٹیاں
وَاَخَوٰتُكُمْ	اور تمہاری بہنیں	وَعَمّٰتُكُمْ	اور تمہاری پھوپھیاں
وَخٰلٰتُكُمْ	اور تمہاری خالائیں	وَبَنٰتُ الْاَخِ	اور بھائیوں کی بیٹیاں (بھتیجیاں)
وَبَنٰتُ الْاُخْتِ	اور بہنوں کی بیٹیاں (بھانجیاں)	وَاُمَّهٰتُكُمُ	اور تمہاری مائیں
الّٰتِيْٓ	وہ جنہوں نے	اَرْضَعْنَكُمْ	تمہیں دودھ پلایا

وَاَخَوٰتُکُمْ	اور تمہاری بہنیں	مِّنَ الرَّضَاعَةِ	رضاعی
وَاُمَّھٰتُ	اور مائیں	نِسَآئِکُمْ	تمہاری بیویوں کی (تمہاری ساسیں)
وَرَبَآئِبُکُمُ	اور تمہاری سوتیلی بیٹیاں	الّٰتِیْ	وہ جو
فِیْ حُجُوْرِکُمْ	(پرورش پائیں) تمہاری گودوں میں		
مِّنْ نِّسَآئِکُمُ	تمہاری ان عورتوں (کے بطن) سے	الّٰتِیْ	وہ جو
دَخَلْتُمْ	صحبت کی تم نے	بِهِنَّ	ان سے
فَاِنْ	پس اگر	لَّمْ تَکُوْنُوْا	نہیں تم نے
دَخَلْتُمْ	صحبت کی	بِهِنَّ	ان سے
فَلَا جُنَاحَ	تو نہیں کوئی گناہ	عَلَیْکُمْ	تم پر
وَحَلَآئِلُ	اور بیویاں	اَبْنَآئِکُمُ	تمہارے بیٹوں کی (تمہاری بہوئیں)
الَّذِیْنَ	وہ جو	مِنْ اَصْلَابِکُمْ ۙ	تمہاری پشتوں سے ہیں
وَاَنْ تَجْمَعُوْا	اور (حرام ہے تم پر) جمع کرنا تمہارا		
بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ	درمیان دو بہنوں کے	اِلَّا مَا	مگر جو
قَدْ سَلَفَ ؕ	پہلے گزر گیا	اِنَّ اللّٰهَ کَانَ	بلاشبہ اللہ ہے
غَفُوْرًا	بہت بخشنے والا	رَّحِیْمًا ۲۳ۙ	نہایت رحم کرنے والا

فرمایا حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّھٰتُکُمْ وَبَنٰتُکُمْ وَاَخَوٰتُکُمْ وَعَمّٰتُکُمْ وَخٰلٰتُکُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّھٰتُکُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَکُمْ وَاَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ تم پر حرام کر دی گئی ہیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، اور بھتیجیاں اور بھانجیاں، اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، اور تمہاری دودھ شریک بہنیں، جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے ان کی تفصیل بیان کی جارہی ہے، ایک تو پچھلی آیت میں بیان ہوا کہ باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا حرام ہے، اب یہاں

نسب کے سات حرام رشتوں کا ذکر ہے: 1 ماں: اس کے حکم میں نانی اور دادی اوپر تک، مثلاً: پڑدادی، پڑنانی شامل ہیں۔ 2 بیٹی: اس کے حکم میں پوتی اور نواسی نیچے تک آجاتی ہیں۔ 3 بہن: سگی ہو یا علاتی (باپ کی طرف سے) اور اخیافی (ماں کی طرف سے) بہر حال حرام ہے۔اور تمام بہنیں شامل ہیں 4 پھوپھی میں دادا کی بہن اور نانا کی بہن بھی داخل ہے۔ 5 خالہ کا لفظ ماں، نانی اور دادی سب کی بہنوں کو شامل ہے۔ (6، 7) بھتیجی اور بھانجی کے حکم میں ان کی بیٹیاں نیچے تک آجاتی ہیں۔ (قرطبی): یعنی نسبی ماں اور بہن کی طرح دودھ کی ماں اور بہن بھی حرام ہیں۔ یہاں دو رشتوں کا ذکر ہے، مگر حدیث کی رو سے وہ ساتوں رشتے جو نسب سے حرام ہیں، دودھ سے بھی حرام ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو نسب سے حرام ہیں۔" [بخاری، النکاح، باب: (وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيٓ أَرْضَعْنَكُمْ): 5099، عن عائشة]

رضاعی رشتہ اور اس کی حرمت

قرآن مجید نے دودھ پینے کو حرمت کا سبب قرار دیا ہے، یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ کم از کم کتنی دفعہ دودھ پیا ہو، یاد رہے کہ یہ دودھ پلانا اسی وقت معتبر ہوگا، جب دودھ پلانے کی مدت، یعنی دو سال کے اندر ہو۔آیت کریمہ میں رضاعت کے اعتبار سے صرف دو رشتوں یعنی ماں اور بہن کا ذکر کیا گیا ہے۔تاہم حضور نبی کریم (علیہ السلام) نے اس کی وضاحت میں فرمایا: جس کا مفہوم ہے یعنی جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہیں۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جس بچے نے جس عورت کا دودھ پیا وہ عورت بچے کی رضاعی ماں بن گئی۔اس عورت کی بیٹیاں اس کی بہنیں ہوگئیں اور عورت کے بیٹے اس بچے کے رضاعی بھائی بن گئے۔اسی طرح عورت کا خاوند دودھ پینے والے بچے کا رضاعی باپ ٹھہرا۔اور اس رضاعی باپ کا بھائی بچے کا رضاعی چچا ہوا۔لہٰذا جس طرح رضاعی ماں اور رضاعی بہن کے ساتھ نکاح حرام ہے اسی طرح رضاعی بھتیجی، رضاعی بھانجی، رضاعی پھوپھی اور رضاعی خالہ کے ساتھ بھی نکاح حرام ہوگیا۔غرض یہ کہ جو رشتے نسب کے اعتبار سے حرام ہیں، وہ رضاعت کے اعتبار سے بھی حرام ہیں۔اور جب ماں حرام ہوگئی تو نانی،

پڑنانی وغیرہ بھی حرام ٹھہریں۔ رضاعت کی مدت کے تعین کے سلسلے میں فقہائے کرام کے دو گروہ ہیں۔ امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام محمد، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں۔ کہ رضاعت کی مدت زیادہ سے زیادہ دو سال ہے۔ اگر کسی بچے نے دو سال کے دوران کسی عورت کا دودھ پیا ہے تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں بن گئی اور اس لحاظ سے باقی تمام رضاعی رشتے بھی وجود میں آئے۔ اور ان رشتوں پر وہ تمام احکام نافذ ہوں گے جو حقیقی ماں کے رشتہ داروں پر عائد ہوتے ہیں۔ البتہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رضاعت کی مدت اڑھائی سال ہے۔ اڑھائی سال کے اندر اندر دودھ پینے سے رضاعت کے تمام احکام نافذ العمل ہوں گے۔ رضاعی ماں حقیقی ماں کی مانند ہوتی ہے، اس سے پردہ نہیں ہوتا انسان اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ سکتا ہے۔ البتہ بعض احکام حقیقی ماں سے مختلف بھی ہوتے ہیں مثلاً حقیقی ماں اگر محتاج ہے تو اس کا خرچہ بیٹے کے ذمہ ہے مگر رضاعی ماں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ حقیقی ماں کی وراثت بیٹے کو اور بیٹے کی ماں کو پہنچتی ہے مگر رضاعی ماں بیٹے کے درمیان وراثت نہیں چلتی۔ رضاعت کی بنا پر حرمت پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی مصلحت رکھی ہے اور اس میں شریعت کی بہت بڑی حکمت ہے۔ یورپ اور دہریہ ممالک میں نامعلوم عورتیں نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلا دیتی ہیں مگر بعد میں ان کی کوئی شناخت نہیں رہتی۔ بعض اوقات ہسپتالوں میں پیدا ہونے والے بچوں کو نرسیں دودھ پلا دیتی ہیں مگر کون جانتا ہے کہ اسے کس نے دودھ پلایا تھا اور کون کون اس کی رضاعی بھائی یا رضاعی بہن ہے، خود دودھ پلانے والی عورت نہ ماں بنتی ہے اور نہ دودھ پینے والا اس کا بیٹا بنتا ہے۔ یہ نہایت ہی قبیح چیز ہے۔ دودھ میں شرکت کی وجہ سے رضاعی بہن بھائیوں کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور پینے اور پلانے والی کی حیثیت بیٹے اور ماں کی ہوتی ہے اور ان کے درمیان نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام نے رضاعت کا ایسا اصول قائم کر دیا ہے جس سے انسانی سوسائٹی میں اتفاق و اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ایک امیر کبیر آدمی حتیٰ کہ بادشاہ کا بیٹا بھی اگر کسی غریب عورت کا دودھ پیتا ہے۔ تو اس عورت کے بچے بڑے آدمی کے بیٹے کے بھائی بہن بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نافذ کر کے کتنی بڑی مہربانی فرمائی ہے۔ اس طرح سوسائٹی میں

محبت اور احترام پیدا ہوگا، اور بہت حد تک مساوات قائم ہوگی، خود حضور ﷺ نے جس عورت کا دودھ پیا تھا وہ عورت خود یا اس کی بیٹی غزوہ حنین کے موقع پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ تو حضور ﷺ نے اس کے لیے اپنی چادر مبارک اتار کر بچھادی۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کون عورت ہے جس کو اتنا بڑا اعزاز حاصل ہوا ہے تو بتلایا کہ یہ حضور ﷺ کی رضاعی والدہ یا رضاعی بہن ہے۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ جس عورت کا دودھ پیا ہے اس کے ساتھ کیا احسان کیا جائے۔ فرمایا اس کے ساتھ کافی احسان کیا جائے کہ یہ دودھ پینے والے کی ذمہ داری ہے۔ اپنی رضاعی ماں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کر کے ہی بیٹا اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوسکتا ہے۔ بہرحال رضاعت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت رکھی ہے کہ اس کی وجہ سے جذبہ احسان و مروت پیدا ہوتا ہے اور آپس میں اخوت کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔

وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اور تمہاری بیویوں کی مائیں، اور تمہارے زیر پرورش تمہاری سوتیلی بیٹیاں جو تمہاری ان بیویوں (کے پیٹ) سے ہوں جن کے ساتھ تم نے خلوت کی ہو۔ ہاں اگر تم نے ان کے ساتھ خلوت نہ کی ہو (اور انہیں طلاق دے دی ہو یا ان کا انتقال ہوگیا ہو) تو تم پر (ان کی لڑکیوں سے نکاح کرنے میں) کوئی گناہ نہیں ہے، اس میں بیویوں کی نانیاں اور دادیاں بھی اوپر تک شامل ہیں۔ بیوی کی ماں (ساس) حرام ہے، خواہ بیوی کو جماع سے پہلے طلاق دے دی ہو، یا اس کا انتقال ہوگیا ہو۔ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ: "رَبَآءِبُ" یہ "رَبِيْبَةٌ" کی جمع ہے، یعنی بیوی کی دوسرے خاوند سے جو لڑکی ہو وہ بھی حرام ہے، بشرطیکہ اپنی بیوی (اس لڑکی کی ماں) سے جماع کر لیا ہو، اگر قبل از جماع طلاق دے دی تو عورت کی لڑکی سے نکاح جائز ہے، اس پر علماء کا اتفاق ہے۔ فِيْ حُجُوْرِكُمْ یہ مقصد نہیں ہے کہ سوتیلی بیٹی زیر پرورش نہ ہو تو اس سے نکاح حلال ہے؛ بلکہ زیر پرورش کہہ کر ترغیب دینا مقصود ہے کہ جب کسی مطلّقہ یا بیوہ سے نکاح کرو تو ایسا نہ ہو کہ اس عورت کو تو لے آؤ اور اس کے بے سہارا بچوں کو بوجھ سمجھ کر چھوڑ دو، بہرحال وہ لڑکیاں زیر پرورش ہوں یا نہ ہوں، جب ان کی ماں سے نکاح اور نکاح کے بعد صحبت ہو چکی ہے تو اب وہ اس

مرد پر حرام ہیں، اس پر فقہاء کا اتفاق ہے۔ (قرطبی: ۱/ ۴۲۲)

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا نیز تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی تم پر حرام ہیں، اور یہ بات بھی حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کرو، البتہ جو کچھ پہلے ہو چکا وہ ہو چکا۔ بیشک اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ حلائل، حلیلۃ کی جمع ہے۔ یعنی صلبی بیٹوں کی بیویاں نہ کہ منہ بولے بیٹوں کی بیویاں۔ (دیکھیے سورہ احزاب (27) اس سے معلوم ہوا کہ منہ بولے بیٹوں کی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہے اور رضاعی بیٹے کی بیوی بھی حرام ہے کیونکہ وہ نسبی بیٹے کے حکم میں ہے اور پوتے پر پوتے بھی بیٹوں میں داخل ہیں۔ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ یہ محل رفع میں ہے، یعنی "حُرِّمَ عَلَيْكُمُ الْجَمْعُ بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ" کہ دو بہنوں کو، صلبی ہوں یا رضاعی، ایک وقت میں نکاح میں جمع رکھنا حرام ہے۔ قرآن مجید میں صرف دو بہنوں کو جمع کرنا منع ہے، مگر حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو ایک نکاح میں جمع نہ کیا جائے۔" [بخاری، النکاح، باب لا تنکح المرأۃ علی عمتھا: 5109، عن أبی ہریرہ] اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے علاوہ سنت بھی شریعت کا مستقل ماخذ ہے، قرآن میں صرف دو بہنوں کو جمع کرنا منع آیا ہے اور حدیث میں پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی منع آیا ہے، یہ بھی ماننا پڑے گا۔ البتہ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ: یعنی پہلے جو رشتے ایسے ہو چکے ان کا کچھ گناہ نہیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کو برقرار رکھا جائے گا۔ اور اگر اس حکم کے نزول کے وقت کسی کے نکاح میں دو سگی بہنیں موجود تھیں تو ان میں سے ایک کو الگ کر دیا گیا۔ اس مقام پر یہ مسئلہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ جس طرح دو بہنوں کے ساتھ بیک وقت نکاح نہیں ہوسکتا اسی طرح ایک عورت اور اس کی پھوپھی یا اس کی خالہ یا اس کی بھتیجی یا اس کی بھانجی بھی ایک وقت میں نہیں رکھی جا سکتیں۔ ہاں ان میں سے کوئی ایک فوت ہو جائے یا طلاق واقع ہو جائے تو دوسری کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے۔ اسی لیے یہ حرمت ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ ایک کے بعد دوسری کے ساتھ نکاح درست ہے۔

آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان رشتوں کا ذکر کیا ہے جو نسبی طور پر کسی شخص کے لیے حرام ہیں، ان کی حرمت دو قسم کی ہے، عارضی اور دائمی، عارضی حرمت سے مراد یہ ہے کہ فی نفسہ اس عورت سے نکاح جائز ہو؛ لیکن کسی وقتی رکاوٹ کی وجہ سے نکاح درست نہ ہو، قرآن نے اس میں سے دو بہنوں کے جمع کرنے کا ذکر کیا ہے، کہ ایک مرد بیک وقت دو بہنوں کو اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتا، یہی حکم دو محرم رشتہ دار خواتین کو جمع کرنے کا ہے، جیسے: پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی، حدیث میں اس کا ذکر موجود ہے، (صحيح البخاري) جو رشتے دائمی طور پر حرام ہیں، وہ تین طرح کے ہیں وہ عورتیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں، جیسے: ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی، اور باپ کی بیوی، ماں ہی کے حکم میں دادی، نانی، اور پورا مادری سلسلہ ہے، بیٹی ہی کے حکم میں نواسی، نواسے اور ان کا سلسلہ ہے، باپ ہی کی طرح دادا، نانا کی منکوحہ بھی حرام ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو سسرالی رشتہ کی وجہ سے حرام ہیں، ان میں بیوی کی ماں، اس کی بیٹی، بہو وغیرہ شامل ہیں، جیسے بیوی کی بیٹی حرام ہے، بیوی کی پوتی اور نواسی کا بھی یہی حکم ہے، اور قرآن نے جو بیٹے کے ساتھ نسبی بیٹے کی قید لگائی ہے، اس سے اشارہ لے پالک کی طرف ہے، اسلام میں لے پالک لینے کا اعتبار نہیں، اس لئے لے پالک کی بیوی حرام نہیں ہے، تیسرے وہ لوگ ہیں جو رضاعت اور دودھ کے رشتہ سے حرام قرار پاتے ہیں، قرآن نے ان میں سے رضاعی ماں اور رضاعی بہنوں کا ذکر کیا ہے، حدیث میں ہے کہ جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام قرار پاتے ہیں، رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہیں (مسلم، کتاب الرضاعۃ، حدیث نمبر: ۳۵۷۹) اس سے بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں، جن کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو سنوارنے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆

ہماری دیگر مطبوعات

www.umarlibrary.org